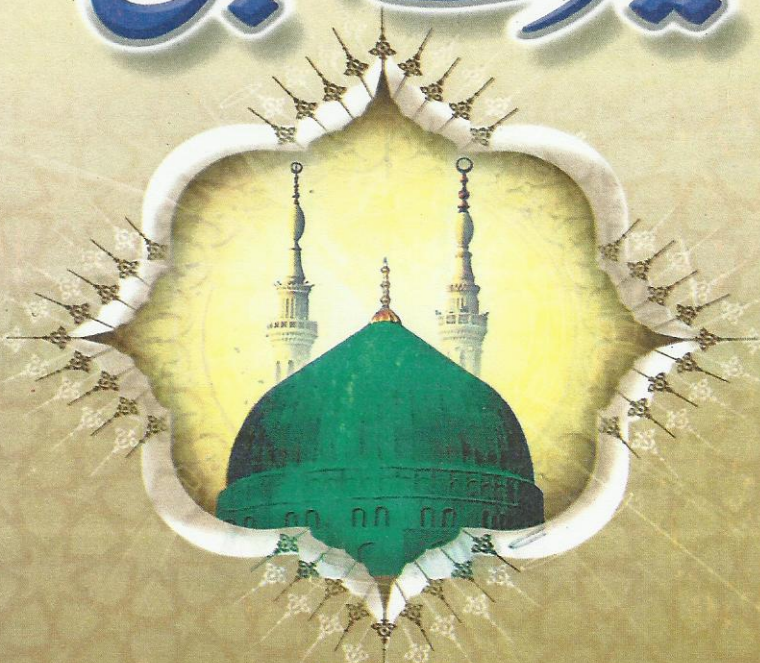


{وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ}

اور ہم نے آپ [صلی اللہ علیہ وسلم] کو تمام جہان والوں کیلئے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے
(الانبیاء: ۱۰۷)

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم



تالیف

خلیق احمد مفتی

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾

اور ہم نے آپ ﷺ کو تمام جہان والوں کیلئے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے

(الأنبياء: ۱۰۷)

سیرت النبی

صلی اللہ علیہ وسلم

تألیف:

خلیق احمد مفتی

جملہ حقوق بحق مؤلف محفوظ ہیں

نام کتاب : سیرت النبی ﷺ
طبع : اول
تألیف : خلیق احمد مفتی
ناشر :

..... ﴿ رابطہ ﴾

پوسٹ بکس نمبر: 1625 عجمان، متحدہ عرب امارات -

khaleeqmufti@hotmail.com

face book: Khaleeq Ahmed Mufti



ملاحظہ: یہ کتاب مفت تقسیم کیلئے ہے۔

فہرست مضامین

صفحہ :	عنوان :
۹	حرفِ آغاز
۱۱	سیرتِ مبارکہ قبل از ولادت
۱۶	شہر مکہ..... اور حضرت ابراہیم علیہ السلام
۲۵-۳۶	☆نسبِ مبارک
۲۷	ہاشم
۲۷	عبدالمطلب
۳۲	عبداللہ
۳۷	☆ولادت باسعادت
۳۹	ایامِ رضاعت و طفولت
۳۹	حلیہ سعیدیہ کی گود میں
۴۲	حادثہ شقِ صدر
۴۳	والدہ کی کفالت میں
۴۵	دادا کی کفالت میں
۴۶	چچا کی کفالت میں

صفحہ :	عنوان :
۵۶-۴۷	☆ مرحلہ شباب
۴۷	تجارت
۴۷	حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح
۵۰	بعض فضائل حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا
۵۱	مختصر تذکرہ اولادِ نبی ﷺ از حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا
۵۵	کعبہ کی تعمیر نو میں شرکت
۶۳-۵۷	☆ بعثت
۵۹	بعثت کے وقت دینی و اخلاقی و معاشرتی حالات
۶۴	بعثت کے بعد کی زندگی کا پہلا دور:
۶۴	خفیہ دعوت و تبلیغ
۶۵	مکی زندگی کا دوسرا دور
۶۵	علانیہ تبلیغ
۶۸	مشرکین کی طرف سے ایذا رسانیاں
۷۱	ہجرت حبشہ
۷۶	حضرت حمزہؓ نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا قبولِ اسلام
۷۷	ترغیب و ترہیب کا سلسلہ
۸۲	مقاطعہ

صفحہ :	عنوان :
۸۳	عام الحزن
۸۴	مکی زندگی کا تیسرا اور آخری دور
۸۴	مکہ سے باہر دعوت و تبلیغ
۸۴	سفر طائف
۹۱	اسراء و معراج
۹۴	سفر اسراء و معراج میں حکمتیں:
۹۵	رسول اللہ ﷺ کیلئے تسلی و غمخواری کا انتظام
۹۶	آئندہ پیش آنے والے مراحل کیلئے تیاری
۹۸	سفر اسراء و معراج میں امت کیلئے سبق اور پیغام:
۹۸	اللہ سے لو لگانے کی ضرورت
۹۹	نماز کی پابندی کی ضرورت
۱۰۰	مسجد سے رشتہ جوڑنے کی ضرورت
۱۰۱	اخلاقی بلندی کیلئے فکر و جستجو کی ضرورت
۱۰۲	نوافل کی فضیلت
۱۰۳	ذکر اللہ کی فضیلت
۱۰۴	معراج کے بعد:
۱۰۸	نئی منزل کی امید

صفحہ :	عنوان :
۱۱۱	بیعت عقبہ اولیٰ
۱۱۲	بیعت عقبہ ثانیہ
۱۱۷	☆ ہجرت مدینہ :
۱۲۸	عظیم خاتون
۱۳۰	غارِ ثور سے روانگی
۱۳۴	مدینہ میں آمد
۱۳۹	سفر ہجرت میں ہمارے لئے سبق اور پیغام :
۱۳۹	اللہ پر توکل
۱۳۹	توکل کی حقیقت
۱۴۱	امانت و دیانت
۱۴۳	قیمتی ترین متاع؛ دین و ایمان
۱۴۵	ہجرت سے مقصود؛ نئے معاشرے کا قیام
۱۴۶	اسلامی کیلنڈر کا آغاز
۱۴۸	☆ نئی زندگی: (مدنی زندگی کا پہلا دور)
۱۴۸	مدینہ میں دینی، معاشی، سیاسی صورتِ حال
۱۵۸	☆ نئے معاشرے کی تشکیل کیلئے فوری اقدامات :
۱۵۸	مسجد نبوی کی تعمیر

صفحہ :	عنوان :
۱۶۱	مواخاۃ
۱۶۵	میثاقِ مدینہ
۱۶۷-۱۷۹	☆ مشرکین کے خلاف غزوات کا مختصر تذکرہ اور تنقیدی جائزہ :
۱۶۹	بدر
۱۷۰	اُحد
۱۷۱	خندق
۱۷۲	قیمتی ترین سبق
۱۷۳	اسلام بزورِ شمشیر نہیں پھیلا
۱۸۰	☆ صلح حدیبیہ (مدنی زندگی کے دوسرے دور کا آغاز)
۱۸۶-۲۰۳	☆ فرماں رواؤں کو دعوتِ اسلام :
۱۹۲	قیصرِ روم
۱۹۸	کسریٰ خسرو پرویز
۲۰۱	نجاشی شاہِ حبشہ
۲۰۲	مقوقس شاہِ مصر
۲۰۴	☆ غزوہٴ خیبر
۲۰۷	☆ فتح مکہ (مدنی زندگی کے تیسرے اور آخری دور کا آغاز)
۲۱۶	☆ غزوہٴ حنین

<u>صفحہ :</u>	<u>عنوان :</u>
۲۴۳	جزیرۃ العرب میں مختلف شورشیں اور ان کی سرکوبی
۲۴۸	غزوہ تبوک
۲۵۹	عام الوفود
۲۶۲	☆ حجۃ الوداع
۲۶۹-۲۹۳	☆ اپنے رب کی طرف واپسی:
۲۷۳	مرض الموت
۲۷۴	آخری چھ ایام اور وصیتیں
۲۸۵	سوغوار فضاء
۲۹۰	تجہیز و تکفین
۲۹۵-۳۰۵	☆..... اصل مقصود؛ اتباع رسول ﷺ



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

حرف آغاز:

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على أشرف الأنبياء والمرسلين ، نبينا محمد وعلى آله وأصحابه أجمعين ، أما بعد :

اللہ سبحانہ و تعالیٰ پر ایمان کے بعد کسی بھی مسلمان کیلئے سب سے قیمتی ترین متاع رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عقیدت و محبت ہے، بلکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی معرفت اور اس کی رضا و خوشنودی کے حصول کا واحد طریقہ بھی ”اتباع رسول ﷺ“ میں ہی منحصر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قدیم و جدید ہر دور میں بڑی تعداد میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارکہ کے موضوع پر کتابیں تحریر کی گئی ہیں..... اور یقیناً آئندہ بھی تاقیامت یہ سلسلہ جاری رہے گا..... کیونکہ..... جیسا کہ مثال مشہور ہے: مَنْ أَحَبَّ شَيْئًا أَكْثَرَ ذِكْرَهُ..... یعنی ”انسان جس چیز سے محبت کرتا ہے، بار بار اسی کا تذکرہ کرتا ہے.....“ وہ یہ نہیں سوچتا کہ مجھ سے قبل اسی بارے میں کتنے لوگ کیا کچھ کہہ چکے ہیں..... یا کیا کچھ لکھ چکے ہیں..... اسی کیفیت کے تحت یہ ناکارہ اور بے علم و عمل انسان بھی اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ اور بے ربط عبارات میں وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ تحریر کرتا رہا..... (۱)

بالآخر محض اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے فضل و کرم سے بے ربط عبارات کا یہی مجموعہ کتابی شکل میں تیار ہو گیا.....

(۱) خصوصاً ۲۰۱۱ء میں بیرون ملک ایک ٹی وی چینل کی طرف سے فرمائش پر ”سیرت النبی ﷺ“ کے عنوان سے مفصل پروگرام پیش کرنے کا موقع ملا، تب ان تحریروں کا مجموعہ مسلسل بڑھتا رہا.....

اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے دعاء ہے کہ اس ناچیز کی سعی کو شرفِ قبولیت سے نوازیں، اور اسے میرے لئے، میرے والدین، اہل و عیال، ذوی الأرحام، تمام اساتذہ کرام، نیز ہر اس شخص کیلئے جس نے اس کتاب کی طباعت و اشاعت میں کسی بھی شکل میں تعاون کیا ہو ذخیرہ آخرت بنائیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمین ،
وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وعلیٰ آلہ وأصحابہ أجمعین .

خلیق احمد مفتی

۱۸/ربیع الاول ۱۴۳۵ھ، مطابق ۱۹/جنوری ۲۰۱۴ء بروز اتوار۔

پوسٹ بکس نمبر: 1625 عجمان، متحدہ عرب امارات -

khaleeqmufti@hotmail.com

face book: Khaleeq Ahmed Mufti



بسم اللہ الرحمن الرحیم

سیرت مبارکہ..... قبل از ولادت:

عام طور پر اہل قلم کے یہاں رواج یہ ہے کہ جب کسی اہم شخصیت کی سیرت نگاری یا اس کے حالات و واقعات کا تذکرہ مقصود ہو تو اکثر و بیشتر ابتداء اس کی ولادت سے کی جاتی ہے، یا اس علاقے کا کچھ تذکرہ کر دیا جاتا ہے جہاں اس کی ولادت ہوئی، اور اس سے متعلق کچھ جغرافیائی تفصیلات و معلومات درج کر دی جاتی ہیں، یا زیادہ سے زیادہ اس دور اور اس علاقے کے مذہبی، سیاسی و معاشرتی حالات کا تذکرہ کیا جاتا ہے جن میں اس شخصیت کی ولادت اور پھر نشو و نما ہوئی۔

جبکہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارکہ اور حیات طیبہ کے بارے میں جب ہم غور و فکر کرتے ہیں تو ہمیں اس حقیقت کا ادراک ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی شان نزالی ہے اور آپ کی سیرت مبارکہ کا معاملہ بالکل ہی مختلف ہے۔ کیونکہ آپ کا مبارک تذکرہ تو آپ کی ولادت سے بہت پہلے ہی سے چلا آرہا تھا، گزشتہ امتوں میں بھی آپ کا چرچا تھا، اور آپ کی شخصیت گزشتہ انبیائے کرام علیہ السلام کے نزدیک جانی پہچانی تھی، اور اس حقیقت کو جاننے کیلئے کسی تاریخی کتاب کی ورق گردانی کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ حقیقت تو خود قرآن کریم سے ثابت ہے۔

چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ

قَالَ أَأَقَرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَيَّ ذَلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَأَقَرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ فَمَنْ تَوَلَّى بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿۱﴾

ترجمہ: (اور جب اللہ نے نبیوں سے یہ عہد لیا کہ جو کچھ میں تمہیں کتاب و حکمت دوں، پھر تمہارے پاس وہ رسول آئے جو تمہارے پاس موجود کتاب کی تصدیق کرنے والا ہو، تو تم سب اس رسول پر ضرور ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد و نصرت کرو گے، فرمایا: کیا تم سب نے اقرار کیا؟ اور اس میرے عہد کو قبول کیا؟ ان سب نے کہا: ہم نے اقرار کیا، فرمایا: پھر اب تم گواہ رہو، اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں، پھر جو کوئی [اس عہد و اقرار کے بعد] پھر جائے تو یقیناً وہی لوگ نافرمان ہیں۔)

یعنی رسول اللہ ﷺ کے بارے میں گذشتہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام سے یہ عہد لیا گیا کہ اگر ان کے دور میں ہی آپ کا ظہور ہو گیا تو وہ اپنی نبوت چھوڑ کر آپ پر ایمان لائیں گے اور آپ ہی کا اتباع کریں گے۔ (۲)

اسی طرح اللہ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند جلیل حضرت اسماعیل علیہ السلام جب اللہ کے حکم کی تعمیل میں دونوں تعمیر کعبہ میں مشغول تھے، اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ رب العزت سے دعاء و مناجات کے دوران یہ دعاء بھی

(۱) آل عمران: [۸۱-۸۲]

(۲) اس آیت کی ایک تفسیر تو یہی بیان کی گئی ہے۔ لیکن یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مفسرین کی ایک بڑی تعداد کے نزدیک اس کی تفسیر یہ ہے کہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام سے یہ عہد لیا گیا کہ وہ باہم ایک دوسرے کی تائید و نصرت کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں تفسیروں میں کوئی تعارض نہیں ہے اور اس دوسری تفسیر کے ضمن میں ہی پہلی تفسیر بھی خود بخود شامل ہے، کیونکہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام کی طرف سے ایک دوسرے کیلئے تائید و نصرت کے عہد میں ہی یقیناً رسول اللہ ﷺ کیلئے تائید و نصرت بھی شامل ہے۔

مَآگَی: ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (۱)

ترجمہ: (اے ہمارے رب! ان میں انہی میں سے رسول بھیج جو ان کے پاس تیری آیتیں پڑھے، انہیں کتاب و حکمت سکھائے اور انہیں پاک کرے، یقیناً تو غلبہ والا اور حکمت والا ہے)

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ (۲)

ترجمہ: (وہی ہے جس نے ان ناخواندہ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے، اگرچہ یہ اس سے قبل یقیناً کھلی گمراہی میں تھے)

مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ اس سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو دعاء مانگی تھی اس کی قبولیت آپ ﷺ کی بعثت کی شکل میں ہوئی۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو کہ رسول اللہ ﷺ سے چھ سو سال پہلے گزرے ہیں، قرآن کریم میں ان کے بارے میں تذکرہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے نبی آخر الزمان ﷺ کے بارے میں یوں خوشخبری سنائی: ﴿وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ﴾ (۳)

ترجمہ: (اور جب مریم کے بیٹے عیسیٰ نے کہا کہ اے بنی اسرائیل! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں، مجھ سے پہلے کی کتاب تورات کی میں تصدیق کرنے والا ہوں اور اپنے بعد آنے والے ایک رسول کی میں تمہیں خوشخبری سنانے والا ہوں جن کا نام احمد ہے) (۱)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (إِنِّي عِنْدَ اللَّهِ مَكْتُوبٌ: خَاتَمُ النَّبِيِّينَ وَإِنَّ آدَمَ لَمُنْجَدِلٌ فِي طِينَتِهِ) (۲) ترجمہ: (میں اللہ تعالیٰ کے ہاں اس وقت سے ”خاتم النبیین“ لکھا ہوا ہوں کہ جب آدم علیہ السلام کا خمیر تیار ہو رہا تھا)

یعنی آپ ﷺ علم الہی میں ازل سے ہی خاتم النبیین تھے جبکہ حضرت آدم علیہ السلام اس وقت تخلیق مراحل میں تھے۔

نیز رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ چونکہ سابقہ کتب سماویہ میں موجود تھا اس لئے اہل کتاب آپ کی بعثت و رسالت سے بخوبی واقف تھے اور آپ کی شخصیت ان کے نزدیک خوب جانی پہچانی تھی، قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس بات کا تذکرہ موجود ہے۔

مثلاً ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ﴾ (۳) ترجمہ: (اور جب اللہ کی طرف سے ایک کتاب [قرآن کریم] ان کے پاس آئی جو تصدیق کرتی ہے اس کتاب [تورات] کی جو ان کے پاس تھی، حالانکہ پہلے یہ خود [اس کے ذریعے] کافروں پر فتح چاہتے تھے، اور

(۱) واضح ہو کہ آپ ﷺ کا نام مبارک محمد بھی ہے اور احمد بھی ہے۔

(۲) مشکاة المصابیح [۵۷۵۹] باب فضائل سید المرسلین۔

(۳) البقرہ [۸۹]

جب وہ چیز آگئی تو باوجود اس کو پہچان لینے کے اس کا انکار کرنے لگے، اللہ کی لعنت ہو انکار کرنے والوں پر)۔

یعنی یہ یہود مدینہ جب کسی جنگ کے موقع پر مشرکین سے شکست کھا جاتے تو دعاء کرتے کہ یا اللہ! آخری نبی کو جلد مبعوث فرما، تاکہ اس کے ساتھ مل کر ہم ان مشرکین پر غلبہ اور فتح حاصل کر سکیں، یعنی رسول اللہ ﷺ کی بعثت ان کے علم میں تھی اور اس چیز سے خوب واقف تھے، مگر اس کے باوجود محض حسد کی وجہ سے انہوں نے کفر کیا۔

اسی طرح قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ﴾ (۱) ترجمہ: (جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ تو اسے [یعنی رسول اللہ ﷺ] کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بچوں کو پہچانتے ہیں، ان کی ایک جماعت حق کو پہچان کر پھر اسے چھپاتی ہے)

یعنی رسول اللہ ﷺ کی شخصیت اور آپ کی حقانیت و صداقت ان اہل کتاب کے ہاں اس قدر معروف اور یقینی تھی اور وہ اس طرح آپ کو جانتے اور پہچانتے تھے کہ جس طرح بغیر کسی شک و شبہ کے خود اپنے بچوں کو جانتے اور پہچانتے تھے۔

اسی طرح قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿.....يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ﴾ (۲) یعنی یہ اہل کتاب رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ اپنے پاس تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔



شہر مکہ..... اور..... حضرت ابراہیم علیہ السلام

رسول اللہ ﷺ کا آبائی وطن چونکہ مکہ مکرمہ تھا لہذا آپ کی سیرت مبارکہ اور حیات طیبہ کے تذکرہ و بیان کے ضمن میں اس شہر اور اس خطے کا مختصر تذکرہ بھی ضروری ہے، اور جب شہر مکہ کا تذکرہ ہوگا تو ضرور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ بھی ہوگا، کیونکہ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

شہر مکہ کی اولین آبادی دو پاکیزہ نفوس پر مشتمل تھی، یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ ”ہاجر“۔ (۱)

حضرت اسماعیل علیہ السلام اللہ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند تھے، جنہیں ابوالانبیاء بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ ان کے بعد جتنے بھی نبی آئے وہ سب انہی کی اولاد میں سے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت پر ایمان قبول کرنے والوں کی تعداد تو اگرچہ بہت کم تھی، یعنی صرف ان کی اہلیہ حضرت سارہ، دوسری اہلیہ حضرت ہاجر، نیز بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام (۲) یہ کل امت تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی، لیکن اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے انہیں مقام و رتبہ بہت ہی بلند عطا کیا گیا اور ”امام الناس“ کا لقب عطا کیا گیا۔

قانون قدرت یہ ہے کہ جب کسی کو بلند مقام و رتبہ سے نوازا نامقصود ہو تو اس کیلئے آزمائشوں

(۱) ”ہاجر“ کو اردو دان طبقے میں برصغیر میں عام طور پر حضرت ہاجرہ کہا جاتا ہے۔ (۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دونوں صاحبزادوں حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہما السلام کی ولادت تو بعد میں ہوئی، لہذا وہ تو پیدا ان ہی مؤمن تھے، جبکہ آپ کی دعوت پر ایمان قبول کرنے والوں کی کل تعداد تین ہی تھی۔

اور ابتلائات کا سلسلہ بھی اسی قدر دشوار اور سخت ہوتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا، اور ابتلائات کے ایک طویل سلسلہ سے انہیں گزرنا پڑا۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَإِذْ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا.....﴾ (۱)

ترجمہ: (اور جب ابراہیم [علیہ السلام] کو ان کے رب نے کئی کئی باتوں سے آزمایا اور انہوں نے ان سب کو پورا کر دیا تو اللہ نے فرمایا میں تمہیں لوگوں کا امام بنادوں گا.....) یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام متعدد و مختلف قسم کی آزمائشوں سے گزارے گئے اور ہر آزمائش میں کامیاب و کامران رہے، جس کے صلے میں انہیں اللہ کی طرف سے ”امام الناس“ کے عظیم ترین منصب پر فائز کیا گیا، چنانچہ صرف مسلمان ہی نہیں، یہود و نصاریٰ کے نزدیک بھی ان کی شخصیت انتہائی محترم اور پیشوامانی اور سمجھی جاتی ہے، حتیٰ کہ مشرکین عرب کے نزدیک بھی وہ واجب الاحترام تھے، اگرچہ ان کی اپنی امت اور اپنے پیروکار محض تین افراد ہی تھے۔

اسی طرح قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَابْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّى﴾ (۲) ترجمہ: (اور وہ ابراہیم جنہوں نے وفاء کی)

یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے ساتھ کئے گئے تمام وعدے وفاء کئے اور ہر آزمائش میں ثابت قدم رہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کیلئے آزمائشوں کے اس طویل سلسلے کی ابتداء تو خود ان کے گھر سے ہی ہو گئی تھی جب خود ان کے مشرک باپ آزر نے انہیں گھر سے نکال دیا تھا (۳)

(۱) البقرہ [۱۲۴] (۲) النجم [۲۷] (۳) اس واقعہ کی تفصیل سورہ مریم آیات ۴۱-۵۰ میں موجود ہے۔

اس کے بعد انہیں اپنا وطن چھوڑنا پڑا اور ہجرت کی نوبت آئی، پھر آگ میں ڈالے گئے..... آزمائشوں کے اسی سلسلے کے دوران آپ علیہ السلام کا اپنی اہلیہ محترمہ حضرت سارہ کے ہمراہ ایک ایسے علاقے سے گذر ہوا جہاں ایک بدکردار اور ظالم انسان کی حکمرانی تھی، اس نے اپنے کارندے چھوڑ رکھے تھے جن کے ذمے یہ کام تھا کہ اس علاقے سے گذرنے والے مسافروں اور قافلوں پر نظر رکھیں، اگر کبھی کسی قافلے میں کوئی خوبصورت عورت نظر آئے تو وہ اسے زبردستی اغواء کر لیں اور اس حکمران کے سامنے پیش کریں تاکہ وہ بد بخت اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنا سکے۔

جب ان دونوں حضرات یعنی ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اہلیہ محترمہ حضرت سارہ کا گذر اس علاقے سے ہوا تو اس بد بخت حکمران کے کارندوں نے حضرت سارہ کو بالجبر اس حکمران کے پاس پہنچا دیا، جبکہ اس عجیب و غریب اور انتہائی پریشان کن اور نازک ترین صورت حال میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس مشکل سے نجات کیلئے اللہ سے فریاد اور دعاء و مناجات کا سلسلہ شروع کیا..... ان برگزیدہ ہستیوں کا یہی مزاج تھا..... یہی ان کا مذہب و مسلک تھا..... اور یہی ان کا شیوہ و شعار تھا..... کہ..... ہر مشکل سے نجات کیلئے صرف اللہ کے سامنے دعاء و فریاد..... اور صرف اسی سے استعانت و التجاء.....!

ادھر اس بد بخت شخص نے حسب معمول بری نیت اور غلط ارادے سے حضرت سارہ کی طرف دست درازی کی، جس پر اس کا ہاتھ شل ہو گیا، جس پر اسے کچھ اندازہ ہوا کہ شاید یہ کوئی بزرگ خاتون ہیں اس لئے ان کی طرف دست درازی کی وجہ سے مجھے یہ سزا ملی ہے، لہذا اس نے ان سے کہا کہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ دوبارہ ایسی حرکت نہیں کروں گا، آپ میرے لئے دعاء کیجئے تاکہ میرا ہاتھ ٹھیک ہو جائے، حضرت سارہ نے اس کیلئے دعاء کی،

جس کے نتیجے میں اس کا ہاتھ ٹھیک ہو گیا، مگر فوراً ہی اس نے پھر وہی حرکت کی اور پھر اس کا ہاتھ مفلوج اور شل ہو گیا، اور اب دوبارہ اس نے منت سماجت اور خوشامد شروع کی کہ میرے لئے دعاء کیجئے اور یہ کہ اب میں ایسی حرکت ہرگز نہیں کروں گا، حضرت سارہ نے دوبارہ دعاء کی، جس پر اس کا ہاتھ درست ہو گیا، مگر اب پھر اس نے وہی حرکت کی اور پھر وہی ہوا..... یوں تین بار یہی صورت حال پیش آئی، تب اسے یقین ہو گیا کہ یہ تو واقعی کوئی بہت ہی عظیم ترین اور پہنچی ہوئی خاتون ہیں..... اور اس نے سچی توبہ کی اور خوب منت سماجت کی، تب حضرت سارہ کی دعاء کے نتیجے میں اس کا ہاتھ درست ہوا تو اس نے نہ صرف یہ کہ حضرت سارہ کو آزار دیا اور جانے کی اجازت دی بلکہ ایک کنیز بھی بطور ہدیہ پیش کی اور خدمت کی غرض سے اسے بھی ان کے ہمراہ روانہ کیا، اس کنیز کا نام تھا ”ہاجرہ“ (۱)

چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس وقت تک بے اولاد تھے اور کافی عمر رسیدہ بھی ہو چکے تھے، جس کا حضرت سارہ کو بہت قلق اور رنج تھا اس لئے حضرت سارہ نے اپنے شوہر نامدار حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہ اصرار کیا کہ مجھ سے تو آپ کو اولاد کی خوشی مل نہیں سکی..... لہذا میری خواہش یہ ہے کہ میں یہ کنیز آپ کو ہبہ کر دوں، یوں شاید اللہ ہمیں اولاد کی نعمت عطاء فرمادے اور ہماری زندگی میں بھی خوشی کا جھونکا آ سکے.....!

چنانچہ حضرت سارہ نے خود اصرار کر کے وہ کنیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہبہ کر دی، جس کے نتیجے میں اللہ نے انہیں بیٹا اسماعیل (علیہ السلام) عطاء کیا، یوں ہاجرہ ”ام اسماعیل“ بن گئیں۔ اللہ کی قدرت ملاحظہ ہو کہ اس کے بعد حضرت سارہ سے بھی بیٹے یعنی اسحاق (علیہ

(۱) اصل نام ”ہاجر“ تھا، البتہ برصغیر میں اہل اردو کے ہاں ”ہاجرہ“ مشہور ہے۔

السلام) کی ولادت ہوئی۔

لیکن اس سے قبل جب حضرت سارہ بے اولاد تھیں جبکہ حضرت ہاجرہ کے ہاں بیٹے کی ولادت ہو چکی تھی..... یہ ایسی صورت حال تھی کہ جس کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام خود اپنے گھر میں ہی بڑی آزمائش کا شکار ہو کر رہ گئے اور صورت حال اس قدر بگڑی کہ بالآخر حضرت سارہ نے اب یہ اصرار کیا کہ ہاجرہ اور اسماعیل کو ان سے دور کر دیا جائے۔ جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان دونوں کو حضرت سارہ سے الگ کہیں دور بسانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ وہ ان دونوں کو لئے ہوئے اُس وقت اپنی جائے اقامت یعنی فلسطین سے روانہ ہوئے اور پہاڑوں، بیابانوں اور چٹیل، میدانوں میں مسلسل سفر کرتے ہوئے آخر ایک ویران و سنسان مقام پر پہنچ کر رک گئے، حضرت ہاجرہ اپنے شیر خوار بیٹے اسماعیل کو گود میں لئے ہوئے زمین پر بیٹھ گئیں۔ جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ابھی بیٹھے بھی نہیں تھے کہ کھڑے کھڑے اچانک مڑے اور واپس چل دیئے، حضرت ہاجرہ نے پوچھا کہ کہاں چل دیئے آپ.....؟ مگر شوہر کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا، دوبارہ پوچھا کہ ہمیں یہاں اس ویرانے میں چھوڑ کر آپ کہاں چلے جا رہے ہیں.....؟ مگر اس بار بھی کوئی جواب نہیں آیا، آخر تیسری بار پوچھا: کیا آپ کو اللہ نے یہ حکم دیا ہے؟ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام رک گئے، پلٹ کر پیچھے دیکھا اور فرمایا: ”ہاں“۔ اس پر حضرت ہاجرہ نے کہا: ”تب اللہ ہمیں برباد نہیں ہونے دے گا“۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام ان دونوں کو چھوڑ کر وہاں سے روانہ ہو گئے، کچھ دور چلنے کے بعد جب ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو ایک جگہ رک کر پہاڑی کی اوٹ سے اس مقام کی طرف دیکھتے ہوئے کہ جس کے بارے میں انہیں من جانب اللہ یہ خبر دے

دی گئی تھی کہ ”آخر کار یہاں اللہ کا گھر تعمیر ہوگا، جو کہ تمام دنیائے انسانیت کیلئے توحید کا مرکز اور رشد و ہدایت کا منبع قرار پائے گا.....“ خوب گڑگڑا کر اللہ سے دعاء و مناجات میں مشغول ہو گئے۔ (پوری دعاء سورہ ابراہیم میں ملاحظہ ہو، آیات: ۳۵-۴۱)

☆ اس دعاء میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ سے اپنی اولاد کیلئے دین و دنیا کی صلاح و فلاح اور خیر و خوبی کا سوال کیا، مثلاً: امن و امان، سکون و اطمینان، شرک اور بت پرستی سے حفاظت، نماز کی پابندی کی توفیق، لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل و متوجہ کر دینا، ان کیلئے رزق کا انتظام، اور پھر اس رزق پر اللہ کا شکر ادا کرنے کی توفیق.....!

چنانچہ اس جامع دعاء میں اللہ سے اپنی اولاد کیلئے بیک وقت دین و دنیا دونوں کی خیر و خوبی مانگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اپنی اولاد کیلئے دینی صلاح و فلاح کی دعاء کے ساتھ ساتھ ان کی معاشی بہتری اور دنیاوی خیر و خوبی کیلئے دعاء اور محنت و کوشش تو کل علی اللہ یا تعلق مع اللہ کے منافی نہیں ہے، بلکہ یہ تو اسوۂ انبیاء ہے اور یہی پیغمبرانہ استقامت و حسن انتظام کی مثال ہے کہ ایک پہلو کی رعایت کے وقت دوسرا پہلو کبھی نظر انداز نہیں ہوتا۔

چنانچہ اس موقع پر حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے حکم کی تعمیل میں اگرچہ اپنے اہل و عیال کو اس ویران و سنسان مقام پر چھوڑ کر وہاں سے روانہ ہو گئے اور یوں حضرت ہاجرہ اور شیر خوار بیٹا اسماعیل ان کی نظروں سے اوجھل تو ضرور ہو گئے..... لیکن وہ ان کی رعایت و نگہبانی اور ان کیلئے فکر و مندی کے فریضے سے غافل ہرگز نہیں ہوئے، اور خوب گڑگڑا کر اپنے اللہ سے ان کیلئے یوں دعاء و فریاد کی:

﴿رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِنْ

الْثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ﴿۱﴾

ترجمہ: (اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی کچھ اولاد اس بے کھیتی کی وادی میں تیرے حرمت والے گھر کے پاس بسائی ہے۔ اے ہمارے پروردگار! یہ اس لئے کہ وہ نماز قائم رکھیں، پس تو کچھ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر دے، اور انہیں پھلوں کا رزق عطاء فرما، تاکہ یہ شکرگزاری کریں)۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام وہاں سے روانہ ہو گئے اور یوں اپنے اس عمل سے ہمیشہ کیلئے دنیائے انسانیت کو یہ پیغام دے گئے کہ جہاں اللہ کے ہر حکم کے سامنے ہر تعلق بے معنی اور ہر رشتہ ہیچ ہے..... وہیں انسان کیلئے یہ بات بھی ضروری ہے کہ شفقتِ پدری کے تقاضے کے مطابق اپنی اولاد کی سلامتی اور دنیوی و اخروی صلاح و فلاح کیلئے ہمیشہ خوب گڑگڑا کر اور دل لگا کر اللہ سے دعاء و فریاد کیا کرے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی روانگی کے بعد حضرت ہاجرہ اور ان کا شیرخوار بیٹا اسماعیل دونوں وہیں اس ویرانے میں رہ گئے جہاں کوئی انسان نہیں تھا، جہاں نہ زندگی تھی نہ زندگی کا کوئی نشان..... تھوڑی بہت جو خوراک تھی وہ ختم ہو گئی، اب انہیں بھوک اور پیاس نے ستایا، اور شیرخوار بچے نے بری طرح رونا اور بلکنا شروع کر دیا، حضرت ہاجرہ اس ویرانے میں حیران و پریشان پانی کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگیں، قریب ہی ایک ٹیلہ (صفا) نظر آیا، اس خیال سے اس کے اوپر چڑھ گئیں کہ ٹیلہ کے اوپر بلندی سے دور دور تک نگاہ جائے گی اور یوں شاید کوئی انسان یا کھانے پینے کا کوئی سامان نظر آجائے، لیکن وہاں ایسی کوئی چیز نظر نہ آئی، سامنے (نصف کلومیٹر کے فاصلے پر) ایک اور ٹیلہ (مردہ) نظر آیا تو

صفا سے نیچے اتریں اور دوڑتی ہوئی اس دوسرے ٹیلے پر چڑھ گئیں، لیکن وہاں بھی کچھ نظر نہ آیا تو واپس پھر صفا پر پہنچیں..... یوں متناکی ماری ہوئی اس خاتون نے اپنے بچے کیلئے پانی کی تلاش میں اس پہاڑی اور پتھریلی زمین پر دوڑتے ہوئے ان دونوں ٹیلوں کے درمیان مسلسل سات چکر لگائے۔ ساتویں چکر کے اختتام پر جب وہ مروہ پر کھڑی ہوئی نہایت بے چینی کے ساتھ ادھر ادھر نظر دوڑا رہی تھیں کہ اچانک انہیں ایک آواز سنائی دی، پلٹ کر دیکھا تو بچے کے قریب کسی کو کھڑا ہوا پایا، جو کہ درحقیقت جبریل علیہ السلام تھے، جنہوں نے وہاں اس مقام پر اپنا پر زمین پر مارا کہ جہاں بچہ مسلسل روتے اور بلکتے ہوئے اپنی ایڑیاں رگڑ رہا تھا، تب اللہ کے حکم سے اس سنگلاخ اور پتھریلی زمین میں ”زمزم“ کا چشمہ پھوٹ پڑا..... یوں حضرت ہاجرہ اور ان کے شیر خوار لخت جگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کیلئے من جانب اللہ وہاں زندگی بسر کرنے کا انتظام کر دیا گیا..... اور یوں یہ دونوں ماں بیٹا مستقل طور پر اسی جگہ قیام پذیر ہو گئے..... لہذا یہی دونوں نفوسِ قدسیہ ہی اُس مقدس ترین بقعہ زمین یعنی شہر ”مکہ“ کے اولین مکین تھے۔

وقت کا پہیہ چلتا رہا..... ایک روز ملکِ یمن سے تعلق رکھنے والے قبیلہ ”بنو جرہم“ کا ایک قافلہ جب وہاں سے گذر رہا تھا تو انہوں نے اچانک وہاں ایک پرندہ اڑتا ہوا دیکھا جس پر انہیں حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی، کیونکہ یہ اس بات کی علامت تھی کہ یہاں قرب و جوار میں کہیں پانی موجود ہے۔ جبکہ اس سے قبل انہیں یہاں کبھی کوئی پرندہ نظر نہیں آیا تھا اور ان کے علم کے مطابق ماضی میں یہاں پانی کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ جبکہ اب پرندہ اڑتا ہوا نظر آیا تو انہوں نے سرگرمی سے پانی کی تلاش شروع کی جس کے نتیجے میں وہ جلد ہی ”زمزم“ تک جا پہنچے، وہاں حضرت ہاجرہ سے ملاقات ہوئی، تب انہوں نے ان

سے یہ گزارش کی کہ ہمیں یہاں مستقل قیام کی اور اس پانی سے استفادے کی اجازت دی جائے۔ غور طلب بات ہے کہ وہ پورا قافلہ تھا، جبکہ دوسری طرف محض ایک عورت اور اس کا کم سن بیٹا، اگر وہ چاہتے تو زبردستی بھی قبضہ کر سکتے تھے..... لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا، اور اعلیٰ اخلاق و کردار کا مظاہرہ کرتے ہوئے محض گزارش کی اور اجازت چاہی۔ جس پر حضرت ہاجرہ نے انہیں اس شرط پر اجازت دے دی کہ وہ اس پانی سے استفادہ تو کریں، لیکن اس پر ان کا کوئی ”حق ملکیت“ نہیں ہوگا، اور یہ حق بدستور خود ان کے پاس ہی رہیگا۔ چنانچہ اس شرط کو قبول کرتے ہوئے وہ لوگ مستقل وہیں آباد ہو گئے اور یوں مکہ کی آبادی بڑھتی گئی، حتیٰ کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام جوان ہو گئے اور ان کی والدہ نے ان کی شادی اسی قبیلہ بنو جرہم میں کرادی۔ یوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل کا یہ سلسلہ حضرت اسماعیل علیہ السلام (جو کہ حضرت ہاجرہ سے تھے) کے توسط سے مکہ مکرمہ میں بڑھتا چلا گیا۔ جبکہ دوسری طرف فلسطین میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل حضرت اسحاق علیہ السلام (جو حضرت سارہ سے تھے) کے توسط سے مسلسل بڑھتی چلی گئی اور آخر یہی لوگ ”بنی اسرائیل“ کہلائے۔



نسب مبارک:

اس سے قبل یہ تذکرہ ہو چکا ہے کہ اللہ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند جلیل حضرت اسماعیل علیہ السلام جب اللہ کے حکم کی تعمیل میں دونوں تعمیر کعبہ میں مشغول تھے اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ رب العزت سے دعاء و مناجات کے دوران یہ دعاء بھی مانگی تھی: ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (۱) ترجمہ: (اے ہمارے رب! ان میں انہی میں سے رسول بھیج جو ان کے پاس تیری آیتیں پڑھے، انہیں کتاب و حکمت سکھائے اور انہیں پاک کرے، یقیناً تو غلبہ والا اور حکمت والا ہے)

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعاء اسی شہر مکہ میں رسول اللہ ﷺ کی ولادت اور پھر بعثت کی شکل میں پوری ہوئی، جیسا کہ خود قرآن کریم میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ﴾

ترجمہ: (وہی ہے جس نے ان ناخواندہ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے، اگرچہ یہ اس سے قبل یقیناً کھلی گمراہی میں تھے) (۲)

رسول اللہ ﷺ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند جلیل حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل

سے تھے۔ اور صحت و درستی کے اعتبار سے اس سلسلہ نسب کے دو حصے ہیں:

☆ پہلا حصہ آپ ﷺ کے والد عبد اللہ سے آپ کے اکیسویں پشت کے دادا عدنان سے جاملتا ہے، سلسلہ نسب کے اس حصے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے، بلکہ آپ ﷺ نے خود یہاں تک اپنا نسب زبانی بیان فرمایا ہے۔ (۱)

☆ دوسرا حصہ بائیسویں پشت سے شروع ہو کر باسٹھویں دادا یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام تک ہے، یہ حصہ بھی درست ہے، البتہ اس کی درستی وثقاہت پہلے حصے جیسی نہیں۔ بعض مؤرخین نے باسٹھویں پشت یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اسیویں پشت یعنی ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام تک بھی نسب بیان کیا ہے، لیکن اس کی صحت کا درجہ نسبتاً مزید کمزور ہے۔

لہذا یہ بات طے ہوگئی کہ آپ ﷺ کا سلسلہ نسب حضرت ابراہیم علیہ السلام تک بالکل یقینی اور قطعی ہے اور اس میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ (۲)

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ كِنَانَةَ مِن وَلَدِ إِسْمَاعِيلَ، وَاصْطَفَىٰ قُرَيْشًا مِّنْ كِنَانَةَ، وَاصْطَفَىٰ مِنْ قُرَيْشٍ مِّنْ بَنِي هَاشِمٍ، وَاصْطَفَانِي مِّنْ بَنِي هَاشِمٍ) (۳) ترجمہ: (اللہ نے اسماعیل [علیہ السلام] کی نسل میں سے کنانہ کو منتخب فرمایا، پھر کنانہ میں سے قریش کو منتخب فرمایا، پھر قریش میں سے بنو ہاشم کو منتخب فرمایا، اور پھر بنو ہاشم میں سے مجھے منتخب فرمایا)۔

(۱) حاشیہ السیرۃ النبویۃ لابن ہشام ج: ۱- ص: ۳۹ (ذکر نسب النبی ﷺ) نیز: دلائل النبوة للبیہقی ۱/۱۸۰، وغیرہ
(۲) یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام تک آپ ﷺ کا نسب یقینی ہے، البتہ اس سلسلہ نسب میں عدنان تک کا حصہ صحت اور یقین کے اعتبار سے قطعی اور مضبوط تر ہے، بنسبت اس حصے کے جو عدنان سے اوپر ہے.....!

(۳) مسلم [۲۲۷۶] کتاب الفضائل، باب فضل النبی ﷺ (کتاب: ۴۳، باب: ۱)

☆.....ہاشم:

رسول اللہ ﷺ کے شجرہ نسب میں جو نام آئے ہیں ان میں سے متعدد شخصیات تاریخی اعتبار سے کافی شہرت کی حامل ہیں، لیکن چونکہ آپ کی نسبت عام طور پر خاندان بنو ہاشم کی طرف کی جاتی ہے، لہذا اس سلسلہ نسب کے تفصیلی تذکرے کا آغاز بھی عموماً ”ہاشم“ سے ہی کیا جاتا ہے۔

ہاشم اپنے باپ عبدمناف کی وفات کے بعد قبیلے کے سردار منتخب ہوئے اور متولی کعبہ بھی مقرر ہوئے، یوں کعبۃ اللہ کی خدمت و نگرانی، نیز حُجَّاج و زُوَّار کی خدمت و میزبانی کا شرف انہیں حاصل ہوا، گویا دنیاوی طور پر قبیلہ قریش کی سرداری و سربراہی کے ساتھ ساتھ دینی رہنمائی کا اعزاز بھی انہی کے پاس تھا۔

☆.....عبدالمطلب:

ہاشم کی وفات کے بعد قبیلے کی سرداری، نیز کعبہ مشرفہ کی خدمت و نگرانی کی ذمہ داری ہاشم کی وصیت کے مطابق ان کے بھائی مطلب بن عبدمناف کے حصہ میں آئی جس نے کچھ عرصہ اس ذمہ داری کو نبھانے کے بعد اپنے بھائی ہاشم کے اس احسان کا بدلہ چکانے کی غرض سے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی اولاد میں سے کسی کو اپنا جانشین مقرر کرنے کی بجائے ہاشم کی اولاد کو یہ شرف لوٹا دیا جائے۔

ہاشم کی ملکِ شام کی طرف تجارت کی غرض سے بکثرت آمد و رفت رہتی تھی اور اس سفر کا راستہ یثرب یعنی مدینہ سے گذرتا تھا جہاں اکثر دورانِ سفر ہاشم کا قیام بھی رہتا تھا، جس کی وجہ سے وہاں ان کی اچھی خاصی شناسائی بھی تھی، ایسے ہی ایک سفر کے موقع پر مدینہ میں قیام کے دوران ہاشم نے وہاں مدینہ کے ایک معروف و معزز خاندان ”بنو نجار“ کی

ایک خاتون سلمیٰ بنت عمرو سے شادی کر لی تھی، اور اس شادی کے بعد جلد ہی وہ اپنی منزل یعنی ملک شام کی طرف روانہ ہو گئے، جہاں فلسطین کے علاقے ”غزہ“ میں پہنچ کر بیمار پڑ گئے اور پھر وہیں ان کی وفات ہو گئی۔

ادھر ان کی وفات کے بعد مدینہ میں ان کے بیٹے کی ولادت ہوئی جس کا نام اس کی ماں نے شیبہ رکھا (اسے شیبۃ الحمد بھی کہا جاتا تھا)۔ ہاشم کی اس شادی اور پھر اس بیٹے کی پیدائش کے بارے میں مکہ میں ہاشم کے بھائی مُطَلَب کے سوا کسی کو علم نہیں تھا، البتہ مطلب نے بھی کبھی اپنے اس بھتیجے کو دیکھا نہیں تھا۔

اب مُطَلَب کے دل میں بھائی کیلئے احسان مندی کے جذبے کے تحت جب یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ بھائی کے احسان کا بدلہ چکائے (کیونکہ بھائی نے اسے اپنا جانشین مقرر کیا تھا) تو اس مقصد کیلئے اس نے سوچا کہ بھائی کے اس بیٹے کو اپنا جانشین مقرر کرے جو کہ پیدائشی طور پر ہی باپ کی شفقت و محبت سے محروم ہے اور مکہ سے بہت دور گمنامی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ چنانچہ وہ ایک روز اس کی تلاش میں مدینہ جا پہنچا، بھتیجے سے ملاقات ہوئی، اپنے فوت شدہ پیارے بھائی کی اس یادگار پر جب پہلی نگاہ پڑی تو مُطَلَب کی آنکھیں بھرا آئیں، اور دیر تک اسے گلے لگائے رکھا..... اس کے بعد آمد کا مقصد بیان کیا اور ساتھ چلنے پر اصرار کیا۔ بھتیجے نے پہلے تو انکار کیا، لیکن جب مُطَلَب نے زیادہ اصرار کیا تو بھتیجے نے کہا کہ میری ماں سے پوچھ لیجئے، میرے بارے میں وہ جو فیصلہ کریں گی وہی آخری فیصلہ ہوگا.....! انو جوان کے دل میں ماں کیلئے اتنی اہمیت..... یہ سوچ کر مُطَلَب کے دل میں بھتیجے کی قدر مزید بڑھ گئی اور اس کی ماں سے اس بارے میں بات کی، لیکن وہ اپنے لختِ جگر کو نظروں سے دور کرنے اور پردیس بھیج دینے پر کسی صورت آمادہ نہ ہوئی۔

مُطَلَب نے منت سماجت کرتے ہوئے کہا کہ تمہارا بیٹا کوئی پردیس نہیں جا رہا، بلکہ وہ تو اپنے ہی آباؤ اجداد کے شہر ”مکہ“ جا رہا ہے، جہاں یہ کسی اجنبی یا پردیسی کی طرح کسمپرسی کی زندگی نہیں، بلکہ اپنے آباؤ اجداد کی طرح شان و شوکت کی زندگی بسر کرے گا اور اپنے باپ کی طرح اپنی قوم کا سردار ہوگا..... اس پر بھی شبہ کی ماں راضی نہ ہوئی، تب مُطَلَب نے کہا کہ اس سرداری و سربراہی سے بھی بڑھ کر یہ کہ تمہارا یہ بیٹا وہاں اللہ کے گھر کا متولی ہوگا..... اس سے بڑا اور کیا شرف ہو سکتا ہے.....؟ تب شبہ کی ماں اسے اس کے چچا کے ہمراہ مکہ بھیجنے پر رضامند ہو گئی، یوں مُطَلَب اپنے فوت شدہ بھائی ہاشم کی اس نشانی کو ہمراہ لئے ہوئے مدینہ سے مکہ کی جانب روانہ ہو گیا۔

یہ سفر طے کرنے کے بعد مُطَلَب جب اپنے بھتیجے شبہ کو لئے ہوئے مکہ پہنچا تو لوگوں نے دیکھا کہ ان کے سردار کے ہمراہ اونٹ پر ایک نوجوان بھی سوار ہے، تب وہ کہنے لگے کہ دیکھو ہمارا سردار اپنے لئے ایک نیا غلام خریدا لیا ہے۔ جس پر مطلب نے انہیں تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ کوئی غلام نہیں، یہ میرا بھتیجا ہے، اور یہی تمہارا مستقبل کا سردار بھی ہے، کیونکہ میں نے اسے اپنا جانشین مقرر کیا ہے۔

اس کے بعد مکہ میں مُطَلَب نے اپنے اس بھتیجے کے ساتھ ہمیشہ اس قدر شفقت و محبت اور لاڈ پیار کا معاملہ روا رکھا کہ چچا کے اس حسن سلوک اور شفقت و مہربانی سے متاثر ہو کر بھتیجے نے زندگی بھر خود کو اپنے اصل نام (شبہ) کی بجائے ”عبدالمطلب“ ہی کہلانا پسند کیا.....!

یہی عبدالمطلب ہمارے پیارے نبی ﷺ کے دادا محترم ہیں، اور انہوں نے ہی ہمارے نبی ﷺ کا اسم گرامی ”محمد“ تجویز کیا تھا۔

☆..... مطلب کی وفات کے بعد ان کے یہ بھتیجے عبدالمطلب قبیلے کے سردار اور متولی کعبہ

مقرر ہوئے، یہ بہت ہی وجیہ اور باوقار انسان تھے، مکہ میں انہیں انتہائی عزت و احترام اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، ان کے دور میں دواہم ترین اور قابل ذکر واقعات پیش آئے جن کا مختصر تذکرہ درج ذیل ہے:

(۱) زمزم کی کھدائی:

زمزم کا چشمہ تو دراصل اللہ کے حکم سے حضرت ہاجرہ اور ان کے لخت جگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کیلئے جاری کیا گیا تھا، لیکن صدیوں تک جاری رہنے کے بعد ایک مرحلہ ایسا آیا جب مکہ میں کسی قبائلی جنگ کے موقع پر جب مخالف قبیلہ غالب آ گیا تو جاتے جاتے حسب دستور مختلف قسم کی لوٹ مار چانے اور توڑ پھوڑ کرنے کے ساتھ ساتھ ایک حرکت یہ بھی کی کہ زمزم کا کنواں وہ لوگ بند کر گئے، کیونکہ زندگی کا تمام دار و مدار تو پانی پر تھا، لہذا دشمنی کے طور پر گویا وہ اہل مکہ کیلئے زندگی کا سامان ہی برباد کر گئے۔ اور پھر مرد و زمانہ کے ساتھ نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوگ اس کا محل وقوع تک بھول گئے کہ یہ کنواں تھا کہاں.....؟

آخر عبدالمطلب جب قوم کے سردار اور متولی کعبہ بنے تو ایک رات انہوں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی انہیں زمزم کے کنویں کی کھدائی کا حکم دے رہا ہے، جس پر وہ بہت حیران ہوئے، پھر دوسری رات اور پھر اس کے بعد متواتر تیسری رات بھی یہی خواب دیکھا، اور تیسری رات مزید یہ بھی ہوا کہ خواب میں اس شخص نے انہیں زمزم کے کنویں کا محل وقوع بھی دکھایا..... اور حکم دیا کہ اس جگہ کھدائی کرو۔

چنانچہ عبدالمطلب نے اپنے بڑے بیٹے حارث کو ہمراہ لے کر اس مقام پر کھدائی شروع کی، قبیلے والوں کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ سب مصر ہو گئے کہ اس کام میں ہم سب بھی آپ کے ساتھ شریک ہوں گے تاکہ ہم بھی اس شرف اور اعزاز کے حقدار بن سکیں۔ لیکن

عبدالمطلب نے ان کا یہ مطالبہ تسلیم کرنے صاف انکار کر دیا، البتہ اس موقع پر ان لوگوں کے شدید اصرار اور مسلسل دباؤ کی وجہ سے عبدالمطلب اس قدر پریشان ہوئے کہ انہوں نے منت مانی کہ ”یا اللہ اگر تو مجھے دس بیٹے عطاء کرے اور وہ سب جوان ہو کر میرے دست و بازو بن جائیں (تاکہ آئندہ کوئی مجھے اس طرح پریشان کرنے کی جرأت نہ کر سکے) تو میں ان میں سے ایک بیٹا بطور شکر تیرے اس گھر کے سامنے قربان کروں گا.....“۔

اس سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس سلسلہ میں عبدالمطلب کو اپنی قوم کی طرف سے کس قدر دباؤ کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔

لیکن اس قدر شدید دباؤ کے باوجود فقط یہی دونوں باپ بیٹا ہی اس کھدائی میں مسلسل مشغول رہے، یہاں تک کہ آخر کئی روز کی محنتِ شاقہ کے بعد زمزم کا پانی نمودار ہو گیا، جو کہ آج تک جاری ہے، اور خلقِ خدا اس سے خوب مستفید ہو رہی ہے۔

الغرض زمزم کی کھدائی کا کام انہی دونوں باپ بیٹا نے ہی بلا شرکتِ غیرے مکمل کیا، لہذا یہ کنواں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزندِ جلیل حضرت اسماعیل علیہ السلام کے علاوہ عبدالمطلب کی بھی یادگار ہے۔

(۲) واقعہ اصحاب الفیل:

دوسرا اہم اور قابلِ ذکر واقعہ جو عبدالمطلب کے دور میں پیش آیا اور جس کا تذکرہ قرآن کریم میں سورۃ الفیل میں بھی موجود ہے، وہ یہ کہ ملکِ یمن کا بادشاہ جس کا نام ابرہہ تھا جب اسے اس بات کا علم ہوا کہ مکہ میں ایک گھر ہے جسے لوگ اللہ کا گھر کہتے ہیں اور اس کی انتہائی تعظیم و تکریم کرتے ہیں تو اس نے اس گھر یعنی کعبۃ اللہ کو منہدم کرنے کا فیصلہ کیا۔

ابرہہ کی طرف سے کعبۃ اللہ کو منہدم کرنے کی اس ناپاک و مذموم خواہش کے پیچھے اصل اور

براہِ راست محرکات و اسباب کیا تھے؟ اور پھر یہ کہ جب وہ اس مقصد کیلئے یمن سے روانہ ہوا، اور پھر جب مکہ کی حدود میں پہنچا تو اس دوران کیا کیا ہوا.....؟ اس سلسلے میں کافی تفصیل ہے جو کہ کتبِ تاریخ میں مذکور ہے۔

خلاصہ یہ کہ کعبۃ اللہ کو منہدم کرنے کی غرض سے وہ اپنا لشکرِ جرار لئے ہوئے مکہ کی حدود میں داخل ہوا اور کعبۃ اللہ کی طرف پیش قدمی کی، اس لشکر میں بڑی تعداد میں ہاتھی بھی موجود تھے، جو غالباً جنگی مقاصد کیلئے استعمال کے علاوہ مزید یہ کہ کعبۃ اللہ کو منہدم کرنے کی غرض سے بھی لائے گئے تھے۔

جب یہ لشکر مکہ مکرمہ کے مضافات میں منی کے مقام پر پہنچا تو اچانک فضاء میں اللہ کی قدرت سے چھوٹے چھوٹے پرندوں کے غول نمودار ہوئے، ہر پرندے نے اپنی چونچ اور پنچوں میں کنکریاں تھامی ہوئی تھیں، اور اس لشکر کے عین اوپر پہنچ کر ان پرندوں نے وہ کنکریاں ان پر برسا دیں، جس سے وہ تمام لشکر ہاتھیوں سمیت نیست و نابود ہو گیا، اور یوں اللہ نے اپنے گھر کی خود حفاظت فرمائی۔

جس سال مکہ مکرمہ میں یہ واقعہ پیش آیا اسی سال وہاں رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی۔

☆.....عبداللہ: (رسول اللہ ﷺ کے والدِ گرامی)

عبدال مطلب نے زمزم کا کنواں کھودتے وقت جو دعاء مانگی تھی وہ قبول ہوئی، اللہ نے انہیں دس بیٹے عطاء کئے، جو سب کے سب جوان ہوئے اور اپنے باپ کے دست و بازو بنے، ان دس جوان بیٹوں میں عبداللہ سب سے خوبصورت اور باپ کے بہت لاڈلے تھے۔

اب عبدال مطلب کو اپنی قسم پوری کرنے کی فکر لاحق ہوئی، بیٹوں کو اپنی قسم کے بارے میں

بتایا تو سب ہی بیٹوں نے باپ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا، جس پر قرعہ اندازی کی نوبت آئی، قرعہ کے نتیجے میں سب سے زیادہ لاڈلے اور پیارے بیٹے یعنی عبداللہ کا نام نکلا۔ ایک روز عبدالمطلب اپنے اس لاڈلے بیٹے کو قربان کرنے کی غرض سے جب کعبۃ اللہ کی طرف لے جانے لگے تو گھر سے روانگی کے وقت عبداللہ کی بہنوں کی حالت بگڑ گئی اور وہ زور زور سے رونے لگیں، جس پر وہاں لوگوں کا جمع اکٹھا ہو گیا، سردارانِ قریش بھی آ پہنچے، ان سردارانِ قریش اور بہت سے عزیز و احباب نے اصرار کیا کہ عبداللہ کو قربان کرنے کی بجائے قسم پوری کرنے کا کوئی اور راستہ تلاش کیا جائے، ان لوگوں کے اس اصرار کے نتیجے میں عبداللہ کے بھائیوں میں سے ابوطالب نے بھی ہمت کی اور والد سے التجاء کی کہ عبداللہ کو قربان نہ کیا جائے..... کوئی اور راستہ تلاش کیا جائے..... ان سب لوگوں کے شدید اصرار پر عبدالمطلب نے کہا کہ پھر تم ہی لوگ اس مسئلے کا کوئی حل مجھے بتاؤ۔

اس پر ان سب نے طے کیا کہ یثرب (مدینہ) میں جو ایک مشہور کاہنہ رہتی ہے اس سے رجوع کیا جائے وہی اس مسئلے کا کوئی حل بتائیگی۔ چنانچہ یہ لوگ طویل سفر طے کر کے مکہ سے مدینہ پہنچے، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ کاہنہ تو آجکل مدینہ سے مزید آگے خیبر گئی ہوئی ہے اور کچھ معلوم نہیں کہ وہاں سے اس کی واپسی کب ہوگی۔ تب یہ لوگ مدینہ سے خیبر پہنچے، کاہنہ سے ملاقات ہوئی، تمام صورتِ حال بیان کی، جسے سن کر اس نے دریافت کیا کہ تمہارے یہاں اگر کوئی کسی کو قتل کر دے تو اس پر مقتول کے ورثاء کو قاتل بطورِ فدیہ (خون بہا) کیا چیز اداء کرتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے یہاں خون بہا دس اونٹ مقرر ہے۔

یہ سن کر کاہنہ نے کہا کہ ایک طرف عبداللہ اور دوسری طرف دس اونٹ رکھے جائیں اور پھر

ان دونوں کے درمیان قرعہ اندازی کی جائے۔ قرعہ اندازی کی گئی، نام عبداللہ کا نکلا، کاہنہ نے کہا کہ دس اونٹ بڑھادیئے جائیں، یعنی ایک طرف عبداللہ اور دوسری طرف بیس اونٹ، چنانچہ دوبارہ قرعہ اندازی کی گئی، مگر نام عبداللہ کا ہی نکلا..... اس کاہنہ کے کہنے پر ہر بار دس اونٹ بڑھتے رہے..... اور قرعہ اندازی ہوتی رہی..... آخر جب سواونٹ ہو گئے اور قرعہ اندازی کی گئی تو قرعہ اونٹوں کے نام نکلا، تب کاہنہ نے کہا کہ عبداللہ کی بجائے ان سواونٹوں کو قربان کر دیا جائے، یوں قسم پوری ہو جائیگی۔ لیکن عبدالمطلب نے مزید اطمینان کیلئے ایک بار پھر قرعہ اندازی کی اور تب بھی اونٹوں کے نام ہی قرعہ نکلا..... تب عبدالمطلب مطمئن ہو گئے اور ہنسی خوشی خیبر سے واپس مکہ پہنچے اور اپنے پیارے اور لاڈلے بیٹے کے عوض سواونٹ کعبۃ اللہ کے سامنے قربان کئے اور اوران کا گوشت اسی جگہ غریبوں اور مسکینوں کیلئے چھوڑ دیا، اور یوں عبدالمطلب بیٹے کی جان بچ جانے پر بھی خوش ہو گئے نیز یہ کہ اب انہیں اس بات کی بھی بیحد خوشی تھی کہ ان کی قسم پوری ہو گئی اور یوں ان کا رب بھی ان سے راضی ہو گیا۔

یوں ہمارے پیارے رسول ﷺ کے سلسلہ نسب میں قربانی کا واقعہ ایک بار نہیں بلکہ دوبار پیش آیا، پہلی بار حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے لخت جگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ، اور دوسری بار عبدالمطلب اور ان کے لخت جگر عبداللہ کے ساتھ۔

نیز یہ کہ اس واقعے کے نتیجے میں خون بہادس اونٹوں سے بڑھ کر اب سواونٹ مقرر ہوا جس کے نتیجے میں انسان کی قدر و قیمت بڑھ گئی۔ نیز قتل و خونریزی کے واقعات میں بھی کافی کمی آگئی کہ اب قتل کرنے سے پہلے ہر کوئی بار بار سوچتا کہ اب دس کی بجائے سواونٹ دینا پڑیں گے..... اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو ”رحمۃ للعالمین“ بنانا تھا..... یوں دنیا نے آپ ﷺ کی

ولادت باسعادت سے پہلے ہی اس ”رحمت“ کی جھلک دیکھ لی۔

☆.....عبداللہ کی شادی:

قبیلہ قریش کے سردار عبدالمطلب کے لاڈلے بیٹے، ان کی آنکھوں کے نور اور دل کے سرور..... یعنی عبداللہ..... جب سوا نوٹوں کی قربانی کے عوض قربان ہونے سے بچ گئے..... اور زندگی کا سفر رواں دواں ہو گیا..... تو عبدالمطلب کو اپنے اس خوبصورت و خوب سیرت بیٹے کی شادی کی فکر دامن گیر ہوئی۔

قبیلہ قریش کی جو متعدد شاخیں اور پھران میں جو بہت سے خاندان تھے ان میں ”بنی زہرہ“ کے نام سے ایک بڑا معزز خاندان تھا، اس خاندان کے سربراہ کا نام ”وہب“ تھا، وہب اپنے حسب نسب، خاندان کی سربراہی و سرداری کے علاوہ شرافت و دیانت اور اعلیٰ اخلاق و کردار کے لحاظ سے بھی بہت معروف تھے اور معاشرے میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ وہب کی ایک نہایت چہیتی اور لاڈلی بیٹی تھی جو کہ عصمت و عفت اور شرافت و نجابت میں اپنی مثال آپ تھی اور اسی لئے خاندان میں اس کا منفرد اور ممتاز مقام تھا، اس لاڈلی بیٹی کا نام تھا ”آمنہ“۔

عبدالمطلب کی نظر میں اپنے لخت جگر عبداللہ کیلئے قبیلہ قریش کی بہت سی خاندانی لڑکیاں تھیں، لیکن ان کی یہ دلی خواہش تھی کہ کسی طرح عبداللہ کا رشتہ وہب کی اس بیٹی آمنہ کے ساتھ طے ہو جائے۔ چنانچہ یہی تمنا دل میں لئے ہوئے ایک روز وہ وہب کے گھر پہنچے، مدعی بیان کیا، اپنے بیٹے عبداللہ کیلئے آمنہ کا رشتہ مانگا..... جسے وہب نے بخوشی قبول کر لیا۔ یوں ہمارے پیارے نبی ﷺ کے گرامی قدر والدین رشتہ زوجیت میں منسلک ہو گئے.....!

اس شادی کے محض چند ہفتے بعد عبداللہ اپنے والد کی تجارت کے سلسلے میں ملکِ شام کی طرف جانے والے قافلے کے ہمراہ روانہ ہو گئے، جبکہ اس دوران ان کی اہلیہ محترمہ یعنی ”آمنہ“ امانت دارِ نور محمدی“ بن چکی تھیں.....!

ملکِ شام سے واپسی کے موقع پر راستے میں عبداللہ بیمار پڑ گئے، اور یہ قافلہ جب مدینہ کی حدود میں پہنچا تو ان کی طبیعت اس قدر ناساز ہو گئی کہ وہ مزید سفر جاری رکھنے کے قابل نہ رہے اور مدینہ میں ہی رک گئے (۱) جبکہ قافلہ انہیں چھوڑ کر منزل کی جانب روانہ ہو گیا..... مکہ پہنچ کر قافلے والوں نے عبدالمطلب کو جب بیٹے کی بیماری کی اطلاع دی تو وہ انتہائی پریشان اور فکر مند ہو گئے اور فوراً اپنے بڑے بیٹے حارث کو عبداللہ کی خبر گیری کیلئے مدینہ کی طرف روانہ کیا، حارث انتہائی سرعت کے ساتھ جب یہ طویل سفر طے کر کے مدینہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ عبداللہ کی وفات ہو چکی ہے اور انہیں مدینہ کے محلہ ”دار النابغہ“ میں دفن کیا جا چکا ہے..... اس پر حارث انتہائی رنجیدہ و افسردہ ہوا، اور فوراً ہی مکہ کی طرف واپس لوٹ گیا، اور مکہ واپس پہنچنے پر اس نے اپنے والد عبدالمطلب کو یہ افسوسناک خبر سنائی.....!

انقال کے وقت جناب عبداللہ کی عمر صرف پچیس برس تھی، جبکہ سیدہ آمنہ کی عمر اس سے بھی کم تھی۔ یوں سیدہ آمنہ اپنے محبوب شوہر کی امانت لئے ہوئے، عین عالمِ شباب میں بیوہ ہو گئیں..... جبکہ وہ امانت ابھی اس دنیا میں آئی بھی نہیں تھی۔

(۱) مدینہ میں عبداللہ نے خاندان ”بنونجار“ میں قیام کیا تھا، جو کہ ان کی دادی کا خاندان تھا، بعد میں ہجرتِ مدینہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کی اذنی اللہ کے حکم سے جب مسلسل چلتی چلی جا رہی تھی، آخر ”بنونجار“ کے اسی محلے میں پہنچ کر خود بخود رک گئی تھی..... آپ نے وہیں قیام فرمایا تھا اور مسجد نبوی بھی اسی مقام پر تعمیر کی گئی تھی، آپ کی مدینہ آمد کے موقع پر بنونجار ہی کی بچیاں نہایت والہانہ انداز میں خیر مقدمی اشعار پڑھ رہی تھیں ”طلع البدر علینا.....“

ولادت باسعادت:

رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت سے تقریباً پانچ ہزار سال قبل اللہ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کعبہ کے وقت جو دعاء مانگی تھی، اس دعاء کی قبولیت کا وقت اب آچکا تھا۔

نیز جس مقصد کی خاطر انہوں نے اپنی ذریت کے ایک حصے کو وہاں اس ویران و سنان اور بے آب و گیاہ مقام پر چھوڑا تھا..... اس مقصد کی تکمیل کا وقت اب آ پہنچا تھا۔ مکہ مکرمہ میں جس سال عام الفیل کا واقعہ پیش آیا، اسی سال اس واقعے کے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد شہر مکہ میں آباد خاندان بنو ہاشم میں ”آمنہ کے لال“ یعنی ہمارے پیارے نبی ﷺ کی ولادت ہوئی..... موسم بہار کی ایک صبح اس مبارک شہر میں ایسا پھول کھلا جس نے اپنی مہک اور خوشبو سے سارے عالم کو معطر کرنا تھا..... ایک ایسا آفتاب جگمگایا جس نے اپنی روشنی سے تمام کائنات کو بقعہ نور بنانا تھا..... رشد و ہدایت کا ایسا دریچہ کھلا جس نے اس سلسلہ نبوت کی تکمیل کرنا تھی جس کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی تھی۔

رسول اللہ ﷺ کی ولادت کے بارے میں تمام اہل علم اس بات پر متفق ہیں کہ ماہ ربیع الاول میں ولادت ہوئی، نیز دن کے بارے میں بھی سب کا اتفاق ہے کہ پیر کا دن تھا۔

البتہ تاریخ ولادت کے بارے میں اہل علم کے متعدد اقوال ہیں، جن کے مطابق تاریخ نو سے بارہ کے درمیان تھی۔ متعدد قدیم و جدید اہل علم، مؤرخین، نیز ماہرین فلکیات کی نظر میں صحیح ترین تاریخ ۹/ربیع الاول ہے۔ البتہ عام مشہور یہ ہے کہ آپ ﷺ کا یوم ولادت ۱۲/ربیع الاول ہے۔

آپ ﷺ کی ولادت باسعادت کے موقع پر من جانب اللہ متعدد اشارات و بشارات کا ظہور ہوا، مثلاً آپ کی والدہ ماجدہ نے آپ کی ولادت سے چند روز قبل خواب میں بہت بڑی روشنی دیکھی، نیز آپ کی ولادت کے موقع پر بہت بڑا نور دیکھا جس سے اطراف و اکناف کی ہر چیز روشن ہو گئی۔ اس کے علاوہ بعض عجیب و غریب حالات و حوادث اور غیر معمولی واقعات بھی پیش آئے، مثلاً اس وقت دنیا کی عظیم الشان اور انتہائی طاقتور مملکت یعنی فارس کے سب سے بڑے آتش کدے میں مسلسل ایک ہزار سال سے روشن آگ، جس کی وہ پوجا کیا کرتے تھے، اچانک بجھ گئی، کسریٰ شاہ فارس کے عظیم الشان اور فلک بوس محل کی چند برجیاں اچانک ٹوٹ کر نیچے آ گئیں اور زمیں بوس ہو گئیں.....!

یہ سب کچھ درحقیقت اس بات کے غیبی اشارے تھے کہ اس نومولود کو اللہ عز و جل کی طرف سے جو دین عطا کیا جائے گا وہ بہت جلد مشرق و مغرب میں ہر جگہ چھا جائیگا اور قیصر و کسریٰ کی عظیم الشان سلطنتیں عنقریب اس کے قدموں میں ہوں گی.....!!



ایام رضاعت و طفولت:

☆.....حلیمہ سعدیہ کی گود میں:

رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت کے بعد سب سے پہلے آپ کی والدہ ماجدہ سیدہ آمنہ نے اپنے لختِ جگر کو چند روز تک خود دودھ پلایا، اس کے بعد کچھ مدت کیلئے ابولہب کی کنیز ثویبہ نے یہ خدمت انجام دی، اور اس کے بعد یہ شرف قبیلہ بنو سعد سے تعلق رکھنے والی حلیمہ سعدیہ کے حصے میں آیا۔

دراصل مکہ کے شرفاء میں یہ رواج تھا کہ وہ اپنے شیر خوار بچوں کو کچھ عرصہ کیلئے ”بادیہ“ (گاؤں) میں رکھنا پسند کرتے تھے، تاکہ شہر کے آلودہ ماحول سے دور صاف ستھری اور خالص آب و ہوا میں بچے کی صحت پر خوشگوار اثرات مرتب ہوں اور اس کی نشو و نما بھی اچھی ہو۔ نیز یہ کہ شہر میں چونکہ بیرونی لوگوں کی بکثرت آمد و رفت رہا کرتی ہے، لہذا ان کے ساتھ مسلسل اختلاط اور میل جول کی وجہ سے زبان بھی خالص نہیں رہتی اور لب و لہجہ بھی متاثر ہوتا ہے، جبکہ گاؤں والوں کی زبان خالص ہوا کرتی ہے اور اس میں دوسری کسی زبان کی ملاوٹ کا احتمال نہیں ہوتا۔

چنانچہ جن دنوں رسول اللہ ﷺ کی ولادت ہوئی آپ کی والدہ ماجدہ نے بھی حسبِ دستور اپنے لختِ جگر کو گاؤں بھیجنے کا ارادہ کیا، اتفاق سے انہی دنوں بادیہ بنی سعد سے تعلق رکھنے والی کچھ عورتیں بچے کو دلینے کی غرض سے شہر مکہ کی جانب روانہ ہوئیں، جن میں حلیمہ سعدیہ بھی تھیں، مکہ پہنچنے کے بعد شہر میں گھوم پھر کر سب ہی عورتوں نے کوئی نہ کوئی شیر خوار بچہ گود لے لیا، جبکہ حلیمہ کو کوئی بچہ نہ مل سکا، البتہ ایک یتیم بچہ تھا جسے کسی عورت نے محض اس

وجہ سے اپنا ناقبول نہیں کیا تھا کہ اس یتیم بچے کو گود لے کر شاید کوئی معقول معاوضہ اور مالی فائدہ نہ مل سکے..... اور پھر یتیم بھی ایسا کہ جس نے باپ کا نام تو سنا ہو..... مگر آنکھیں باپ کی صورت دیکھنے کو ترستی ہوں..... جس کا باپ اس کی پیدائش سے پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہو چکا.....!

حلیمہ کو چونکہ کوئی بچہ نہیں مل سکا تھا اس لئے سوچا کہ خالی ہاتھ واپس جانے سے بہتر ہے کہ اس یتیم کو ہی قبول کر لیا جائے، چنانچہ بادلِ ناخواستہ اسے گود لے لیا..... جس یتیم بچے کو گود لینے پر حلیمہ رنجیدہ و دلبرداشتہ تھیں اور اس چیز کو اپنی ناکامی تصور کر رہی تھیں..... انہیں کیا خبر تھی کہ بظاہر تو یہ ناکامی تھی..... لیکن ایسی ناکامی پر ہزاروں کامیابیاں قربان ہو جائیں.....!

حلیمہ خود بھی لاغر و فاقہ زدہ تھیں..... لہذا بقول ان کے خود ان کے اپنے شیر خوار بیٹے کو کبھی پیٹ بھر کر دودھ پینا نصیب نہیں ہوا تھا، لیکن اُس وقت جب انہوں نے بنو ہاشم کے اس ”دُرّ یتیم“ کو گود لیا اور پہلی بار اسے اپنا دودھ پلایا تو اس نے خوب سیر ہو کر دودھ پیا اور اس کے بعد دیر تک سوتا رہا، اور تب حلیمہ نے اپنے حقیقی بیٹے کو بھی دودھ پلایا تو پہلی بار اس نے بھی خوب پیٹ بھر کر دودھ پیا اور اس کے بعد وہ بھی دیر تک سوتا رہا..... یہ بات حلیمہ اور ان کے شوہر (حارث بن عبد العزیٰ) کیلئے انتہائی حیرت انگیز تھی۔ ان کی ایک بکری اور ایک اونٹنی بھی اس سفر میں ہمراہ تھی، وہ دونوں بھی فاقہ زدہ تھیں اور ان کا دودھ نہ ہونے کے برابر تھا، لیکن اس روز ان دونوں نے بھی خوب زیادہ دودھ دیا، حلیمہ اور ان کے شوہر نے اس روز خوب جی بھر کر دودھ پیا۔

گاؤں سے مکہ شہر کی طرف آتے وقت کیفیت یہ تھی کہ حلیمہ کی گدھی کمزوری کی وجہ سے سب

سے پیچھے پیچھے چل رہی تھی اور حلیمہ کی سہیلیاں بار بار راستے میں رک کر اس کا انتظار کرتی تھیں..... لیکن اب مکہ سے گاؤں کی طرف واپسی کا وقت آیا تو کیفیت یہ ہوئی کہ حلیمہ کی وہی گدھی اس قدر چست اور تیز رفتار ہو گئی کہ سب سے آگے آگے دوڑنے لگی، جس پر حلیمہ کی سہیلیاں بار بار انہیں پیچھے سے پکارتیں کہ حلیمہ رک جاؤ..... کچھ ہمارا بھی تو خیال کر لو..... اور بار بار پوچھتیں کہ حلیمہ کیا یہ تمہاری وہی گدھی ہے.....؟ حلیمہ جواب دیتیں کہ ہاں یہ وہی تو ہے..... اس پر وہ کہتیں کہ وَاللّٰہِ اِنَّ لَهَا لَشَأْنًا..... یعنی ”بخدا آج تو اس کی شان ہی نرالی ہے!“

اسی طرح گاؤں پہنچنے کے بعد ان کی کھیتی باڑی اور غلہ و خوراک وغیرہ..... غرضیکہ ہر چیز میں نہایت تیزی کے ساتھ حیرت انگیز طور پر بہتری اور برکت کے آثار نمایاں ہوتے چلے گئے، خود حلیمہ کی صحت بھی بہت اچھی ہو گئی..... جس پر وہ دونوں میاں بیوی انتہائی حیران بھی تھے اور بہت زیادہ خوش بھی، حتیٰ کہ ایک روز حلیمہ کے شوہر نے انہیں کہا: (تَعْلَمِی وَاللّٰہِ یَا حَلِیْمَۃُ! لَقَدْ اَخَذَتْ نَسَمَۃً مُّبَارَکَۃً.....) یعنی: ”حلیمہ! یقین کرو، بخدا مجھے تو یوں لگتا ہے کہ تم یہ جو بچہ لائی ہو یہ انتہائی مبارک ہے.....!“ اس پر حلیمہ نے برجستہ جواب دیا: (وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَا رَجُوْا ذٰلَکَ) یعنی: ”بخدا مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے.....“۔

اور یوں حلیمہ سعدیہ اور ان کے افراد خانہ کو اس ”دُرِیْتِم“ کی قدر و قیمت کا مکمل ادراک و احساس ہوا اور وہ اس کی بدولت فیوض و برکات کا اپنی کھلی آنکھوں سے مسلسل مشاہدہ بھی کرتے رہے اور خوب مستفید و مستفیض بھی ہوتے رہے.....!

دو سال دیکھتے ہی دیکھتے گزر گئے..... حلیمہ کا دل بالکل نہیں چاہتا تھا کہ یہ بچہ ان کی آغوش سے واپس چلا جائے، لیکن مدتِ رضاعت پوری ہو چکی تھی، لہذا بادلِ ناخواستہ وہ اسے اس

کی والدہ کے پاس مکہ شہر لے گئیں، بچے کی والدہ نے اپنے لختِ جگر کی اتنی اچھی صحت دیکھی تو انتہائی خوش ہوئیں، ماں کی یہ خوشی دیکھ کر حلیمہ نے موقع مناسب سمجھا اور ڈرتے ڈرتے کہا کہ ”آپ دیکھ رہی ہیں کہ گاؤں کی صاف ستھری فضاء میں بچے کی صحت کتنی عمدہ ہے، لیکن اب مجھے یہ فکر ستر رہی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اب یہاں شہر میں اس کی صحت خراب ہو جائے..... اس لئے میں چاہتی ہوں کہ..... اگر آپ اجازت دیں تو میں بچے کو مزید کچھ عرصہ کیلئے واپس اپنے ہمراہ لے جاؤں..... بی بی آمنہ دیکھ ہی چکی تھیں کہ بادیہ بنی سعد میں رہتے ہوئے بچے کی صحت خوب عمدہ ہے اور وہاں کی آب و ہوا اس کو خوب موافق آئی ہے، نیز انہوں نے اپنے لختِ جگر کیلئے حلیمہ کا جب یہ جذبہ اور پیار بھی دیکھا تو وہ مسکرائیں اور مزید کچھ عرصہ کیلئے بچے کو لے جانے کی اجازت دے دی۔

☆..... حادثہ شق صدر:

حلیمہ اس بچے (رسول اللہ ﷺ) کی واپسی پر بہت خوش تھیں، اور یوں بادیہ بنی سعد میں مزید تین سال (یعنی کل پانچ سال) گزر گئے، لیکن ایک روز نہایت عجیب واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے حلیمہ انتہائی خوفزدہ اور پریشان ہو گئیں۔ ہوا یہ کہ یہ بچہ ایک روز جب گاؤں کے دوسرے ہم عمر بچوں کے ہمراہ کھیل کود میں مشغول تھا کہ اچانک وہاں کوئی اجنبی نمودار ہوا، اور اس نے بچے کو زمین پر لٹا کر اس کا سینہ چاک کر دیا..... دوسرے بچوں نے جب یہ منظر دیکھا تو فوراً دوڑتے ہوئے حلیمہ کے گھر پہنچے اور بتایا کہ کسی نے محمد (ﷺ) کو قتل کر دیا ہے۔ حلیمہ انتہائی پریشانی کے عالم میں وہاں پہنچیں تو دیکھا کہ گھبراہٹ کی وجہ سے آپ کے چہرے کا رنگ قدرے بدلا ہوا ہے۔

درحقیقت وہ اجنبی شخص جبریل امین علیہ السلام تھے جو اللہ کے حکم سے وہاں آئے تھے،

انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا سینہ چاک کر کے قلبِ مبارک باہر نکالا، اور اس میں سے سیاہ نفلے کی مانند جمے ہوئے خون کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نکال کر یہ کہتے ہوئے پھینک دیا کہ ”یہ شیطان کا حصہ ہے“ (یعنی اس حصے کو دل سے نکال کر پھینک دیا تا کہ شیطان کبھی آپ پر غالب نہ آ سکے) پھر آپ کے دل کو سونے کی طشتری میں رکھ کر آبِ زمزم سے دھویا، اس میں ایمان و حکمت کا جو ہر بھرا، اور پھر اسے اسی طرح جوڑ کر سینے میں اس کے مقام پر رکھ دیا۔ (۱) دراصل یہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے اپنے حبیب ﷺ کیلئے ایک قسم کا روحانی آپریشن اور سامانِ عصمت تھا۔

اس حادثہ کی وجہ سے حلیمہ سعدیہ بہت زیادہ گھبرا گئیں، اور آپ کی سلامتی کو مد نظر رکھتے ہوئے چند روز بعد آپ کو مکہ شہر میں آپ کی والدہ ماجدہ کے پاس چھوڑ آئیں۔

☆..... والدہ کی کفالت میں:

بادیہ بنی سعد میں تقریباً پانچ سال گزارنے کے بعد آپ ﷺ اپنی والدہ کے سایہ شفقت میں واپس پہنچ گئے۔ جب چھ سال کے ہوئے تو والدہ نے اپنے شوہر نامدار یعنی عبداللہ بن عبدالمطلب سے خلوص و وفاء کے اظہار کے طور پر مدینہ کا سفر کیا، اس سفر میں کمسن بیٹے (یعنی آپ ﷺ) کو بھی یہ سوچ کر ہمراہ لیا کہ بیٹے کو باپ کی شکل دیکھنا تو نصیب نہ ہو سکا..... کم از کم اب اسے باپ کی قبر کی زیارت ہی نصیب ہو جائے۔ اس سفر میں کنیز ام ایمن بھی ہمراہ تھیں، یہ کمسن بچہ اس طویل اور کٹھن سفر میں مناظرِ فطرت کا بغور مطالعہ و مشاہدہ کرتا رہا، اس مختصر قافلے نے مدینہ میں تقریباً ایک ماہ قیام کیا۔ (۲)

(۱) ملاحظہ ہو حدیث: اَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَتَاهُ جَبْرِيلُ وَهُوَ يَلْعَبُ مَعَ الْغُلَّامِ ، فَصَرَعَهُ فَشَقَّ عَنْ قَلْبِهِ فَاسْتَخْرَجَهُ..... (مسلم: ۲۴۰، کتاب الایمان)۔ (۲) یہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

☆..... والدہ کی وفات:

آپ ﷺ کی والدہ بی بی آمنہ مدینہ میں تقریباً ایک ماہ قیام کے بعد جب مکہ کی طرف واپس روانہ ہوئیں تو راستے میں انتہائی تندوتیز اور گرم صحرائی ہواؤں نے آلیا، جس کی وجہ سے شدید بیمار پڑ گئیں، راستے میں علاج کا کوئی انتظام تھا اور نہ ہی راحت و آرام کا کوئی بندوبست..... چند روز کی اس علالت کے بعد آخر مدینہ اور مکہ درمیان ”ابواء“ نامی مقام پر اس جہان فانی سے کوچ کر گئیں.....! اور انہیں اسی مقام پر ہی دفن کر دیا گیا۔

کمن بچے نے اپنی معصوم آنکھوں سے ماں کو یوں پردیس میں نزع اور موت کی کشمکش سے گذرتے دیکھا..... جس سے اس کا گداز قلب مزید بڑھ گیا۔

☆..... دادا کی کفالت میں:

اُم ایمن جو اس سفر میں ہمراہ تھیں، پردیس میں بی بی آمنہ کی علالت اور پھر وفات کے بعد اس کمن بچے کو ہمراہ لئے ہوئے واپس مکہ پہنچیں اور وہاں اسے اس کے دادا عبدالمطلب کے حوالے کر دیا..... یہ بچہ اس سفر کیلئے ماں کی انگلی تھامے ہوئے جب گھر سے روانہ ہوا تھا

بقیہ از حاشیہ صفحہ گذشتہ:

(۲) آپ ﷺ جب بعد میں مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے اور وہاں مستقل قیام کیا، تب ایک روز آپ جب بنو نجار کے ایک محلے سے گذر رہے تھے آپ کی نگاہ اس مکان پر پڑی جہاں آپ نے بچپن میں اپنی والدہ ماجدہ کے ہمراہ سفر مدینہ کے موقع پر قیام کیا تھا، اتنا عرصہ گذر جانے کے باوجود آپ نے اس مکان کو پہچان لیا، اور پھر سن آٹھ ہجری میں فتح مکہ کی غرض سے مدینہ سے مکہ کی جانب سفر کے دوران راستے میں ابواء نامی مقام پر آپ اپنی والدہ کی قبر پر بھی گئے، اور وہاں خوب روئے، جیسا کہ حدیث کے الفاظ ہیں زَارَ النَّبِيُّ ﷺ قَبْرَ أُمِّهِ فَبَكَى وَ أَبْكَى مِنْ حَوْلَهُ..... ”یعنی آپ نے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کی اور تب آپ خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی رلایا.....“ (مسلم: ۹۷۶، کتاب الجنائز)۔

تب سر پر باپ کا سایہ نہ تھا..... اور اب اس طویل اور تھکا دینے والے سفر کے بعد جب واپس مکہ میں اپنے گھر پہنچا تو کیفیت یہ تھی کہ ماں کی ممتا سے بھی محروم ہو چکا تھا.....! یوں ہمارے پیارے رسول ﷺ اپنی پیاری ماں کی وفات کے بعد اب اپنے دادا محترم یعنی جناب عبدالمطلب کی کفالت میں آ گئے، اُس وقت آپ کی عمر مبارک چھ سال تین ماہ اور دس دن تھی۔ (۱)

دادا نے جب اپنے اس یتیم پوتے کو اپنے دامن کفالت و تربیت میں لیا تو جی بھر کر اسے پیار دیا، اسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھا، اور اپنے بچوں سے بھی بڑھ کر اس کے ساتھ ہمیشہ لاڈ اور پیار کیا، وہ آپ ﷺ کو ہمیشہ اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے، دن بھر آپ ﷺ کو اپنے ساتھ ہی رکھتے، اور رات کو جب آپ ﷺ سو جاتے تو وہ بار بار اٹھ کر آپ ﷺ کی خبر گیری کیا کرتے۔

عبدالمطلب چونکہ اپنے قبیلہ کے سردار ہونے کے علاوہ متولی کعبہ بھی تھے اس لئے کعبۃ اللہ کے قریب ان کیلئے خاص مسند بچھائی جاتی تھی جس پر کبھی کسی کو بیٹھنے کی جرات نہ ہوتی، یہاں تک کہ ان کے اپنے بیٹے بھی جب وہاں آتے تو اس مسند کے آس پاس بیٹھ جاتے..... مگر آپ ﷺ کو عبدالمطلب ہمیشہ اس مسند خاص پر اپنے ساتھ ہی بٹھاتے، اگر کبھی کوئی آپ ﷺ کو وہاں سے اٹھانے کی کوشش کرتا تو عبدالمطلب یوں کہتے: دَعُوا ابْنِي! فَوَاللَّهِ إِنَّ لَهُ لَشَأْنًا..... یعنی: ”میرے بیٹے کو یہیں بیٹھا رہنے دو، کیونکہ اللہ کی قسم اس کی تو شان بڑی ہی زالی ہے.....“، اور ساتھ ہی فرط محبت سے آپ ﷺ کی پشت پر ہاتھ پھیرتے اور آپ ﷺ کے اس انداز شاہانہ اور استغناء کو دیکھ کر خوش ہوا کرتے۔

لیکن آپؐ دادا کی اس شفقت سے بھی جلد ہی محروم ہو گئے جب بیاسی سال کی عمر پا کر یہ شفیق و مہربان دادا بھی راضی ملکِ عدم ہو گئے، اور مکہ مکرمہ میں محلہ حجون میں دفن ہوئے۔

جب ان کا جنازہ اٹھا تو آپ ﷺ بھی ساتھ تھے، شدتِ غم اور فرطِ محبت سے اُس وقت آپؐ جنازے کے ہمراہ روتے جا رہے تھے.....!

اُس وقت آپؐ کی عمر مبارک صرف آٹھ سال دو ماہ اور دس دن تھی۔ (۱)

☆..... ابوطالب کی کفالت میں:

رسول اللہ ﷺ کے دادا محترم عبدالمطلب نے وفات سے قبل وصیت کی تھی کہ ان کے بعد آپؐ کی کفالت و تربیت آپؐ کے چچا ابوطالب کے ذمہ ہوگی، چنانچہ ابوطالب نے اس عظیم ذمہ داری کو بہت ہی احسن طریقے سے تادمِ آخر نبھایا، آپؐ سے وہ اس قدر محبت رکھتے تھے کہ آپؐ کو ہمیشہ اپنی اولاد سے بڑھکر چاہا اور اپنے بچوں پر مقدم رکھا، جب سوتے تو آپؐ کو ساتھ لے کر سوتے، اور جب باہر جاتے تو آپؐ کو ساتھ لے کر جاتے۔

یوں زندگی کے دن گذرتے رہے..... وقت کا پہیہ چلتا رہا..... اور آپؐ ابوطالب کی زیرِ سرپرستی بچپن اور کم سنی کی حدود سے گذرنے کے بعد اب لڑکپن کی عمر میں داخل ہو گئے اور اب کچھ ہوش سنبھالا تو محسوس کیا کہ چونکہ آپؐ کے مشفق و محسن چچا قلیل المال اور کثیر العیال ہیں، لہذا تلاشِ معاش کے سلسلہ میں ان کا ہاتھ بٹانا چاہئے۔ چنانچہ اس جذبے کے تحت آپؐ نے اس دور میں بکریاں بھی چرائیں اور محنت و مشقت بھی کی۔ (۲)

(۱) البدایہ والنہایہ لابن کثیر، وغیرہ۔

(۲) یہاں یہ تذکرہ بھی ہو جائے کہ ابوطالب کی معاشی تنگ دستی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ متولیِ کعبہ بھی تھے، حجاج کی خدمت، دیکھ بھال اور مہمان نوازی انہی کے ذمہ تھی، جسے اس دور کے رواج کے مطابق وہ اپنے لئے بڑا فخر سمجھتے تھے اور اس راہ میں بڑی فراخ دلی کے ساتھ اپنا مال خرچ کیا کرتے تھے۔

مرحلہ شباب:

☆.....تجارت:

چونکہ مکہ اور اس کے مضافات میں زراعت کا کہیں کوئی وجود نہیں تھا، لہذا قریش کی معیشت کا تمام تر انحصار تجارت پر تھا۔ بنو ہاشم کے جد امجد یعنی خود ہاشم کا بھی یہی ذریعہ معاش تھا، اور اب ابوطالب کا بھی یہی پیشہ تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے بچپن اور پھر لڑکپن کی منزلیں طے کرنے کے بعد نو جوانی کے مرحلے میں جب قدم رکھا تو آپؐ نے بھی تجارت کو ہی اپنا ذریعہ معاش بنایا، اور اس دور میں اپنے سرپرست اور مشفق چچا ابوطالب کے ہمراہ آپؐ نے متعدد تجارتی سفر بھی کئے۔ ان دنوں تجارت کے حوالے سے چہار سو آپؐ کے حسن معاملہ، راست بازی اور امانت و دیانت کے چرچے ہونے لگے، اپنے اور پرانے دوست و دشمن سبھی آپؐ کو ”صادق و امین“ کے لقب سے پکارنے لگے.....!!

☆.....حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح:

خدیجہ بنت خویلد انتہائی شریف النفس اور صاحبِ حیثیت خاتون تھیں، مکہ میں ان کا خاص مقام و رتبہ تھا اور قریش کے عوام و خواص سبھی انہیں نہایت عزت و عظمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا سلسلہ نسب پانچویں پشت میں رسول اللہ ﷺ کے خاندان سے جا ملتا ہے، وہ بیوہ تھیں، اپنی شرافتِ نفس، پاکیزگیِ اخلاق اور عفت و عصمت کی وجہ سے زمانہ جاہلیت میں بھی لوگ انہیں ”طاہرہ“ کے لقب سے پکارا کرتے تھے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا کاروبار اس قدر وسیع پیمانے پر تھا کہ اہل مکہ کا جب کوئی تجارتی قافلہ روانہ ہوتا تو اس میں اکثریت حضرت خدیجہؓ کے مال و اسباب سے لدے ہوئے اونٹوں کی ہوتی، اپنے کاروباری امور کی انجام دہی و نگرانی کی غرض سے حضرت خدیجہؓ مختلف اشخاص کی خدمات حاصل کیا کرتی تھیں۔

انہی دنوں حضرت خدیجہؓ کو جب رسول اللہ ﷺ کی راست بازی اور امانت و دیانت کی خبریں ملیں تو انہوں نے آپؐ کو یہ پیغام بھجوایا کہ آئندہ جو تجارتی قافلہ مکہ سے ملکِ شام کیلئے روانہ ہوگا اس کی نگرانی آپؐ کریں، ساتھ ہی معقول معاوضے کا بھی وعدہ کیا۔ آپؐ نے اپنے سرپرست و مشفق چچا ابوطالب سے مشورے کے بعد اس پیشکش کو قبول فرمایا اور سفرِ شام کیلئے تیار ہو گئے۔

چنانچہ آپؐ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مال تجارت لے کر ملکِ شام کی طرف روانہ ہوئے، توفیقِ الہی سے اس سفر میں بہت زیادہ منافع ہوا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ”میسرہ“ نامی اپنا ایک غلام بھی اس سفر میں آپؐ کے ہمراہ روانہ کیا تھا، اس نے واپس مکہ پہنچنے پر حضرت خدیجہؓ کے سامنے آنکھوں دیکھا حال بیان کیا، آپؐ کی راست بازی، معاملہ فہمی، پرہیزگاری، امانت و دیانت، فہم و فراست، حسنِ تعامل، دیگر صفاتِ حمیدہ کا تذکرہ کیا، یہ سب کچھ حضرت خدیجہؓ کیلئے انتہائی فرحت و مسرت اور اطمینان کا باعث بنا۔

حضرت خدیجہؓ اس سے قبل دو بار بیوہ ہو چکی تھیں، ان کا پہلا نکاح عتیقِ مخزومی سے، اور پھر اس کی موت کے بعد دوسرا نکاح ہند تمیمی سے ہوا تھا۔

دوسری بار بھی جب وہ بیوہ ہو گئیں تو ان کے مقام ورتبے اور مال و دولت کی وجہ سے بڑے بڑے سردارانِ قریش متعدد بار انہیں پیغام نکاح بھجوا چکے تھے، لیکن حضرت خدیجہؓ اپنی

ذہانت و فہم و فراست کی وجہ سے اس حقیقت کو خوب جان چکی تھیں کہ ان میں سے کوئی بھی مخلص نہیں ہے، یہ سبھی لوگ لالچی اور محض مال و جمال کے بھوکے ہیں..... اسی لئے وہ ایسے تمام پیغامات کو رد کر چکی تھیں۔

ایسے میں رسول اللہ ﷺ جب حضرت خدیجہؓ کا مال تجارت لے کر گئے اور اس سفر میں منافع بہت زیادہ ہوا..... اور پھر یہ کہ سفر سے واپسی پر آپؐ نے حضرت خدیجہؓ کو اس تجارت کا حساب و کتاب پیش کیا..... اور چپ چاپ چل دیئے.....!

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بس سوچتی ہی رہ گئیں کہ کس قدر عجیب و غریب ہے یہ نوجوان..... کس قدر سچا اور مخلص ہے یہ انسان..... کس قدر سچی اور صاف ستھری ہے اس کی تجارت..... کتنی معصومیت ہے اس کی ہر ادا میں..... دوسروں کی بنسبت منافع کس قدر زیادہ لایا ہے..... لیکن معاوضے کے معاملے میں کوئی تقاضا نہیں..... کوئی مطالبہ نہیں..... کوئی بحث و تکرار نہیں..... معاوضہ جو ملا بس چپ چاپ قبول کر لیا.....!

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کیلئے یہ سب کچھ انتہائی باعث حیرت تھا..... ایک طرف مسلسل پیغامات بھیجنے والے بڑے بڑے سردارانِ قریش جو کہ دراصل حرص و طمع کے مارے ہوئے اور مال و زر کے پجاری تھے..... اور دوسری طرف سیدھا سادھا، سچا، مخلص اور اس قدر قناعت پسند، متوکل و قانع قسم کا یہ نوجوان.....!

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو آپ ﷺ کی یہی ادا بھاگئی، اور وہ سمجھ گئیں کہ یہی تو ان کی وہ متاعِ مکشودہ ہے جس کی وہ مدت سے متلاشی تھیں.....!

تب حضرت خدیجہؓ نے اپنے دل کی بات اپنی ایک خاص رازدار نبیلی نفیسہ بنت مہربہ سے کہی، اور انہیں آپ ﷺ کی طرف پیغام نکاح لے کر جانے کو کہا۔ نفیسہ نے یہ پیغام آپؐ

تک پہنچایا، جس پر آپ ﷺ نے اپنے چچاؤں خصوصاً جناب ابوطالب اور حضرت حمزہؓ سے مشورہ کیا، ان دونوں نے اس رشتے کی تائید کی، اور پھر یہ دونوں آپ ﷺ کی طرف سے اظہارِ رضامندی کے طور پر حضرت خدیجہؓ کے چچا عمرو بن اسد کے پاس پہنچے اور آپ کی طرف سے رضامندی کی انہیں اطلاع دی، اور یوں آپ ﷺ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اس رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے، اور یہ مبارک ترین رشتہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات تک، یعنی مسلسل پچیس برس قائم رہا۔

رسول اللہ ﷺ کی یہ پہلی شادی تھی، جبکہ حضرت خدیجہؓ اس سے قبل دوبارہ بیوہ ہو چکی تھیں، اس شادی کے وقت آپ ﷺ کی عمر مبارک پچیس سال، جبکہ حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس سال تھی۔

بعض فضائل اُم المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا:

ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مقام و رتبے کا اندازہ اس بات سے بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ ایک بار جبریل امین علیہ السلام جب رسول اللہ ﷺ کے پاس تشریف لائے تو فرمایا: (يَا رَسُولَ اللَّهِ! هَذِهِ خَدِيجَةٌ قَدْ أَتَتْ، مَعَهَا إِنَاءٌ وَ طَعَامٌ، فَإِذَا أَتَتْكَ فَاقْرَأْ عَلَيْهَا السَّلَامَ مِنْ رَبِّهَا وَمَنِّي، وَبَشِّرْهَا بِبَيْتٍ فِي الْجَنَّةِ مِنْ قَصَبٍ، لَا صَخَبَ فِيهِ وَلَا نَصَبَ) (۱) یعنی: (اے اللہ کے رسول! یہ خدیجہ چلی آرہی ہیں، ایک برتن اور کچھ کھانا لئے ہوئے..... جب وہ آپ کے پاس آئیں تو آپ انہیں ان کے رب کی طرف سے، نیز میری طرف سے سلام کہیں، اور انہیں جنت میں ایسے گھر کی خوشخبری بھی سنائیں جو ہیرے کا بنا ہوا ہے، اس گھر میں نہ کوئی شور و شغب ہوگا اور نہ

ہی کوئی تھکاوٹ)۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس مبارک رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جانے کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پچیس برس تک مسلسل آپ ﷺ کیلئے خلوص و وفاء کا پیکر بنی رہیں، زندگی بھر آپ کی خدمت و اطاعت، آپ کے ساتھ حسن سلوک اور عزت و احترام کی نادر مثال قائم کی۔ جبکہ آپ ﷺ کو بھی حضرت خدیجہؓ سے بے پناہ محبت تھی، آپ نے ان کی زندگی میں اور کوئی نکاح نہیں کیا، ان کی وفات کے بعد آپ زندگی بھر انہیں یاد کرتے رہے اور مختلف مواقع پر نہایت بیتابی کے ساتھ ان کا ذکر خیر کرتے رہے۔

ایک موقع پر آپ ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا تذکرہ ان الفاظ میں فرمایا:

(..... آمَنْتُ بِبِي إِذْ كَفَرَ بِي النَّاسُ، وَصَدَّقْتَنِي إِذْ كَذَّبَنِي النَّاسُ، وَوَاسْتَنْبِي بِمَا لَهَا إِذْ حَرَمَنِي النَّاسُ، وَرَزَقَنِي اللَّهُ مِنْ أَوْلَادِهَا إِذْ حَرَمَنِي أَوْلَادَ النَّاسِ.....) (۱)

یعنی: ”خدیجہ نے اس وقت مجھ پر ایمان قبول کیا جب لوگوں نے میرے ساتھ کفر کیا، میری تصدیق کی جب لوگوں نے میرا انکار کیا، اپنے مال کے ذریعے میری مدد کی جب لوگوں نے مجھے محروم رکھا، نیز یہ کہ اللہ نے مجھے اولاد بھی انہی سے عطا فرمائی.....!“

☆..... مختصر تذکرہ اولادِ نبی ﷺ از حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا:

آپ ﷺ کی تمام اولاد بھی حضرت خدیجہؓ سے ہی تھی۔ سوائے ابراہیم کے جو حضرت ماریہ قبطیہؓ سے تھے، جن کی پیدائش بہت بعد میں مدینہ منورہ میں ہوئی، اور وہیں تقریباً ڈیڑھ

سال کی عمر میں وفات بھی ہوئی)

جبکہ آپ ﷺ کی باقی تمام اولاد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے ہی تھی۔ یعنی: قاسم، زینب، رقیہ، ام کلثوم، فاطمہ، اور عبداللہ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

دونوں بیٹے قاسم اور عبداللہ بچپن میں ہی وفات پا گئے، جس پر مشرکین مکہ باہم یوں کہنے لگے کہ محمد (ﷺ) کی کوئی اولادِ زینہ تو ہے نہیں، صرف بیٹیاں ہی ہیں..... لہذا ہمیں ان کے اس نئے دین کی مقبولیت اور ہر دم بڑھتی ہوئی شہرت سے پریشان ہونے کی ضرورت ہی نہیں..... کیونکہ ان کے بعد ان کی نسل کا خاتمہ ہو جائے گا اور کوئی ان کا نام لیوا نہیں رہے گا..... اور یوں ان کا یہ دین بھی خود بخود ختم ہو جائے گا.....!

اس پر سورۃ ”الکوثر“ نازل ہوئی، جس میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی جانب سے اپنے حبیب ﷺ کی دلجوئی و تسلی کی غرض سے یہ خبر دی گئی کہ ”ابتر“ یعنی ”بے نام و نشان“ آپؐ نہیں، بلکہ آپؐ کو طعنہ دینے والے یہ بد بخت خود بے نام و نشان ہو جائیں گے.....!!

چنانچہ حقیقت یہی ہے کہ چودہ سو تیس سال گزر جانے کے باوجود آج بھی دنیا کے کونے کونے میں آپؐ کے نام لیوا موجود ہیں، جن کی آپؐ کے ساتھ والہانہ عقیدت و محبت کا یہ عالم ہے کہ آپؐ کا نام نامی اور اسم گرامی سنتے ہی ان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگتی ہیں..... جذبات بے قابو ہونے لگتے ہیں..... اور..... فرطِ عقیدت کی وجہ سے ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگتے ہیں..... آج بھی مشرق و مغرب..... شمال اور جنوب..... دنیا کے ہر گوشے میں چہار سو پھیلی ہوئی ان بیشمار مساجد کے عظیم الشان اور بلند و بالا میناروں سے روزانہ پانچ بار مؤذن پکارتا ہے..... اشہد ان لا الہ الا اللہ..... اشہد ان محمد رسول اللہ..... اور یہ سلسلہ تو تا قیامت جاری رہے گا.....!

جبکہ آپ کو بے نامی کا طعنہ دینے والے وہ دشمن آج خود بے نام و نشان ہیں.....!!

☆ آپ ﷺ کی صاحبزادیوں میں سے بڑی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی شادی آپ ﷺ کی بعثت سے قبل حضرت خدیجہؓ کی خواہش پر ابوالعاص بن الربیع سے ہوئی جو کہ حضرت خدیجہ کی بہن ہالہ بنت خویلد کے بیٹے تھے۔ ابوالعاصؓ نے سن چھ ہجری میں اسلام قبول کیا اور ہجرت کی، ان کا ایک بیٹا علی تھا جو کسنی میں فوت ہو گیا تھا (فتح مکہ کے یادگار ترین اور تاریخی موقع پر یہی کسن لڑکا رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ اونٹنی پر سوار تھا)

جبکہ ان کی ایک بیٹی بھی تھی جس کا نام اُمّہ تھا، آپؐ اس کے ساتھ بہت زیادہ محبت و شفقت کا معاملہ فرمایا کرتے تھے (حتیٰ کہ بعض اوقات اسے گود میں اٹھائے ہوئے ہی نماز بھی پڑھ لیا کرتے تھے)۔

☆ دوسری صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی شادی بعثت سے قبل ابولہب کے بیٹے عتبہ سے، جبکہ تیسری صاحبزادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی شادی ابولہب کے دوسرے بیٹے عتیبہ سے ہوئی تھی، اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے حکم: ﴿وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ (۱) (یعنی: ”آپؐ اپنے قریبی رشتے داروں کو [اللہ کے عذاب سے] ڈرائیے“) کے نزول کے بعد جب آپؐ نے کوہ صفا پر بنو ہاشم کو جمع کیا اور اللہ کا پیغام پہنچایا تو اس موقع پر ابولہب نے کہا: تَبَّالَكَ! أَمَا دَعَوْتَنَا إِلَّا لِهَذَا.....؟

یعنی (نعوذ باللہ) اے محمدؐ! تم ہلاک جاؤ، کیا تم نے ہمیں اسی لئے یہاں بلایا تھا.....؟ (۲)

ابولہب کی اس بیہودہ گوئی پر آپؐ انتہائی رنجیدہ و دل گرفتہ ہوئے، جس پر آپؐ کی تسلی و دلجوئی کیلئے سورۃ المسد ﴿تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ.....﴾ نازل ہوئی (یعنی: ”ٹوٹ

جائیں ابولہب کے دونوں ہاتھ اور وہ خود بھی ہلاک ہو جائے.....“
اس پر ابولہب مشتعل ہو گیا اور اس نے اپنے دونوں بیٹوں عتبہ اور عتیبہ کو حکم دیا کہ وہ آپ کی صاحبزادیوں (حضرت رقیہؓ، و حضرت ام کلثومؓ) کو طلاق دے کر گھر سے نکال دیں، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد آپؐ نے اپنی صاحبزادی حضرت رقیہؓ کی شادی اپنے جلیل القدر صحابی حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے کر دی، ان دونوں نے پہلے مکہ سے حبشہ کی جانب ہجرت کی، اور پھر چند سال بعد ایک غلط فہمی کے نتیجے میں حبشہ سے مکہ کی جانب واپسی ہوئی، اور پھر ہجرت مدینہ کا حکم نازل ہونے کے بعد مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کی، سن دو ہجری میں عین غزوہ بدر کے روز مدینہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ (۱)

تب آپؐ نے اپنی دوسری صاحبزادی حضرت ام کلثومؓ کا نکاح حضرت عثمانؓ بن عفان سے کرادیا، اور اسی دوہرے شرف کی وجہ سے حضرت عثمانؓ ”ذوالنورین“ کے لقب سے معروف ہوئے۔

☆ سب سے چھوٹی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی آپ ﷺ نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے کی جو آپؐ کے عم زاد ہونے کے علاوہ مزید یہ کہ ابتداء سے ہی آپؐ ہی کی کفالت و سرپرستی میں بھی تھے، ان سے حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہما پیدا ہوئے۔

(۱) بعض مؤرخین کے بقول حضرت رقیہؓ کی مکہ سے خفیہ ہجرت اور حبشہ جیسے دور دراز مقام کی جانب بے بسی و کمپرسی کے عالم میں روانگی کی وجہ سے ان کی والدہ حضرت خدیجہ انتہائی افسردہ و رنجیدہ رہنے لگیں، اور بالآخر یہی صدمہ ان کی بیماری اور پھر وفات کا سبب بنا..... جبکہ دوسری طرف ماں سے دوری اور پھر ماں کی وفات کی خبر حضرت رقیہؓ کی بیماری اور پھر وفات کا سبب بنی..... واللہ اعلم۔

آپ ﷺ کی تین صاحبزادیاں (زینب، رقیہ، ام کلثوم رضوان اللہ علیہن) عین جوانی کی عمر میں آپ کی حیات میں ہی اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئیں، جبکہ چوتھی اور سب سے چھوٹی اور لاڈلی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات آپ کی رحلت کے چھ ماہ بعد اٹھائیس برس کی عمر میں ہوئی۔

☆..... کعبہ کی تعمیر نو میں شرکت:

طوفانِ نوح [علیہ السلام] کے نتیجے میں کعبۃ اللہ کی عمارت کے نشانات مٹ جانے کے بعد اس کی تعمیر نو کا مقدس فریضہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند جلیل حضرت اسماعیل علیہ السلام نے انجام دیا تھا۔ لیکن مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ عمارت کمزور اور مخدوش ہوتی چلی گئی۔ خصوصاً رسول اللہ ﷺ کی عمر مبارک جب پینتیس برس تھی، یعنی آپ کی بعثتِ مبارکہ سے پانچ سال قبل مکہ مکرمہ میں ایک زبردست سیلاب آیا، جس کے نتیجے میں کافی تباہی ہوئی، اسی سیلاب کی وجہ سے ہی کعبۃ اللہ کی عمارت مزید خستہ و بوسیدہ ہو گئی، حتیٰ کہ اس کے منہدم ہو جانے کا خطرہ محسوس ہونے لگا۔ تب اکابرِ قریش نے غور و فکر اور باہم صلاح و مشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ قبل اس کے کہ کسی روز یہ عمارت اچانک گر جائے اور کسی نقصان کا باعث بنے..... اسے خود ہی منہدم کر کے اس کی تعمیر نو کی جائے۔

چنانچہ اس منصوبے کے مطابق کعبہ کی قدیم عمارت کو منہدم کر کے اس کی جگہ نئی عمارت تعمیر کی گئی، تعمیر نو کے اس کام میں سردارانِ قریش کے ہمراہ رسول اللہ ﷺ نے بھی بنفسِ نفیس شرکت فرمائی، اس موقع پر آپ بھاری پتھر و دیگر سامانِ تعمیر خود اٹھاتے رہے، جس کی وجہ سے آپ کے مبارک کندھے زخمی ہو گئے۔

کعبہ مشرف کی اس تعمیر نو کا یہ کام جب مکمل ہوا تو حجرِ اسود کو اس کے مقام پر نصب کرنے کا مرحلہ آیا تو اس موقع پر سخت اختلاف کی نوبت آئی جس کے نتیجے میں بڑی ہی نازک صورتِ حال پیدا ہو گئی، تلواریں نیاموں سے باہر آ گئیں اور شدید جنگ کا خطرہ منڈلانے لگا..... کیونکہ ہر کسی کی یہ خواہش تھی کہ حجرِ اسود کو اٹھا کر اس کے مقام پر نصب کرنے کا یہ عظیم شرف اور اعزاز اسی کو نصیب ہو.....!!

آخر باہمی مشاورت کے بعد یہ طے کیا گیا کہ کل صبح سب سے پہلے حرم شریف میں جو کوئی داخل ہوگا وہی اس بارے میں کچھ فیصلہ کرے گا اور اس کا فیصلہ سبھی کو قبول ہوگا۔ چنانچہ دوسرے روز علی الصبح لوگوں نے یہ منظر دیکھا کہ سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ حرم میں داخل ہو رہے ہیں..... آپ کو اتنا دیکھ کر ان لوگوں کی خوشی کی انتہاء نہ رہی، اور وہ سب فرط مسرت سے یک زبان ہو کر پکاراٹھے: اُتاکم الامین اُتاکم الامین یعنی ”امین آگئے..... امین آگئے.....“!!

آپ ﷺ نے اپنی چادر مبارک زمین پر بچھائی اور حجرِ اسود کو اٹھا کر اس پر رکھا، پھر تمام سردارانِ قریش سے کہا کہ سب مل کر اس چادر کو اٹھائیں، چنانچہ ان سب نے مل کر اس چادر کو اٹھایا اور کعبۃ اللہ تک پہنچایا، تب آپؐ نے خود اپنے دستِ مبارک سے حجرِ اسود کو اس کے مقام پر نصب فرما دیا..... یوں آپؐ کی بے مثال فہم و فراست اور حسن تدبیر کی وجہ سے اس عظیم شرف میں وہ سبھی شریک ہو گئے اور یوں وہ سب مسرور و مطمئن ہو گئے..... جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں باہم بڑی جنگ اور خوں ریزی کا خطرہ ٹل گیا۔

بعثت:

رسول اللہ ﷺ کی عمر مبارک جب پینتیس برس سے تجاوز کر گئی تو طبیعت میں مزید سنجیدگی و متانت کے آثار نمایاں ہونے لگے، آپؐ اکثر خاموش اور تفکر و تدبر میں محو رہتے، آپؐ کی طبیعت اس ماحول سے مسلسل بیزار رہنے لگی کہ جہاں عقیدہ و ایمان اور اخلاق و کردار کے لحاظ سے چہار سو خرابیاں ہی خرابیاں پھیلی ہوئی تھیں، ایسے میں آپؐ کے مزاج میں گوشہ نشینی و خلوت گزینی کی طرف میلان و رجحان بڑھنے لگا، آپؐ کے کندھوں پر اہل و عیال کی ذمہ داریوں کا بوجھ تھا، دنیاوی و کاروباری امور بھی پنٹا نا پڑتے تھے، لیکن اب آپؐ کی طبیعت ان تمام کاموں سے اچاٹ رہنے لگی، آخر نبوت یہاں تک پہنچی کہ آپؐ اکثر کئی دنوں کی خوراک اپنے ہمراہ لیتے جو کہ پانی اور ستوپر مشتمل ہوتی، اور مکہ شہر سے کچھ فاصلے پر جبل النور نامی پہاڑ کی بلند و بالا چوٹی پر واقع ”غار حراء“ میں جا بیٹھتے..... دنیا سے الگ تھلگ..... وہاں آپؐ اکیلے مسلسل کئی کئی دن قیام فرماتے، اللہ کی قدرت کے بارے میں غور و فکر میں منہمک و مستغرق رہتے، اس وقت آپؐ کو کسی خاص مقصود حقیقی کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا، البتہ تلاش حق کی ایک جستجو تھی..... ایک عجیب لگن تھی..... جس نے بے چین کر رکھا تھا.....!!

اسی کیفیت میں وقت گزرتا چلا گیا..... جیسے جیسے آفتاب نبوت کے طلوع ہونے کا وقت قریب آتا گیا آپؐ پر قدرت کے اسرار و رموز منکشف ہونے لگے، آپؐ کو اکثر خواب نظر آتے، اور خواب میں آپؐ جو کچھ دیکھتے جلد ہی حقیقت کی دنیا میں بھی وہی منظر سامنے آ جاتا..... خوابوں کا یہ سلسلہ تقریباً چھ ماہ تک جاری رہا۔

اسی کیفیت میں آپ ﷺ کی عمر مبارک جب چالیس سال ہوگئی تو ایک روز جب آپ حسب معمول غار حراء میں ذکر و فکر اور عبادت میں مشغول تھے کہ اچانک وہاں کوئی اجنبی شخص نمودار ہوا جو کہ درحقیقت امین الوحی حضرت جبریل علیہ السلام تھے۔

اس نو وارد یعنی جبریل امین نے آپ کے قریب آ کر کہا: اِقْرَأْ یعنی: ”پڑھو“۔ آپ نے جواب دیا: مَا أَنَا بِقَارِئٍ یعنی: ”میں تو پڑھا ہوا ہی نہیں ہوں“۔ اس پر جبریل نے دوبارہ کہا: اِقْرَأْ یعنی: ”پڑھو“ اور آپ نے وہی جواب دیا: مَا أَنَا بِقَارِئٍ یعنی: ”میں تو پڑھا ہوا ہی نہیں ہوں“۔ تب جبریل علیہ السلام نے آپ کو گلے سے لگا کر قدرے بھینچا، اور پھر چھوڑ دیا، اس کے بعد تیسری بار کہا: ﴿اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ، خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ، الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ یعنی: ”پڑھا اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو جنم ہوئے خون سے پیدا کیا، پڑھا، اور تیرا رب بڑا مہربان ہے، جس نے قلم کے ذریعے سکھایا، جس نے انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا“۔

یہ تھی سب سے پہلی وحی جو خالق کائنات کی طرف سے اپنے آخری نبی ﷺ کی جانب نازل کی گئی، تمام آسمانی کتابوں میں سب سے آخری و افضل کتاب کا یہ سب سے پہلے نازل ہونے والا حصہ تھا، جس میں انسان کو اس کے خالق و مالک کی طرف سے تحصیل علم کا حکم دیا گیا۔ اس سے دین اسلام میں علم کی اہمیت واضح ہوتی ہے، اور یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ دین اسلام علم و معرفت اور حکمت و بصیرت کا دین ہے۔

بعثت کے وقت دینی و اخلاقی و معاشرتی حالات:

رسول اللہ ﷺ کی بعثت جن حالات میں ہوئی اُس وقت صورتِ حال کچھ ایسی تھی کہ انسانیت اندھیروں میں بھٹک رہی تھی، کفر و شرک اور ہر قسم کی معصیت و ضلالت عروج پر تھی، عقیدہ و ایمان کا معاملہ ہو یا اخلاق و اقدار کی بات ہو، ہر لحاظ سے پستی و انحطاط کا وہ دور تھا، بت پرستی، توہم پرستی، ستارہ پرستی، اور ہر گمراہی اس معاشرے میں موجود تھی، معمولی باتوں پر لڑائی جھگڑا، قتل و غارتگری، فتنہ و فساد اور خوں ریزی ان کا پسندیدہ ترین مشغلہ تھا، ہر طرف لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا، قاعدہ و قانون نام کی کسی چیز کا دور دور تک کوئی وجود نہیں تھا، ہر برائی اپنے عروج پر تھی، اور ہر لحاظ سے وہ لوگ پستی کی انتہاء کو پہنچے ہوئے تھے، کون سی برائی تھی جو اس معاشرے میں موجود نہیں تھی.....؟ اور سب سے بڑھ کر رونگٹے کھڑے کر دینے والی برائی اس معاشرے میں یہ تھی کہ وہ لوگ عار کے ڈر سے خود اپنے ہی ہاتھوں اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیا کرتے تھے، انسانیت سسک سسک کر دم توڑ رہی تھی، تڑپتی، سسکتی، دم توڑتی انسانیت کی مثال کسی تپتے ہوئے صحرا کی مانند تھی جو صدیوں سے ابرِ رحمت کا منتظر ہو.....!

ایسے میں خالق کائنات نے اپنا فضل و کرم فرمایا، اور اپنے نبی ﷺ کو پیاسی انسانیت کیلئے ابرِ رحمت بنا کر بھیجا، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ (۱) یعنی: (اے نبی! ہم نے آپ کو تمام دنیا والوں کیلئے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے)

ہر طرف چھائی ہوئی ان ظلمتوں کے درمیان آپ ﷺ اللہ کی طرف سے مینارہ نور، مشعل راہ اور روشن چراغ بن آکر آئے۔ جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿..... وَ دَاعِيَا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَ سِرَاجًا مُنِيرًا﴾ (۱)

یعنی: (..... ہم نے آپ کو بھیجا ہے اللہ کے حکم سے اُس کی طرف بلانے والا، اور روشن چراغ بنا کر)

مقصد یہ کہ جس طرح چراغ سے اندھیرے دور ہو جاتے ہیں، اسی طرح اللہ نے آپ ﷺ کو کفر و شرک اور معصیت و ضلالت کی تاریکیاں دور کرنے والا بنا کر بھیجا۔

بعثت کے فوری بعد:

رسول اللہ ﷺ پہلی وحی کے نزول کے بعد خلاف معمول جلد گھر لوٹ آئے اور آتے ہی لیٹ گئے، اور اپنی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: زَمِّلُونِي - زَمِّلُونِي یعنی ”مجھے چادر اڑھا دو، مجھے چادر اڑھا دو“۔ جس پر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کو چادر اڑھا دی۔

کچھ توقف کے بعد جب طبیعت قدرے سنبھلی تو آپ نے حضرت خدیجہ کے سامنے تمام صورتِ حال بیان کی، اور پھر اپنی پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: قَدْ خَشِيتُ عَلَى نَفْسِي یعنی ”مجھے تو اپنی جان خطرے میں محسوس ہو رہی ہے“۔ تب حضرت خدیجہ نے آپ ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: (كَلَّا، وَاللَّهِ لَا يُخْزِيكَ اللَّهُ أَبَدًا، إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحْمَ، وَتَصْدُقُ الْحَدِيثَ، وَتَحْمِلُ الْكَلَّ، وَتَكْسِبُ الْمَعْدُومَ، وَتَقْرِي الضَّيْفَ، وَتُعِينُ عَلَى نَوَائِبِ الْحَقِّ) (۲)

ترجمہ: ”نہیں نہیں! اللہ کی قسم! اللہ آپ کو ہرگز اس کام میں رسوا نہیں کرے گا، کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، مہمان نواز ہیں، محتاجوں اور غریبوں کی مدد کرتے ہیں، اور راہِ حق میں لوگوں کی مدد کرنے والے ہیں“ (۱)

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کو تسلی تو دی، اور اس یقین کا اظہار بھی کیا کہ جب آپ کا اخلاق اس قدر اچھا ہے تو پھر اللہ کی طرف سے یقیناً آپ کی حفاظت اور مدد و نصرت کا نبی انتظام بھی ضرور ہوگا.....!

لیکن ظاہر ہے کہ یہ بات خود ان کیلئے بھی بڑی تشویش کا باعث تھی۔ چنانچہ وہ مزید اطمینان اور تسلی کی غرض سے فوراً ہی آپ کو اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو ظہورِ اسلام سے قبل ہی بت پرستی سے بیزار ہو کر ایک عرصے تک تلاشِ حق میں سرگرداں رہے، اور پھر تلاش و جستجو کے بعد بالآخر اپنی دانست کے مطابق اس وقت کے صحیح دین یعنی ”نصرانیت“ کو قبول کر چکے تھے، اور اکثر انجیل بھی پڑھتے رہتے تھے، انتہائی عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے آنکھوں کی بینائی سے محروم ہو چکے تھے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کو ہمراہ لئے ہوئے ورقہ کے پاس پہنچیں اور کہا کہ دیکھو یہ (رسول ﷺ) کیا کہتے ہیں.....! اس پر ورقہ نے آپ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا کہ بولو مجھے کیا بات ہے؟ تب آپ نے تمام ماجرا بیان فرمایا۔ جسے سننے کے بعد ورقہ بن نوفل نے کہا: (هَذَا النَّامُوسُ الَّذِي أَنْزَلَهُ اللَّهُ عَلَى مُوسَى) یعنی ”یہ تو وہی ناموس ہے جو اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانب نازل کیا تھا“۔ اس کے بعد مزید کہا: يَا لَيْتَنِي جَدَعَا، (۱) غور طلب بات ہے کہ بعثت سے قبل ہی آپ ﷺ کے اخلاق کی بلندی و عظمت کا یہ حال تھا تو بعثت کے بعد کیا کیفیت ہوگی.....؟

لَيْتَنِي أَكُونُ حَيًّا إِذْ يُخْرِجُكَ قَوْمُكَ (۱) یعنی: ”کاش میں جوان ہوتا، کاش میں اُس وقت تک زندہ رہتا کہ جب آپؐ کی قوم آپؐ کو شہر سے نکال دے گی۔“ اس پر آپؐ نے حیرت و تعجب کے عالم میں دریافت فرمایا: أَوْ مُخْرِجِيْ هُمْ؟ یعنی ”کیا یہ میری ہی قوم کے لوگ مجھے میرے شہر سے نکال باہر کریں گے؟“۔ ورقہ نے جواب میں کہا: نَعَمْ یعنی ”ہاں“۔ اور پھر مزید کہا: لَمْ يَأْتِ رَجُلٌ بِمِثْلِ مَا جِئْتَ بِهِ إِلَّا عُودِيْ یعنی ”جب بھی کسی نے ایسی تعلیم پیش کی کہ جیسی تعلیم آپؐ لے کر آئے ہیں، تو اس کے ساتھ ہمیشہ دشمنی ہی کی گئی ہے۔“

اور پھر محض چند روز بعد ہی ورقہ بن نوفل کی وفات ہو گئی۔

اس کے بعد جبریل امین بھی جلد دوبارہ نہیں آئے، بلکہ کچھ عرصہ گزر گیا، غالباً اس توقف میں حکمت یہ ہوگی کہ رسول اللہ ﷺ کی طبیعت پرسکون ہو جائے، اور آپؐ کا ذہن اس حقیقت کو قبول کر لے۔

اور پھر اس توقف کے بعد ایک روز جبریل علیہ السلام دوبارہ وحی لے کر آئے، اس بار وہ سورۃ المدثر کی ابتدائی پانچ آیات لے کر آئے تھے: ﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ، قُمْ فَأَنْذِرْ، وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ، وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ، وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ﴾ (۲) ترجمہ: (اے چادر اوڑھنے والے، اٹھ کھڑے ہو جاؤ، اور آگاہ کرو، اور اپنے رب کی بڑائی بیان کرو، اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو، اور ناپاکی سے دور رہو)

اس بارے میں رسول اللہ ﷺ نے خود یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا: (بَيْنَا أَنَا أَمْسِيْتُ سَمِعْتُ صَوْتًا مِنَ السَّمَاءِ، فَرَفَعْتُ بَصْرِي قِبَلَ السَّمَاءِ، فَإِذَا الْمَلَكُ

الَّذِي جَاءَنِي بِحِرَاءٍ قَاعِدٌ عَلَى كُرْسِيِّ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ، فَجِئْتُ مِنْهُ حَتَّى هَوَيْتُ إِلَى الْأَرْضِ، فَجِئْتُ أَهْلِي، فَقُلْتُ: زَمِّلُونِي، زَمِّلُونِي، فَزَمِّلُونِي، فَأَنْزَلَ اللَّهُ تَعَالَى: يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ، إِلَى قَوْلِهِ: فَاهْجُرْ (۱) ترجمہ: (میں چلا جا رہا تھا کہ اچانک میں نے آسمان کی طرف سے ایک آواز سنی، میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو وہ فرشتہ جو غارِ حراء میں میرے پاس آیا تھا، میں نے دیکھا کہ وہی فرشتہ آسمان وزمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے، میں گھبراہٹ کی وجہ سے زمین پر بیٹھ گیا، پھر گھر پہنچتے ہی میں نے اپنی اہلیہ سے کہا ”مجھے کوئی چادر اڑھا دو، مجھے کوئی چادر اڑھا دو“ جس پر انہوں نے مجھے چادر اڑھا دی، تب اللہ تعالیٰ نے يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ سے وَالزُّجَرَ فَاهْجُرْ تک آیات نازل فرمائیں۔



(۱) بخاری [۴۹۲۶] کتاب التفسیر، باب: والرجز فاهجر۔

الحمد للہ آج بتاریخ ۱۷/ شوال ۱۴۳۲ھ، مطابق ۱۵/ ستمبر ۲۰۱۱ء بروز جمعرات یہ باب مکمل ہوا۔
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ، وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

مکی دور:

رسول اللہ ﷺ کی تئیس سالہ پیغمبرانہ زندگی اس قدر وسیع موضوع ہے اور اس کی اتنی جزئیات ہیں کہ ان میں سے ہر موضوع پر مستقل ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ سلسلہ ہر دور میں جاری رہا اور آئندہ بھی تاقیامت جاری رہے گا۔

البتہ سہولت کی خاطر بطور خلاصہ اس تئیس سالہ زندگی کو یوں تقسیم کیا جاسکتا ہے کہ ابتداء میں اسے مکی دور اور مدنی دور میں تقسیم کر دیا جائے، اور پھر ان دونوں ادوار میں سے ہر ایک کو مزید تین مختلف ادوار میں تقسیم کر دیا جائے، اس سلسلہ میں تفصیل درج ذیل ہے:

☆..... پہلا دور: خفیہ دعوت و تبلیغ:

مکی زندگی کے تین مختلف ادوار میں سے پہلا دور وہ ہے جسے ”خفیہ دعوت و تبلیغ“ کا دور کہا جاتا ہے، اور جو کہ تین سال کے عرصہ پر محیط ہے۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے جب آپؐ کو دین برحق کی تبلیغ کا فریضہ سونپا گیا تو اس حکم ربانی کی تعمیل میں آپؐ نے سب سے پہلے اپنے افرادِ خانہ کو پیغامِ حق پہنچایا، جس کے نتیجے میں آپؐ کی زوجہ محترمہ ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، آپؐ کے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ، آپؐ کے چچا زاد بھائی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے (جو کہ آپؐ ہی کے زیرِ کفالت تھے) آپؐ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اس پیغامِ حق کو قبول کیا۔

ان افرادِ خانہ کے بعد آپؐ نے گھر سے باہر ان لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف دعوت دی

جن میں آپ ﷺ کو خیر و خوبی کی جھلک نظر آتی تھی، ان افراد میں آپ کے انتہائی قریبی رازدار اور خاص ترین دوست اور با اعتماد ساتھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، و دیگر متعدد ایسے حضرات تھے جو کہ بالکل ابتدائی دور میں ہی دعوت حق پر لبیک کہتے ہوئے مشرف باسلام ہو گئے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ تمام حضرات وہ تھے کہ جن کا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بہت قدیم اور قریبی تعلق چلا آ رہا تھا، جس کی وجہ سے یہ حضرات آپ کے اخلاق و کردار سے بخوبی واقف تھے، آپ کی زندگی کا کوئی گوشہ ان سے مخفی نہیں تھا..... اس کے باوجود سب سے پہلے انہی حضرات کا آپ کی دعوت کو قبول کرنا اور بلاچون و چرا آپ کی تصدیق کرنا آپ کی صداقت و حقانیت، نیز آپ کے اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ کردار کی مضبوط دلیل ہے۔

تین سال کے عرصے پر محیط خفیہ دعوت و تبلیغ کا یہ دور یوں مکمل ہوا کہ گئے چنے چند افراد نے اس دین برحق کو قبول کیا، جس کی خبر اگرچہ مشرکین مکہ کے کانوں تک جا پہنچی، تاہم انہوں نے اسے محض وقتی چیز سمجھتے ہوئے اس طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

☆..... دوسرا دور؛ علانیہ دعوت و تبلیغ:

نبوت کے چھٹے سال کے آغاز میں جب یہ آیت نازل ہوئی ﴿وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ (۱) یعنی: (آپ ڈرائیے اپنے خاندان والوں، قرابت داروں کو) اس حکم ربانی کی تعمیل میں آپ نے اب علانیہ دعوت و تبلیغ کا آغاز فرمایا، اور یوں مکی زندگی کے دوسرے دور کا آغاز ہوا، جو کہ نبوت کے دسویں سال تک جاری رہا۔

چنانچہ ایک روز آپ ﷺ نے کوہ صفا پر اپنے خاندان والوں یعنی بنو ہاشم کو جمع کیا تاکہ ان کے سامنے دعوت حق پیش کر سکیں، لیکن اس موقع پر ابولہب نے حسب معمول الٹی سیدھی ہانپی شروع کی، جس کی وجہ سے آپ اپنا مدعی بیان نہ کر سکے۔

دوسرے روز آپ نے دوبارہ بنو ہاشم کو جمع کیا اور مدعی بیان کرنے سے پہلے ان سے اپنی تصدیق چاہی (۱) جس پر ان سب نے بیک زبان کہا: مَا جَرَّ بِنَا عَلَیْكَ كَذِبًا یعنی ”ہم نے آپ سے کبھی جھوٹ نہیں سنا“۔ تب آپ نے انہیں اللہ کا پیغام پہنچایا، اللہ کے دین کی طرف انہیں دعوت دی، صرف ایک اللہ کی عبادت کی تلقین فرمائی، بت پرستی اور ہر قسم کے شرک سے انہیں روکا، معاشرتی برائیوں سے باز رہنے کی تاکید فرمائی۔

اس کے بعد آپ نے ان حاضرین محفل سے دریافت فرمایا کہ اس کام میں تم میں سے کون میرا ساتھ دے گا.....؟

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اس وقت کم سن تھے، اور اس محفل میں موجود تمام افراد بنو ہاشم میں وہ سب سے چھوٹے تھے، مگر اس کے باوجود وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور باواز بلند بلا تردّد آپ کی حمایت اور اس کام میں بھرپور ساتھ دینے کا وعدہ کیا، جبکہ وہ اس سے بہت قبل ہی مشرف باسلام بھی ہو چکے تھے۔

آپ کے سر پرست اور مشفق و مہربان چچا ابوطالب نے اس موقع پر آپ کو اس سلسلے میں اپنی مکمل حمایت اور تائید کا یقین دلایا، البتہ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ: اِنَّ نَفْسِي لَا تُطَاوِ عُنِي عَلٰی فِرَاقِ دِيْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ یعنی ”میرا دل نہیں مانتا کہ میں عبدالمطلب کے دین

(۱) یعنی آپ ﷺ نے وہاں موجود بنو ہاشم سے اپنے بارے میں دریافت فرمایا کہ میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ تم مجھے سچا سمجھتے ہو؟ یا یہ کہ تمہاری نظر میں میں جھوٹا انسان ہوں.....؟

سے روگردانی کروں“۔

مقصد یہ کہ دین اسلام کی دعوت و تبلیغ اور نشر و اشاعت کی جہاں تک بات ہے اس سلسلے میں میں آپ کے شانہ بشانہ ہر تعاون اور مدد کیلئے مکمل طور پر تیار ہوں..... لیکن جہاں تک میرے اپنے دین کا معاملہ ہے تو میں اپنے آبائی دین کو نہیں چھوڑ سکتا.....!!

رسول اللہ ﷺ نے اپنا سلسلہ گفتگو جاری رکھا، اسی دوران جب آپ نے یہ ارشاد فرمایا: اِنِّیْ نَذِیْرٌ لَّكُمْ بَیْنَ یَدَیْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ یعنی ”میں تمہیں ڈراتا ہوں سخت عذاب سے“۔ یہ الفاظ سنتے ہی ابولہب بھڑک اٹھا، اور یوں ہرزہ سرائی کرنے لگا: تَبَّ اَ لَكَ، اَلْهٰذَا جَمَعْتَنَّا؟ یعنی (نعوذ باللہ) ”تو ہلاک ہو جائے، کیا تو نے ہم سب کو صرف اسی لئے یہاں جمع کیا ہے؟“۔

ابولہب کی زبانی یہ انتہائی سخت اور قبیح ترین الفاظ سن کر رسول اللہ ﷺ انتہائی رنجیدہ ہو گئے، جس پر آپؐ کی دلجوئی و تسلی کیلئے خالق ارض و سماء کی جانب سے سورہ تبت یدا (یعنی سورہ مسد) نازل کی گئی، جس میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے یہ کہا گیا کہ ہلاکت و بربادی تو خود ابولہب کیلئے ہے.....!

انہی دنوں جب آیت ﴿فَاَصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ.....﴾ (۱) یعنی ”آپ کو جو حکم دیا گیا ہے اسے آپ خوب صاف صاف بیان کر دیجئے.....“ نازل ہوئی تو اس حکم ربانی کی تعمیل کرتے ہوئے اب آپ ﷺ نے اپنے سلسلہ دعوت و تبلیغ کو مزید تیز کر دیا اور اس کام کو مزید وسعت دی، چنانچہ اب آپؐ نے اپنے قرابت داروں کے علاوہ مزید یہ کہ پورے شہر مکہ میں ہر جگہ اور ہر قبیلے کو پیغام حق پہنچانا شروع کر دیا، اب آپؐ جگہ جگہ گھومتے مختلف

قبائل اور خاندانوں کے مساکن میں تشریف لے جاتے، بازاروں، گلیوں، محلوں، میں جاتے، کوئی میلہ منعقد ہوتا..... یا کوئی محفل سبقتی..... یا کسی بھی قسم کا کوئی اجتماع ہوتا..... آپؐ وہاں پہنچتے..... خصوصاً حج کے موقع پر بیرون مکہ سے بڑی تعداد میں جو لوگ حج کی غرض سے آتے، آپ ﷺ انہیں دین اسلام کی دعوت دیتے، اسی طرح مختلف علاقوں سے عربوں کے جو تجارتی قافلے مکہ آتے آپؐ ان سے ملاقاتیں کرتے، ان کے ٹھکانوں اور ان کی اقامت گاہوں میں جا کر انہیں پیغام حق سناتے اور دین برحق کی طرف دعوت دیتے.....!

مشرکین کی طرف سے ایذا رسائیوں کا سلسلہ:

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب مشرکین مکہ بھی طیش میں آ گئے..... طاغوتی قوتیں حرکت میں آ گئیں، اور اب انہوں نے سچائی کا راستہ روکنے اور آپؐ کو نیز آپؐ کے مٹھی بھر ساتھیوں کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچانا شروع کیں، کسی کو شدید گرمی کے موسم میں میں آگ اگلنے ہوئے سورج کے نیچے پتی ہوئی ریت پر لٹا کر سینے پر بڑا بھاری پتھر رکھ دیا جاتا، تاکہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکے..... کسی کو پاؤں میں رسیاں ڈال کر دن بھر مکہ کی پتھر ملی اور گرم گلیوں میں گھسیٹا جاتا..... کسی کو انگاروں پر لٹایا جاتا..... اس دور میں جن حضرات پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے اور انتہائی وحشیانہ طریقے سے ان پر ہر قسم کا تشدد کیا گیا، ان میں خاص طور پر بلال بن رباح، یاسر اور ان کے بیٹے عمار، نیز عمار کی والدہ سمیہ اسی طرح خباب بن الارت وغیرہ..... قابل ذکر ہیں، رضی اللہ عنہم اجمعین۔

اُس دور میں خود رسول اللہ ﷺ کو بے حد تکلیفیں پہنچائی گئیں، کبھی آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھادیے جاتے، کبھی غلاظت کے ڈھیر ڈال دیئے جاتے، کبھی آپؐ کے قتل کی

سازش کی جاتی، نیز ایک بار جب آپ ﷺ بیت اللہ کے قریب نماز کے دوران اپنے رب کے سامنے حالتِ سجدہ میں تھے، تو چند بد بختوں نے اونٹ کی اوڑھی لاکر آپ کی پشت مبارک پر ڈال دی، جس کے بوجھ اور وزن کی وجہ سے آپ ﷺ کافی دیر تک کوئی حرکت نہ کر سکے..... جبکہ نجاست و غلاظت اور بد بو کی تکلیف اس کے علاوہ تھی.....!!

☆..... مزید یہ کہ آپ ﷺ کو ان جسمانی اذیتوں اور تکلیفوں کے علاوہ ہر قسم کی دینی و نفسیاتی تکلیف پہنچانے میں بھی ان ظالموں اور بد بختوں نے کوئی کسر اٹھانہ رکھی..... چنانچہ کبھی آپ گو دِیوانہ، کہا گیا، جیسا کہ قرآن کریم میں اسی طرف اشارہ ہے: ﴿وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ﴾ (۱) ترجمہ: (انہوں نے کہا کہ اے وہ شخص جس پر قرآن نازل کیا گیا ہے، یقیناً تو تو کوئی دیوانہ ہے)

کبھی کہتے کہ یہ قرآن تو نعوذ باللہ اس شخص نے خود ہی لکھوا لیا ہے اور اللہ کی طرف اس کی جھوٹی نسبت کر دی ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَقَالُوا أَأَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلَىٰ عَلَيْهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا﴾ (۲) ترجمہ: (اور یہ بھی کہا کہ یہ تو محض گذشتہ لوگوں کے افسانے ہیں، جو اس نے لکھا رکھے ہیں، بس وہی صبح و شام اس کے سامنے پڑھے جاتے ہیں)

اور کبھی بطور استہزاء و تمسخر یوں کہتے ہیں کہ یہ کیسا عجیب رسول ہے جو کھانا پیتا اور بازاروں میں گھومتا پھرتا ہے.....؟ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَقَالُوا مَا لِهَذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ.....﴾ (۳) ترجمہ: (اور انہوں نے کہا کہ یہ کیسا رسول ہے؟ جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟)

نیز کبھی ”جادوگر“ اور کبھی ”جھوٹا“ کہا گیا، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے ﴿وَقَالَ الْكَافِرُونَ هَذَا سَاحِرٌ كَذَّابٌ﴾ (۱) ترجمہ: (اور کہا کافروں نے کہ یہ تو بس جادوگر ہے جھوٹا ہے)

غور طلب بات ہے کہ وہی مشرکین مکہ جو آپ ﷺ کو بعثت و رسالت سے قبل ہمیشہ سے ”صادق و امین“ کے لقب سے پکارتے چلے آ رہے تھے..... اب وہی لوگ یک بیک آپ کو ”جھوٹا“ کہنے لگے..... اور پھر خاص طور پر جبکہ ان میں سے اکثریت کے ساتھ آپؐ کا قرابت داری کا تعلق بھی تھا..... اپنوں ہی کی زبانی دل چھلنی کر دینے والی یہ باتیں..... یقیناً یہ چیز آپؐ کیلئے انتہائی صدمے اور نفسیاتی تکلیف کا باعث تھی۔

نیز یہ مشرکین مکہ بغض و نفرت کی شدت کی وجہ سے آپ ﷺ کو تیز نگاہوں اور کھا جانے والی نظروں سے دیکھا کرتے تھے، جس کا قرآن کریم میں یوں تذکرہ کیا گیا ہے: ﴿وَإِنْ يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَيُزْلِقُونَكَ بِأَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُولُونَ إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ﴾ (۲) ترجمہ: (اور قریب ہے کہ کافرا اپنی تیز نگاہوں سے آپ کو پھسلا دیں جب کبھی قرآن سنتے ہیں، اور کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو ضرور دیوانہ ہے)

مزید یہ کہ آپ ﷺ کو دلی رنج اور نفسیاتی صدمہ پہنچانے کی غرض سے بد بخت ابولہب نے اپنے بیٹوں عتبہ اور عتیبہ کو حکم دیا کہ وہ دونوں اپنی بیویوں کو طلاق دے دیں، جو کہ آپؐ کی صاحبزادیاں یعنی حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم (رضی اللہ عنہما) تھیں، جن کا نکاح آپؐ کی بعثت سے قبل ابولہب کے ان بیٹوں کے ساتھ ہوا تھا (۳)

ہجرت حبشہ:

رسول اللہ ﷺ کی بعثت مبارکہ کے بعد پانچواں سال چل رہا تھا، علانیہ تبلیغ کے اس سلسلے کو دو سال کا عرصہ گزر چکا تھا، کفار و مشرکین کی طرف سے بدسلوکیوں اور ایذا رسانیوں کا سلسلہ بھی بدستور عروج پر تھا، تب آپؐ نے اپنے جاں نثار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو مشورہ دیا کہ وہ ملک حبشہ کی جانب ہجرت کر جائیں، کیونکہ وہاں ایک نہایت عادل و انصاف پسند بادشاہ کی حکمرانی ہے۔

چنانچہ آپ ﷺ کے اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے صحابہ کرام کی ایک مختصر جماعت جو کہ بارہ مردوں اور چار عورتوں پر مشتمل تھی، مکہ مکرمہ سے ملک حبشہ کی جانب ہجرت کر گئی، ان میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بمع اپنی اہلیہ حضرت رقیہ بنت رسول ﷺ بھی شامل تھے۔ کچھ ہی عرصے کے بعد اسی مردوں اور اٹھارہ عورتوں پر مشتمل دوسرا قافلہ روانہ ہوا جس میں حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے، نیز ان کی اہلیہ حضرت اسماء بنت عمیسؓ بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ (۱)

مشرکین مکہ نے انہیں گرفتار کرنے کی غرض سے دور تک ان کا تعاقب کیا، لیکن وہ تیز رفتاری کے ساتھ جدہ سے بحری راستے سے سفر کرتے ہوئے ان کی دسترس سے باہر نکال گئے، اور پھر بخیر و عافیت ملک حبشہ پہنچنے کے بعد وہاں مشرکین مکہ کے مظالم سے دور..... اب چین اور سکون کی زندگی بسر کرنے لگے.....!!

(۱) بعد میں سن آٹھ ہجری میں رومیوں کے خلاف غزوہ موتہ کے موقع پر حضرت جعفرؓ کی شہادت کے بعد حضرت اسماءؓ بنت عمیس حضرت ابو بکر صدیقؓ کے نکاح میں اور پھر ان کی وفات کے بعد حضرت علیؓ کے نکاح میں آئیں۔

اُدھر مشرکین مکہ کو جب یہ خبر ملی کہ مسلمان اب ان کی پہنچ سے دور ملک حبشہ میں آرام اور چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں..... تو ان کینہ پروروں نے کئی دن بچ و تاب کھانے کے بعد آخر یہ فیصلہ کیا کہ ایک وفد ملک حبشہ کی جانب روانہ کیا جائے، جو وہاں کے بادشاہ نجاشی سے ملاقات کر کے اسے اس بات پر آمادہ کرے کہ مسلمانوں کو دوبارہ ان کے حوالے کر دیا جائے۔

آخر اس منصوبے کے تحت مشرکین مکہ کا ایک وفد ملک حبشہ جا پہنچا، اور بادشاہ سے ملاقات سے قبل اس کے درباریوں اور مشیروں سے متعدد ملاقاتیں کیں، ان کے ساتھ تعارف اور دوستی کے رشتے استوار کئے، اور پھر بطور رشوت قیمتی تحائف اور نذرانے پیش کئے..... یوں شاہی دربار میں پیش ہونے اور وہاں اپنی آمد کا مقصد بیان کرنے سے قبل ہی ان مکاروں نے بادشاہ کے ان وزیروں، مشیروں کو اپنی مٹھی میں کر لیا.....!!

آخر ایک روز شاہی دربار میں پیش ہوئے، وہاں بھی بھاری نذرانے اور قیمتی تحائف پیش کرنے کے بعد اپنا مدعی بیان کرتے ہوئے یوں گویا ہوئے:

”اے بادشاہ! ہمارے شہر کے چند سر پھرے اور فتنہ پرداز قسم کے لوگ اپنے آبائی دین سے برگشتہ ہو کر آپ کے ملک میں آ بسے ہیں۔ اے بادشاہ! اگر انہوں نے اپنے آباء واجداد کا دین چھوڑ کر آپ کا دین ہی اپنا لیا ہوتا تب بھی غنیمت تھا..... مگر انہوں نے تو ایک ایسا عجیب و غریب نیا دین ایجاد کر لیا ہے جسے سمجھنے سے ہم اور آپ دونوں ہی قاصر ہیں.....

اے بادشاہ! جس طرح انہوں نے ہمارے شہر مکہ میں فتنہ پھیلا یا ہے، یقیناً اسی طرح اب یہ آپ کے ملک میں بھی فتنہ اور خرابی ہی پھیلائیں گے۔ لہذا ہمارے بزرگوں اور دانشمندوں نے ہمیں آپ کی خدمت میں بھیجا ہے، تاکہ آپ انہیں ہمارے حوالے کر دیں..... اور ہم

انہیں اپنے ہمراہ واپس مکہ لے جاسکیں.....“

بادشاہ نے ان کی یہ بات سننے کے بعد اپنے درباریوں اور مشیروں کی جانب استغفہامیہ انداز میں دیکھا، گویا وہ ان کی رائے جاننا چاہتا ہو..... اور تب..... رشوت بول اٹھی..... سبھی درباریوں نے پرزور انداز میں مشرکین مکہ کی تائید اور ان کے مطالبے کی حمایت کی، اور اپنے بادشاہ کو مسلمانوں کی طرف سے مزید بد دل کرنے کیلئے تاکید کی اور کہا کہ جو اپنے آباؤ اجداد کے دین کے ساتھ غدا کر سکتے ہیں..... ان سے خیر کی کیا توقع کی جاسکتی ہے.....؟

مشرکین مکہ اور پھر ان کے بعد اپنے ان درباریوں کی گفتگو سننے کے بعد بادشاہ نے کہا: ”انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے ان مسلمانوں کی بات بھی سن لوں، اور اس کے بعد ان کے بارے میں کوئی فیصلہ صادر کروں.....“

چنانچہ مسلمانوں کو وہاں دربار میں طلب کیا گیا، بادشاہ نے ان سے دریافت کیا کہ ”یہ کیوں سادین ہے کہ جس کی خاطر تم نے اپنے آباؤ اجداد کے دین کو چھوڑ دیا ہے..... اور پھر یہ کہ ہمارا دین بھی نہیں اپنایا.....؟“

بادشاہ کی طرف سے اس سوال کے جواب میں ان حضرات صحابہ کرام میں سے حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کھڑے ہوئے اور یوں گفتگو کا آغاز کیا:

”أَيُّهَا الْمَلِكُ! كُنَّا قَوْمًا أَهْلَ جَاهِلِيَّةٍ ، نَعْبُدُ الْأَصْنَامَ ، وَ نَأْتِي الْفَوَاحِشَ ، وَ نَأْكُلُ الْمَيْتَةَ ، وَ نَقْطَعُ الْأَرْحَامَ ، وَ نُسِيءُ الْجَوَارَ ، وَ يَأْكُلُ الْقَوِيُّ مِنَّا الضَّعِيفَ ، فَكُنَّا عَلَى ذَلِكَ ، حَتَّى بَعَثَ اللَّهُ إِلَيْنَا رَسُولًا مِنَّا ، نَعْرِفُ نَسَبَهُ وَ صِدْقَهُ وَ أَمَانَتَهُ وَ عِفَافَهُ ، فَدَعَانَا إِلَى اللَّهِ لِنُوحِدَهُ وَ نَعْبُدَهُ ،

وَنَخْلَعُ مَا كُنَّا نَعْبُدُ نَحْنُ وَآبَاؤُنَا مِنْ دُونِهِ مِنَ الْجِبَارَةِ وَالْأَوْثَانِ
 وَأَمَرْنَا بِصَدَقِ الْحَدِيثِ ، وَ آدَاءِ الْأَمَانَةِ ، وَ صَلَۃِ الرَّجَمِ ، وَ حُسْنِ
 الْجَوَارِ ، وَ الْكَفِّ عَنِ الْمَحَارِمِ وَ الدِّمَاءِ ، وَ نَهَانَا عَنِ الْفَوَاحِشِ ، وَ قَوْلِ
 الزُّورِ ، وَ أَكْلِ مَالِ الْيَتِيمِ ، وَ قَذْفِ الْمُحْصَنَاتِ فَصَدَّقْنَاهُ وَ آمَنَّا بِهِ
 فَعَدَا عَلَيْنَا قَوْمُنَا ، فَعَذَّبُونَا ، وَ قَتَلُونَا عَنْ دِينِنَا ، لِيَرُدُّونَا إِلَى
 عِبَادَةِ الْأَوْثَانِ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَلَمَّا قَهَرُونَا ، وَ ظَلَمُونَا ، وَ حَالُوا بَيْنَنَا
 وَ بَيْنَ دِينِنَا ، خَرَجْنَا إِلَى بِلَادِكَ ، وَ اخْتَرْنَاكَ عَلَى مَنْ سِوَاكَ ، وَ رَغِبْنَا
 فِي جَوَارِكَ ، وَ رَجَوْنَا أَنْ لَا نُظْلَمَ عِنْدَكَ أَيُّهَا الْمَلِكُ ۔

ترجمہ: ”اے بادشاہ! ہم جاہل تھے، ہم بتوں کی پوجا کیا کرتے تھے، بدکاری کیا کرتے
 تھے، ہم مردار کھاتے تھے، پڑوسیوں کے ساتھ برا سلوک کیا کرتے تھے، ہم میں سے
 جو طاقتور تھا وہ کمزور کو کھاتا تھا، ہم اسی کیفیت میں زندگی بسر کر رہے تھے کہ اس دوران
 اللہ نے ہم میں سے ایک ایسی ہستی کو نبی بنا کر ہماری جانب مبعوث فرمایا کہ جس کے حسب
 نسب، نجابت و شرافت، امانت و دیانت، نیز اس کی پاکیزہ زندگی سے ہم سب خوب واقف
 تھے، اس نے ہمیں ایک اللہ کی عبادت کی طرف دعوت دی، اور اللہ کے سوا جن بتوں کی ہم
 اور ہمارے باپ دادا پوجا کرتے چلے آ رہے تھے ان کی پوجا سے باز رہنے کی
 تاکید کی، اس نے ہمیں راست بازی، امانت داری، صلہ رحمی، اور پڑوسیوں کے ساتھ حسن
 سلوک کا سبق سکھایا، خونریزی، بے حیائی، دروغ گوئی، یتیموں کا مال ہڑپ کر جانے،
 اور پاکدامن عورتوں پر بہتان لگانے سے ہمیں منع کیا، پس ہم نے اس کی تصدیق کی
 اور اس پر ایمان قبول کیا، جس پر ہماری قوم ہمارے درپے آزار ہو گئی، ہمیں ہر طرح ستایا،

پریشان کیا، اور ہمیں اپنے دین سے برگشتہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، جب ان کا ظلم و ستم حد سے تجاوز کر گیا تو اے بادشاہ ہم نے اپنے وطن عزیز کو خیر باد کہا، اور پناہ کی تلاش میں ہم آپ کے ملک میں چلے آئے، یہ امید لئے ہوئے کہ یہاں ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے گا اور یہ کہ یہاں ہمارے ساتھ کوئی ظلم و زیادتی نہیں ہوگی.....۔“

یہ تھا اس نئی اُمتی کے مکتب کا فیض..... کہ ایک صحرائیں..... جس نے دنیا کی کسی درس گاہ میں کوئی تعلیم حاصل نہیں کی..... جس کے پاس کوئی ڈگری نہیں..... جسے دنیا کے کسی شاہی دربار میں جانے کا کبھی اتفاق ہی نہیں ہوا..... شاہی درباروں کے آداب سے یکسر ناواقف..... سفارتی آداب سے مکمل بے خبر..... مگر بادشاہ کے دریافت کرنے پر جو جواب دیا..... وہ کس قدر جامع، پُر مغز، مدلل، اور اثر انگیز تھا..... یقیناً یہ معلم انسانیت رسول اکرم ﷺ کی پاکیزہ تربیت ہی کا نتیجہ تھا.....!!

اس کے بعد نجاشی نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے کہا ”تمہارے نبی کی جانب اللہ کی طرف سے جو کلام نازل کیا گیا ہے، کیا اس میں سے کچھ تم مجھے سنا سکتے ہو؟ اس پر حضرت جعفرؓ نے سورہ مریم کی ابتدائی چند آیات تلاوت کیں، جنہیں سن کر نجاشی زار و قطار رونے لگا، اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے جو اس کے رخساروں پر بہنے لگے..... تب بے اختیار وہ بول اٹھا: إِنَّ هَذَا الَّذِي جَاءَ بِهِ عِيسَى لَيَخْرُجُ مِنْ مِشْكَاةٍ وَاحِدَةٍ یعنی ”بیشک یہ کلام اور وہ کلام جو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام لائے ہیں، دونوں ایک ہی چراغ سے نکلے ہوئے نور ہیں۔“

نجاشی حضرت جعفرؓ کی تقریر سے اور پھر ان کی زبانی سورہ مریم کی تلاوت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے ان مسلمانوں کو مشرکین مکہ کے حوالے کرنے سے صاف انکار کر دیا، اور پھر

مشرکین مکہ کے وفد کو مخاطب کرتے ہوئے یوں کہنے لگا کہ ”اللہ نے مجھے یہ سلطنت رشوت لے کر عنایت نہیں کی..... پھر میں کسی سے رشوت کیوں لوں.....؟ اور وفد کو واپس لوٹ جانے کا حکم دیا۔ (۱)

جب یہ وفد ناکام و نامراد مکہ واپس پہنچا اور اپنی ناکامی و وذلّت کی داستان سردارانِ قریش کے گوش گزار کی تو وہ غصے کے مارے دانت پیس کر رہ گئے.....!!

حضرت حمزہؓ، نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا قبولِ اسلام:

انہی دنوں، یعنی جب آفتابِ نبوت کو مکہ شہر پر اپنی روشن کرنیں بکھیرتے ہوئے چھٹا سال چل رہا تھا، ایک بڑی خوشگوار تبدیلی یہ آئی کہ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ مشرف باسلام ہو گئے، مکہ میں یہ انتہائی شریف النفس اور بہت ہی صاحبِ وجاہت سمجھے جاتے تھے، معاشرے میں ان کا بڑا مقام و رتبہ تھا اور انہیں انتہائی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، رسول اللہ ﷺ کے چچا تھے، خاندانِ بنو ہاشم کے چشم و چراغ تھے.....

اور پھر صرف تین دن بعد ہی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی بالکل اچانک ہی مسلمان ہو گئے، حالانکہ اس سے قبل وہ دین اسلام کے شدید مخالف اور مسلمانوں کے سخت دشمن

(۱) چنانچہ یہ تمام مسلمان اس کے بعد بدستور حبشہ میں ہی رہے، اور پھر نبوت کے تیرہویں سال جب ہجرتِ مدینہ کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ و دیگر تمام مسلمان مستقل طور پر مدینہ منتقل ہو گئے تب یہ مہاجرین حبشہ بھی وہاں سے مدینہ پہنچ گئے۔ البدنہ حبشہ میں قیام کے دوران ایک بار کسی نے یہ غلط خبر اڑادی کہ تمام مشرکین مکہ اسلام قبول کر چکے ہیں، جس پر متعدد حضرات جن میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نیز ان کی اہلیہ حضرت رقیہ بنت رسول بھی شامل تھیں حبشہ سے مکہ واپس آ گئے، لیکن یہاں آنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ اطلاع غلط تھی، چنانچہ یہاں پہنچنے کے بعد انہیں از سر نو مشرکین مکہ کی طرف سے اذیتوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا..... اور پھر جب ہجرتِ مدینہ کا حکم نازل ہوا تب ان حضرات نے دوبارہ ہجرت کی، یعنی پہلے مکہ سے حبشہ کی جانب، اوپر مکہ سے مدینہ کی جانب۔

تھے، ہمیشہ مسلمانوں کے درپے آزار رہتے تھے، انتہائی بہادر، دلیر اور تندرست و توانا قسم کے انسان تھے، مکہ میں ان کا بہت زیادہ رعب اور دبدبہ تھا، بڑے بڑے بہادر اور جوان ان کے نام سے لرزتے تھے..... جیسا کہ مشہور صحابی رسول حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عمرؓ کا قبول اسلام ہم مسلمانوں کیلئے عزت کا ذریعہ اور فتح و نصرت کا پیش خیمہ تھا، ہم مسلمانوں نے عمرؓ کے قبول اسلام کے بعد پہلی بار علی الاعلان اور کھلے عام بیت اللہ کا طواف کیا اور وہاں نماز ادا کی، اس سے قبل ہمیں کبھی یہ جرأت نہ ہوئی تھی (۱)

ترغیب و ترہیب کا سلسلہ:

مشرکین مکہ کے وفد کی حبشہ سے ناکام واپسی..... اور پھر اس کے فوری بعد حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور پھر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام..... یہ پے درپے ایسے واقعات تھے جن سے مشرکین مکہ انتہائی افسردہ و پژمرده ہو گئے اور ان کے حوصلے پست پڑنے لگے..... لہذا پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنی تمام تر نفرت و عداوت کے باوجود اب انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ مصالحتی رویہ اپنانے کا فیصلہ کیا اور اس سلسلے میں گفت و شنید کی غرض سے انہوں نے متعدد بار رسول اللہ ﷺ سے نیز ابوطالب سے ملاقاتیں کیں، جو کہ آپؐ کے چچا بھی تھے اور سرپرست بھی۔

☆..... چنانچہ اسی سلسلے میں مشرکین مکہ نے اپنے ایک مشہور سردار عتبہؓ کو آپؐ کے ساتھ

(۱) ما زلنا أعرّة منذ أسلم عمر (صحيح البخاري ، باب اسلام عمر) ولقد رأيتنا ما نستطيع أن نصلي إلى البيت حتى أسلم عمر (طبقات ابن سعد ۳/ ۲۷) انّ اسلامه كان نصراً (المعجم الكبير للطبراني ۹/ ۱۸۱) دین کے معاملے میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی اسی بے مثال جرأت و شجاعت کی وجہ سے ہی رسول اللہ ﷺ نے انہیں ”فاروق“ کا لقب عطا فرمایا تھا۔

گفت و شنید کی غرض سے بھیجا، جس نے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ”اے بھتیجے! آپ نے پوری قوم کو مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے، آپ نے ہماری جماعت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے..... ان سرگرمیوں سے اگر آپ کا مقصود مال و دولت سمیٹنا ہے، تو ہم سارے عرب کے خزانے آپ کے قدموں میں ڈھیر کر دیں گے..... اگر آپ کو عزت اور نام و نمود کی طلب ہے تو ہم آپ کو اپنا سردار مان لیں گے، اگر حکومت کی تمنا ہے تو ہم آپ کو پورے ملک عرب کا حکمران تسلیم کر لیں گے..... اور اگر آپ پر کسی جن بھوت یا آسیب کا اثر ہے..... تب بھی ہمیں بتائیے..... ہم آپ کیلئے کسی قابل ترین جھاڑ پھونک کرنے والے کا انتظام کر دیں گے.....!

رسول اللہ ﷺ نے دورانِ گفتگو کسی موقع پر اسے روک ٹوک نہیں کی..... اس کی بات کو کاٹا نہیں..... بلکہ نہایت تحمل اور توجہ سے اس کی پوری گفتگو سنی، جب وہ اپنی بات مکمل کر چکا تب آپ نے اس سے دریافت فرمایا: ”کیا تم اپنی بات کہہ چکے؟“ اس نے جواب دیا: ”ہاں“، تب آپ یوں گویا ہوئے:

”نہ میں مال و دولت جمع کرنا چاہتا ہوں، نہ سرداری اور بادشاہت کی تمنا ہے، نہ میں بیمار ہوں اور نہ آسیب زدہ..... جس قدر باتیں تم نے کہی ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی مجھ میں نہیں ہے..... مجھ کو تو بس اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے، اپنی کتاب مجھ پر نازل فرمائی ہے، اور مجھے یہ حکم دیا ہے کہ میں تمہیں اس کے عذاب سے ڈراؤں۔“

اور پھر آپ ﷺ نے اس کے سامنے سورہ السجدہ کی تلاوت شروع کی..... ﴿حَمْدٌ تَنْزِيلٌ مِّنَ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ، كِتَابٌ فُصِّلَتْ آيَاتُهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ، بَشِيرًا وَنَذِيرًا فَأَعْرَضَ أَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ.....﴾ آپ یہ

سورت پڑھتے گئے..... اور عتبہ انتہائی انہماک کے ساتھ..... حیران و پریشان اور مبہوت ہو کر اللہ کا کلام سنتا رہا..... آپ کی طرف ٹکلی باندھے دیکھتا رہا..... اور قرآن کی حلاوت اس کے رگ و پے میں اترتی چلی گئی..... آخر آپ ﷺ جب اس آیت پر پہنچے:

﴿فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَ ثَمُودَ.....﴾

یعنی: ”اگر اب بھی یہ روگردانی کریں تو کہہ دیجئے کہ میں تمہیں ڈراتا ہوں اس کڑک سے جو عاد اور ثمود کی کڑک جیسی ہوگی“ (۱)

یہ آیت سن کر عتبہ کے ہوش و حواس جواب دینے لگے..... اور بے ساختہ اس نے اٹھ کر آپ کے ہونٹوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے..... اور یوں التجاء کرنے لگا:

”بس کرو..... بھتیجے..... میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر کہتا ہوں..... میں تمہیں قرابت داری کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ..... اب بس کرو.....“

اس کے بعد وہ سر جھکائے ہوئے بوجھل قدموں کے ساتھ وہاں سے چل دیا، اور اس کے ساتھی سردارانِ قریش جو اس کی آمد کے منتظر تھے..... جنہوں نے اسے بھیجا تھا..... وہ اس کا یہ بدلا ہوا انداز دیکھ کر پریشان ہو گئے اور کہنے لگے کہ ”لو..... یہ تو..... بدل گیا.....“

اور پھر عتبہ نے ان کے قریب پہنچ کر انہیں کہا کہ: ”اس شخص (یعنی محمد ﷺ) کو اس کے حال پر چھوڑ دو..... بس..... اسی میں ہم سب کیلئے بہتری ہے“۔ (۲)

☆..... اسی طرح ایک بار سردارانِ قریش نے ”کچھ لو، کچھ دو“ کا اصول اپناتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کو یہ پیشکش کی کہ ”آپ ہمارے معبودوں کی مخالفت چھوڑ دیجئے، ہم آپ

(۱) یعنی ایسی خوفناک کڑک ہوگی کہ جیسی کڑک سے قوم عاد اور قوم ثمود کو ہلاک کیا گیا تھا۔

(۲) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر، سورہ حم السجدہ، نیز دیگر کتب تفسیر وحدیث و تاریخ۔

کے دین کی مخالفت چھوڑ دیتے ہیں، نیز یہ کہ ایک سال آپ ہمارا دین اختیار کر لیا کریں، اور پھر ایک سال ہم آپ کا دین اختیار کر لیا کریں گے، یوں مل جل کر رہ لیتے ہیں“ ان کی اس لغو و بیہودہ پیشکش کے جواب میں ”سورۃ الکافرون“ نازل ہوئی جس میں یہ وضاحت و صراحت کر دی گئی کہ ایسا ممکن نہیں.....!!

☆..... اسی طرح ایک بار سردارانِ قریش عمارہ بن مغیرہ نامی ایک نہایت خوب رو نو جوان کو لئے ہوئے آپ ﷺ کے سر پرست اور چچا یعنی ابوطالب کے پاس پہنچے اور انتہائی احقانہ قسم کی پیشکش کرتے ہوئے کہا: ”اے ابوطالب! آپ اس خوب رو نو جوان کو اپنا فرزند بنا لیجئے..... اور اپنے بھتیجے محمد کو ہمارے حوالے کر دیجئے“

اس پر ابوطالب نے جواب دیا: ”واہ..... کیا خوب مشورہ ہے..... کہ میں اپنے فرزند کو تو تمہارے حوالے کر دوں..... تاکہ تم اسے ہلاک کر ڈالو..... اور تمہارے لڑکے کی پرورش میں اپنے ذمے لے لوں؟“

ابوطالب کی زبانی یہ جواب سن کر وہ لوگ کھسیانے ہو کر وہاں سے چلتے بنے۔ یوں جب ان کی تمام تر عیاریاں بے کار و بے سود ثابت ہوئیں..... تو آخر وہ جھنجھلا اٹھے..... اور تنگ آ کر ایک روز وہ باقاعدہ وفد کی شکل میں ابوطالب کے پاس پہنچے، جب سخت گرمی پڑ رہی تھی جھلسا دینے والی لو کے جھکڑ چل رہے تھے، سورج سروں پر آگ برسا رہا تھا، گرمی کی شدت کی وجہ سے ہر کوئی اپنے گھر میں دبکا بیٹھا ہوا تھا..... ایسے میں یہ لوگ خلاف معمول، اچانک اور بے وقت ابوطالب کے پاس جا پہنچے، مزید یہ کہ ان کے تیور بھی کافی بدلے ہوئے تھے..... انداز..... اور لب و لہجہ بھی بدلا ہوا تھا.....

یہ سب کچھ دیکھتے ہی ابوطالب نے معاملے کی نزاکت کو فوراً ہی بھانپ لیا، اور ان سے یوں

اچانک اور بے وقت آمد کی وجہ دریافت کی۔

جس پر انہوں نے کہا کہ: ”اے ابوطالب! ہمارے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا ہے..... ہم اپنے بتوں اور بزرگوں کے خلاف اس طرح اس نئے دین کی نشر و اشاعت کو کسی صورت گوارا نہیں کر سکتے..... اب یا آپ اپنے بھتیجے کو لگام دے دیجئے..... ورنہ ہم نے ٹھان لی ہے کہ..... ہم دونوں فریقوں میں سے کوئی ایک ضرور ہلاک ہو جائے گا۔“

اس دھمکی نے ابوطالب کو پریشان کر دیا، کیونکہ انہیں اس بات کا خوب احساس و ادراک تھا کہ قریش اپنی بات کے خوب پکے ہوتے ہیں، جو ٹھان لیتے ہیں وہ ضرور کر گزرتے ہیں.....!

لہذا ابوطالب نے آپ ﷺ کو بلوایا، آپ سوچ میں پڑ گئے کہ اتنی تپتی ہوئی دوپہر میں چچا نے بلوایا ہے..... نہ جانے کیا معاملہ ہے.....؟ آپ چچا کے پاس پہنچے تو انہوں نے اپنے لاڈلے بھتیجے کو مخاطب کرتے ہوئے بڑے ہی درد انگیز لہجے میں کہا: ”بھتیجے! میرے کندھوں پر اتنا بوجھ نہ ڈالو..... جسے میں برداشت نہ کر سکوں“

اپنے مشفق و مہربان چچا کی زبانی یہ بات سن کر آپ کو یہ خیال گذر کہ شاید اب میرے چچا میری مدد و حمایت سے دستبردار ہونا چاہتے ہیں.....

یہ سوچ کر آپ نے جواب دیا: ”اے میرے چچا! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی لا کر رکھ دیں..... تب بھی میں اس کام کو نہیں چھوڑ سکتا..... یہاں تک کہ اللہ خود اس کام کو پورا کر دے..... یا میں خود اس کوشش میں ہلاک ہو جاؤں.....“

آخری جملہ کہتے کہتے آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اور آپ وہاں سے اٹھ کر جانے لگے، ابھی آپ وہاں سے چلے ہی تھے کہ..... لاڈلے بھتیجے کا یہ حال ابوطالب سے دیکھا نہ گیا،

بھیجے کی آنکھوں میں آنسو..... ابوطالب کے دل پر تو بس چھریاں ہی چل گئیں..... اور بے اختیار پکار اٹھے..... ”بھیجے! یہاں آؤ..... میرے پاس.....“ چچا کی اس پکار پر آپ ﷺ کے بڑھتے ہوئے قدم اسی جگہ رک گئے، اور آپ واپس پلٹے، چچا کے پاس پہنچے تو انہوں نے شفقت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا: ”بھیجے! جو جی میں آئے کرو..... میں تمہارا ساتھ ہرگز نہ چھوڑوں گا۔“

مقاطعہ (سوشل بائیکاٹ):

آخر جب نہ ترغیب سے کام بنا اور نہ ہی ترہیب کسی کام آئی، نہ لالچ نے کوئی اثر دکھایا اور نہ ہی دھمکی سے کوئی فائدہ ہوا..... تو مشرکین مکہ نے انتہائی سنگدلی و سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے خاندان سے مکمل طور پر معاشرتی مقاطعہ کر لیا جائے، یعنی پورے شہر مکہ میں کوئی ان کے ساتھ سماجی یا تجارتی، یا اور کسی بھی قسم کا کوئی تعلق نہ رکھے، اور اس ظالمانہ مقاطعہ کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں نے آباؤ اجداد کے دین سے غداری کی ہے۔

یہ مقاطعہ تین سال مسلسل جاری رہا، اس تمام عرصے میں آپ اپنے خاندان سمیت شعب ابی طالب میں محصور رہے، یہ دور مسلمانوں پر بہت سخت گذرا، اس دوران انہوں نے بڑی تکلیفیں اٹھائیں، ایسی نوبت بھی آئی کہ بھوک مٹانے کیلئے وہ درختوں کے خشک پتے کھاتے رہے..... اور خشک چمڑے کا ٹکڑا پانی میں بھگو کر باری باری سب چوستے رہے..... ان کے معصوم بچے بھوک اور پیاس کی شدت سے روتے اور بلکتے رہے.....!!

اسی کیفیت میں مکمل تین سال گذر گئے..... آخر..... نبوت کے دسویں سال کے آغاز میں ماہ محرم میں اشارۃ الہی سے دیمک اس صحیفے کو کھا گئی جس پر یہ معاہدہ تحریر تھا، تب قریش میں

سے ہی ایک شخص مطعم بن عدی نے اس صحیفے کے باقی ماندہ حصے کو بھی پھاڑ کر پھینک دیا.....
اور یوں اس ظالمانہ مقاطعے کا اختتام ہو گیا۔

عام الحزن (غم کا سال):

نبوت کے دسویں سال رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے اہل خاندان کو شعب ابی طالب سے نکلے ہوئے ابھی بمشکل چند ماہ ہی گزرے تھے کہ آپؐ کے سرپرست اور مشفق و مہربان چچا ابوطالب کا انتقال ہو گیا، یقیناً آپؐ کیلئے یہ بہت بڑا صدمہ تھا (۱)
اور پھر اس کے کچھ عرصے بعد ہی آپؐ کی زوجہ مطہرہ ام المؤمنین حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا بھی داغِ مفارقت دے گئیں۔

پے درپے یہ دونوں صدمے آپؐ کیلئے انتہائی رنج و الم کا باعث بنے، گھر سے باہر مخالفین و مفسدین کے مقابلے میں ہمیشہ مضبوط چٹان کی مانند ڈٹے رہنے والے مشفق و مہربان چچا اب اس دنیا میں نہیں رہے..... گھر کے اندر ہمیشہ تسلی دینے والی رفیقہ حیات یعنی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بھی نہیں رہیں..... جو کہ گذشتہ پچیس سال سے مسلسل آپؐ کیلئے خلوص و وفاء کا پیکر بنی ہوئی تھیں..... اور جو آپؐ کے بچوں کی والدہ بھی تھیں..... (۲)

لہذا اب آپؐ کا نہ گھر سے باہر دل لگتا تھا..... اور نہ ہی گھر کے اندر.....!

نیز یہ کہ ابوطالب کی وفات کے بعد کفار و مشرکین کے حوصلے بھی خوب بڑھ گئے، کیونکہ آپؐ

(۱) ایک تو چچا کی وفات کا صدمہ..... چچا بھی ایسے کہ جو زندگی بھر پشت پناہی و ہمدردی کرتے رہے.....
اور پھر مزید صدمہ اس لئے کہ چچا کی وفات اپنے آبائی دین یعنی ”شُرک“ پر ہوئی۔

(۲) سوائے ابراہیم کے جن کی ولادت بہت بعد میں مدینہ میں حضرت ماریہ قبطیہؓ سے ہوئی اور پھر تقریباً ڈیڑھ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔

کے معاملے میں انہیں پورے شہر مکہ میں بس ابوطالب ہی کا لحاظ تھا..... اب یہ چیز بھی ختم ہوگئی..... لہذا اب آپ کی مشکلات میں بھی بہت زیادہ اضافہ ہو گیا.....!

یہی وہ مشکل ترین حالات تھے جن کی وجہ سے آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے اس دور کو تاریخ میں ”عام الحزن“ یعنی ”غم کا سال“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

مکی زندگی کا تیسرا دور:

مکہ سے باہر دعوت و تبلیغ اور سفر طائف:

مشرکین مکہ کی طرف سے مسلسل بدسلوکی، اور ایذا رسانی کے اس لامتناہی سلسلے سے تنگ آکر آخر نبوت کے دسویں سال ماہ شوال میں رسول اللہ ﷺ نے شہر طائف کا رخ کرنے اور وہاں کے باشندوں کو پیغامِ حق پہنچانے کا فیصلہ فرمایا، طائف مکہ مکرمہ سے تقریباً ساٹھ میل (سولو میٹر) کے فاصلے پر واقع پہاڑی علاقہ ہے، جہاں بلند و بالا پہاڑ بکثرت پائے جاتے ہیں، راستہ انتہائی مشکل، خطرناک اور دشوار گزار ہے، آپؐ نے یہ طویل مسافت پیدل اپنے قدموں پر چل کر طے کی، راستے میں متعدد قبائل کے مساکن سے گزر ہوا، آپؐ نے ان سبھی کو دین اسلام کی دعوت دی، لیکن ان میں سے کسی نے بھی اس پیغامِ حق کو قبول نہ کیا۔

آخر یہ دشوار گزار اور انتہائی خطرناک پہاڑی راستہ پیدل طے کرتے ہوئے آپؐ طائف شہر جا پہنچے، جو اس وقت مشہور قبائل ہوازن، نیز بنو ثقیف کا مسکن تھا، وہاں آپؐ نے مسلسل دس روز قیام فرمایا، اس دوران آپؐ نے پہلے ان کے سرکردہ افراد کو اور پھر ان سے مایوس ہو جانے کے بعد ہر خاص و عام کو اللہ کے دین کی طرف دعوت دی..... مگر ان بد بختوں نے

آپؐ کی اس دعوت کو قبول کرنے کی بجائے حد درجہ بے مروتی اور سنگدلی کا مظاہرہ کیا، نیز آپؐ کی شان میں گستاخی اور بدسلوکی کی انتہاء کر دی..... شہر کے آوارہ اور اوباش قسم کے نوجوانوں کو پیچھے لگا دیا..... جو مسلسل آپؐ کا تعاقب کرتے رہے..... آپؐ پر آوازے کستے رہے..... بیہودہ گوئی کرتے رہے..... اسی پر بس نہیں..... بلکہ مسلسل پتھر برساتے رہے، یہاں تک کہ آپؐ کے پاؤں مبارک لہو لہان ہو گئے اور جوتے خون سے بھر گئے..... اس حالت میں آپؐ نے وہاں سے مکہ کی جانب واپسی کا سفر شروع کیا، تقریباً تین میل کی مسافت طے کرنے کے بعد آپؐ جب ایک باغ میں سے گزر رہے تھے تو وہاں کچھ سستانے کی غرض سے انگوڑی بیل کے نیچے سائے میں آپؐ نے توقف فرمایا..... عجب بیچارگی تھی..... اس قدر طویل سفر کی مشقت..... اور پھر یہ کہ کوئی اپنی ذاتی غرض نہیں تھی..... بلکہ محض اللہ کا پیغام پہنچانا مقصود تھا..... مگر..... انجام کیا ہوا.....؟ یہی سب کچھ سوچ کر آپؐ اُس وقت انتہائی صدمے کی کیفیت میں تھے..... بے بسی و بیچارگی کی انتہاء ہو گئی تھی..... اسی کسمپرسی و بیچارگی کی کیفیت میں آپؐ اپنے خالق و مالک سے لولگائے ہوئے اس کے سامنے آہ و فریاد اور الحاح و زاری میں مشغول ہو گئے..... اور تب آپؐ کے دل سے وہ آنکلی جس نے زبان تک پہنچتے پہنچتے عجیب و غریب کلمات کا روپ دھار لیا..... ایک ایسی دعاء آپؐ کی زبان پر جاری ہو گئی جس کا ایک ایک کلمہ اپنے اندر ایک سمندر سمیٹے ہوئے ہے..... جس کے ایک ایک لفظ میں عجب تاثر ہے، کسی اور موقع پر آپ ﷺ سے ایسی عجیب و غریب دعاء منقول نہیں ہے.....:

اَللّٰهُمَّ اِلَيْكَ اَشْكُو ضَعْفَ قُوَّتِيْ وَ قِلَّةَ حِيَلَتِيْ وَ هَوَانِيْ عَلٰى النَّاسِ، اَنْتَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ وَ اَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعِفِيْنَ، وَ اَنْتَ رَبِّيْ، اِلٰى مَنْ تَكْلِفُنِيْ؟

إِلَىٰ بَعِيدٍ يَتَجَهَّزُنِي؟ أَوْ إِلَىٰ عَدُوِّ مَلَكَتِهِ أَمْرِي؟ إِنْ لَمْ يَكُنْ بِكَ غَضَبٌ عَلَيَّ فَلَا أُبَالِي، غَيْرَ أَنَّ عَافِيَتَكَ هِيَ أَوْسَعُ لِي، أَعُوذُ بِنُورِ وَجْهِكَ الَّذِي أَشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمَاتُ، وَصَلَحَ عَلَيْهِ أَمْرُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، مِنْ أَنْ يَحِلَّ عَلَيَّ غَضَبُكَ، أَوْ يَنْزِلَ بِي سَخَطُكَ، لَكَ الْعُتْبَىٰ حَتَّىٰ تَرْضَىٰ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِكَ. (۱) (۲)

ترجمہ: ”اے اللہ! میں تجھی سے شکایت کرتا ہوں اپنی قوت کے ضعف اور کمی کی، اور اپنی تدبیر کی ناکامی کی، اور لوگوں کی نظروں میں اپنی خفت و بے توقیری کی، اور تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے، اور تو ہی کمزوروں کی پرورش کرنے والا ہے، تو ہی میرا رب ہے، پھر تو مجھے کس کے سپرد کر رہا ہے؟ کسی غیر آدمی کے جو مجھ سے درشتی سے پیش آئے؟ یا کسی دشمن کے جو میرے ساتھ جو چاہے کرے؟ اگر تو مجھ سے ناراض نہ ہو..... تو پھر مجھے ان سب چیزوں کی کوئی فکر نہیں، ہاں البتہ تیری دی ہوئی عافیت میرے لئے زیادہ بہتر ہے، میں تیرے مبارک نور کی پناہ طلب کرتا ہوں کہ جس سے تمام اندھیرے روشن ہو جاتے ہیں، اور جس کی بناء پر دنیا و آخرت کے تمام کام درست ہو جاتے ہیں اس بات سے کہ مجھ پر تیرا غضب نازل ہو، یا تیری ناراضگی مجھے آگھیرے، میرا کام بس یہی ہے کہ تجھے راضی کرنے اور منانے میں ہی لگا رہوں جب تک کہ تو راضی نہ ہو جائے..... اور نہیں

(۱) الطبرانی فی الدعاء [۳۱۵/۱] السیرۃ النبویۃ لابن ہشام [۲۶۸/۲]

(۲) بعد میں کسی موقع پر جب ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ سے دریافت کیا تھا کہ یا رسول اللہ کیا آپ کی زندگی میں اُحد کے دن سے بھی زیادہ مشکل کوئی دن گزرا ہے؟ اس پر آپ نے جواب دیا تھا کہ ہاں میری زندگی کا سب سے مشکل ترین دن ”عقبہ“ کا دن تھا..... ملاحظہ ہو حدیث: کان أشد ما لقیته منہم یوم عقبہ..... (متفق علیہ) اس حدیث میں ”عقبہ“ سے مراد طائف کی پہاڑی گھاٹیاں ہیں۔

ہے کوئی سہارا اور نہ ہی کوئی وسیلہ سوائے تیرے۔

یہ باغ دراصل ربیعہ کے بیٹوں عتبہ اور شیبہ کی ملکیت تھا، اس وقت وہ دونوں کچھ فاصلے پر وہاں موجود تھے اور مسلسل رسول اللہ ﷺ کی نقل و حرکت کا مشاہدہ کر رہے تھے، آپؐ کی یہ حالت دیکھ کر..... اور پھر آپؐ کی اس عجیب و غریب دعاء کے یہ دل سوز کلمات سننے کے بعد..... ان کے دل میں کچھ رحم کے جذبات بیدار ہونے لگے، تب انہوں نے انگوروں کا ایک گچھا اپنے خادم کو دیتے ہوئے کہا کہ یہ انگور اس شخص (یعنی رسول اللہ ﷺ) کو دے آؤ، اس خادم کا نام عداؓ تھا، جو کہ نصرانی تھا اور اللہ کے نبی حضرت یونس علیہ السلام کے شہر ”نینوی“ کا باشندہ تھا، چنانچہ وہ انگوروں کا گچھا لئے ہوئے آپؐ کے قریب پہنچا اور انگور پیش کئے، آپؐ نے انگوروں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے ”بسم اللہ“ کہا، جس پر وہ خادم انتہائی حیران ہوا، اور کہنے لگا کہ یہاں کے باشندے تو یہ الفاظ (یعنی بسم اللہ) نہیں کہتے.....؟ اس پر آپؐ نے اس سے دریافت فرمایا کہ ”تم کہاں کے رہنے والے ہو؟“ اس نے جواب دیا ”میں نینوی کا رہنے والا ہوں“ آپؐ نے فرمایا ”اس کا مطلب ہے تم یونس بن متی کے علاقے سے تعلق رکھتے ہو“ اس پر وہ مزید حیران ہوا، اور کہنے لگا ”آپؐ کو یونس بن متی کے بارے میں علم کیسے ہوا؟“ آپؐ نے فرمایا ”یونس میرے بھائی تھے، میری ہی طرح وہ بھی اللہ کے نبی تھے“، آپؐ کی زبانی یہ بات سن کر عداؓ نے دیوانہ وار آپؐ کے ہاتھ پاؤں چومنا شروع کر دیئے..... اُدھر اس کے دونوں آقا عتبہ و شیبہ یہ منظر دیکھ کر آپس میں کہنے لگے ”لو..... یہ تو اب گیا کام سے۔“

اور جب عداؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس سے واپس اپنے ان آقاؤں کے قریب پہنچا تو انہوں نے اس سے پوچھا کہ ”تم یہ کیا کر رہے تھے؟ اس شخص کے ہاتھ پاؤں کیوں اس

طرح چوم رہے تھے؟“ عدّ اس نے جواب دیا: ”اس وقت تمام روئے زمین پر ان سے بہتر کوئی اور شخص نہیں ہے..... انہوں نے مجھے ایک ایسی بات بتائی ہے جو کہ صرف اللہ کا کوئی نبی ہی بتا سکتا ہے“۔ اپنے غلام کی زبانی یہ بات سن کر ان دونوں نے اسے جھڑک دیا..... اور پھر قدرے توقف کے بعد اسے مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگے ”تمہارا دین اس شخص کے دین سے بہتر ہے..... تم کہیں اس کی باتوں میں آکر اپنا دین نہ چھوڑ بیٹھنا“۔

اُس باغ میں اس مختصر سی راحت کے بعد آپ ﷺ وہاں سے آگے سوئے منزل یعنی مکہ مکرمہ کی جانب روانہ ہو گئے، راستے میں قرن الثعالب نامی مقام پر (۱) جب آپ پہنچے تو وہاں جبریل امین علیہ السلام نازل ہوئے اور فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ قَدْ سَمِعَ قَوْلَ قَوْمِكَ لَكَ وَمَا رَدُّوْا عَلَیْكَ یعنی ”اللہ تعالیٰ نے آپ کی قوم کا رویہ دیکھ لیا ہے اور آپ کی باتوں کا جو کچھ انہوں نے جواب دیا ہے وہ بھی سن لیا ہے“۔

اور پھر مزید فرمایا: وَقَدْ بَعَثَ اللّٰهُ اِلَیْكَ مَلَكَ الْجِبَالِ لِتَاْمُرَهُ بِمَا شِئْتَ فِیْهِمْ یعنی ”اللہ نے میرے ہمراہ آپ کیلئے پہاڑوں کے فرشتے کو بھی بھیجا ہے تاکہ ان اہل طائف کے بارے میں آپ اسے جو چاہیں حکم دیں“۔

تب ملک الجبال یعنی پہاڑوں کے فرشتے نے خود آگے بڑھ کر سلام کیا اور کہا: اِنْ شِئْتَ اَنْ اُطْبِقَ عَلَیْهِمُ الْاَخْشَبَیْنَ لَفَعَلْتُ یعنی ”اگر آپ حکم دیں تو میں ابھی ان دونوں پہاڑوں کو آپس میں ملا دوں“ (تاکہ یہ اہل طائف دونوں پہاڑوں کے درمیان کچلے جائیں اور یوں ان کا خاتمہ ہو جائے)

(۱) یہ مقام طائف سے مکہ جاتے وقت راستے میں آتا ہے اور آجکل ”قرن المنازل“ کے نام سے معروف ہے، ریاض، دام، نیز خلیج ممالک سے حج و عمرہ کیلئے زمینی راستے سے مکہ مکرمہ جانے والوں کیلئے ”مقیات“ یہی مقام ہے۔

لیکن اس موقع پر پہاڑوں کے فرشتے کی طرف سے اس پیش کش کے جواب میں نبی رحمت ﷺ کی زبان مبارک سے اپنے ان بدترین دشمنوں اور بدخواہوں کیلئے جو الفاظ نکلے.....
عفو و درگزر کے باب میں انسانی تاریخ شاید کوئی ایسی مثال کبھی پیش نہیں کر سکے گی.....

آپؐ نے اس فرشتے کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے ان دشمنوں کے بارے میں فرمایا: بَلْ أَرْجُو أَنْ يُخْرِجَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ مِنْ أَصْلَابِهِمْ مَنْ يَعْبُدُ اللَّهَ وَحْدَهُ لَا يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا یعنی ”انہیں ہلاک نہ کرو، کیونکہ مجھے اللہ سے امید ہے کہ وہ ان کی آئندہ نسلوں میں ایسے لوگ پیدا فرمائے گا جو صرف اللہ کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔“ (۱)۔ (۲)

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مکہ کی جانب اپنا سفر جاری رکھا، جب آپؐ ”وادی نخلہ“
(۱) صحیح بخاری [۳۲۳۱] کتاب بدء الخلق، باب: اذا قال أحدكم آمین..... نیز صحیح مسلم، باب ما قال النبی ﷺ من
أذی للمشرکین والمنافقین۔

(۲) پہاڑوں کے فرشتے کی طرف سے ان اہل طائف کو دونوں پہاڑوں کے درمیان یوں کچل کر ہلاک کر ڈالنے کی اس پیش کش کے جواب میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے یہ جواب ”رحمت و ہمدردی“ کے باب میں اگرچہ رہتی دنیا تک تمام دنیائے انسانیت کیلئے ایک روشن مثال ہے..... لیکن ہم برصغیر اور خصوصاً پاکستان سے تعلق رکھنے والوں کو اس موقع پر بطور خاص اس اہم ترین تاریخی حقیقت کا استحضار بھی کرنا چاہئے کہ برصغیر میں سب سے پہلے دین اسلام کی شمع لے کر جو کم سن سپہ سالار پہنچا..... وہ عظیم فاتح جس نے صرف سترہ برس کی عمر میں سندھ فتح کیا..... یعنی محمد بن قاسم الثقفی رحمہ اللہ..... اس کا تعلق بنو ثقیف سے تھا، اور اہل طائف سب ثقفی ہی تھے۔ اگرچہ بعد میں بعض انتظامی امور کے پیش نظر محمد بن قاسم کے والد نیز چچا (حجاج بن یوسف ثقفی) و دیگر متعدد اہل خاندان طائف سے بصرہ (عراق) منتقل ہو گئے تھے اور پھر فتح سندھ کے موقع پر محمد بن قاسم نے مکران، بلوچستان، سندھ اور ملتان کی جانب پیش قدمی کا سلسلہ بصرہ سے ہی شروع کیا تھا..... لیکن اصل میں تو اس کا وطن طائف تھا، لہذا اگر اہل طائف ہلاک کر دیئے جاتے تو محمد بن قاسم بھی اس دنیا میں نہ آتا..... واللہ فی خلقہ شیون۔

نامی مقام پر تھے، اتفاقاً اسی وقت وہاں سے ”جنوں“ کی ایک جماعت کا گزر ہوا، اس وقت آپ ﷺ تلاوتِ قرآن میں مشغول تھے، جنوں نے آپ ﷺ سے قرآن سنا تو اسی جگہ رک گئے اور دیر تک قرآن سنتے رہے..... اور پھر اسلام بھی قبول کیا..... سورۃ الجن کی ابتدائی آیات نیز سورۃ احقاف کی آیات ۲۹ تا ۳۱ میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ (۱)

اور پھر نبوت کے دسویں سال ماہ ذوالقعدہ میں آپ ﷺ واپس مکہ پہنچ گئے، جہاں موسم حج کے آغاز کے ساتھ ہی حج کی غرض سے دو دراز کے علاقوں سے آنے والے مختلف قبائل نیز متعدد شخصیات کو آپ ﷺ نے دین اسلام کی طرف دعوت دی، جس پر ان کی طرف سے ملا جلا ردِ عمل سامنے آیا.....!!



(۱) قل أوحى الیّ أنه استمع نفر من الجنّ فقالوا انا سمعنا قرآناً عجبا..... (الجن: ۱)
واذ صرنا لیک نفراً من الجنّ يستمعون القرآن..... (الأحقاف: ۲۹-۳۱)

اسراء و معراج:

نبوت کے بارہویں سال ماہِ رجب میں وہ انتہائی عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جو کہ ”اسراء و معراج“ کے نام سے معروف ہے، اور جو کہ درحقیقت خالق کائنات کی طرف سے اپنے حبیب ﷺ کیلئے ایک ایسا اعزاز اور شرف تھا کہ جو تمام انبیائے کرام علیہم السلام کی مقدس و برگزیدہ ترین جماعت میں سے صرف آپ ہی کو عطا کیا گیا..... کسی اور نبی کے حصے میں یہ سعادت نہ آسکی۔

یہ واقعہ اپنی ابتداء سے انتہاء تک عجیب و غریب اور انتہائی محیر العقول قسم کی باتوں پر مشتمل ہے، جس کا مختصر تذکرہ کچھ اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ کے حکم سے بیت المقدس اور پھر ملاً اعلیٰ یعنی آسمانوں کی سیر کرائی گئی، جہاں آپ نے بہت کچھ دیکھا، جنت اور وہاں کی نعمتوں کا، نیز جہنم اور وہاں کے عذاب کا مشاہدہ کیا، مختلف آسمانوں پر مختلف انبیائے کرام علیہم السلام سے ملاقات بھی ہوئی، یہ تمام تر مسافت رات کے ایک مختصر حصے میں طے کر لی گئی اور آپ راتوں رات واپس مکہ مکرمہ بھی پہنچ گئے..... بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے.....!!

یہ سفر و حصوں پر مشتمل تھا، پہلا حصہ زمینی سفر، یعنی مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک کا سفر، جس کا تذکرہ سورۃ الاسراء/ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں ہے (۱) سفر کے اس حصے کو ”اسراء“ کہا جاتا ہے، یہ سفر ”براق“ نامی جانور پر سوار ہو کر طے کیا گیا، جس کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ جہاں نگاہ پہنچتی تھی وہاں اس کے قدم پہنچتے تھے۔

(۱) سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى.....

اس کے بعد آپ ﷺ کو جبریل امین کی معیت میں بیت المقدس سے آسمانوں تک لے جایا گیا، سفر کے اس حصے کو ”معراج“ کہا جاتا ہے، اس کا تذکرہ سورۃ النجم کی ابتدائی آیات میں ہے (۱)

اس موقع پر آپ ﷺ کو تمام آسمانوں سے گذارنے کے بعد آخر ”سدرۃ المنتہی“ تک، اور پھر اس سے بھی آگے لے جا کر قرب الہی اور شرف ہمکلامی سے نوازا گیا، اور تب اسی موقع پر نماز کا تحفہ دیا گیا، جس سے نماز کی فضیلت و اہمیت ثابت ہوتی ہے، کیونکہ باقی تمام عبادات کی فرضیت تو زمین پر ہوئی، جبکہ نماز کی فرضیت معراج کے موقع پر آسمانوں پر ہوئی، نیز یہ کہ باقی تمام عبادات کی فرضیت بذریعہ وحی فرشتے کے توسط سے ہوئی، جبکہ نماز کی فرضیت براہ راست ہوئی۔ (۲)

اس یادگار سفر معراج کے موقع پر آپ ﷺ نے جنت اور جہنم کے مختلف مناظر کا مشاہدہ بھی کیا، مثلاً:

☆..... بہت سے ایسے لوگوں کو دیکھا جو اپنے بہت موٹے پیٹ کی وجہ سے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتے تھے، ان کی یہ حالت دیکھ کر آپ ﷺ نے جبریل امین سے دریافت فرمایا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ جبریل نے جواب دیا کہ یہ ”سودخور“ ہیں۔

☆..... یتیموں کا مال کھانے والوں کو اس حال میں دیکھا کہ وہ اپنے منہ میں آگ بھر رہے

(۱) وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ ، مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ

(۲) یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تسلی کیلئے معراج کا اور آسمانوں پر بلا کر مہمان نوازی کا انتظام کیا گیا..... اسی موقع پر آپ ﷺ کی امت کیلئے نماز کا تحفہ عطاء کیا گیا..... اس کا مطلب یہ ہوا کہ ”نماز“ مومن کی معراج، نیز اللہ سے ملاقات و مناجات ہے، نماز میں بندے کیلئے اللہ کی طرف سے تسلی و اطمینان کا سامان ہے، اور بے چین دل کیلئے سکون کا انتظام ہے۔

ہیں۔ (۱)

☆..... زانیوں کو اس حالت میں دیکھا کہ وہ پاکیزہ اور تازہ گوشت چھوڑ کر سر اہوا متعفن اور بدبودار گوشت کھا رہے ہیں۔

☆..... غیبت اور چغلی کرنے والوں کو دیکھا کہ ان کے لمبے لمبے پیتل اور تانبے کے ناخن ہیں، جن سے وہ اپنے چہروں اور سینوں کو مسلسل بری طرح نوچ رہے ہیں۔

☆..... مشرکین مکہ کا ردِ عمل:

رسول اللہ ﷺ راتوں رات جب اللہ کی قدرت سے بیت المقدس اور پھر آسمانوں کے اس سفر کے بعد واپس مکہ مکرمہ پہنچے اور مکہ والوں کو اس سفر کے بارے میں مطلع فرمایا تو اہل ایمان نے تصدیق کی، اور اسی نسبت سے خاص طور پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہمیشہ کیلئے تاریخ میں ”صدیق“ کے لقب سے معروف ہو گئے۔ (۲)

جبکہ مشرکین مکہ نے آپ کی زبانی اس سفر کی روداد سننے کے بعد آپ کا بری طرح مذاق اڑایا، تماشا بنایا، اور تمسخر و استہزاء کا بازار گرم کر دیا..... اور پھر بالآخر غرور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ کیوں نہ محمد (ﷺ) کی سچائی جاننے کی غرض سے ان کا امتحان لیا جائے..... آپ کو اس سے قبل کبھی بیت المقدس یا مسجد اقصیٰ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، جبکہ خود مشرکین مکہ میں بکثرت ایسے لوگ موجود تھے جن کی بسلسلہ تجارت ملک شام اور بیت المقدس کی طرف آمد و رفت رہتی تھی اور وہ بار بار مسجد اقصیٰ کا نظارہ بھی کر چکے تھے، لہذا باہم

(۱) جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ سَعِيرًا (النساء: ۱۰) ترجمہ: ”وہ لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں بیشک وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھڑ رہے ہیں، اور غریب وہ خود بھی آگ ہی میں جا پہنچیں گے۔“ یعنی اس آیت کی عملی تفسیر کا رسول اللہ ﷺ کو مشاہدہ کر دیا گیا۔ (۲) مصنف عبدالرزاق [۳۲۸/۵]

مشاورت کے بعد انہوں نے آپؐ سے مخاطب ہوتے ہوئے یہ تقاضا کیا: صِفْ لَنَا الْمَسْجِدَ یعنی مسجد اقصیٰ کے بارے میں ہمیں کچھ بتائیے..... جس پر آپؐ انہیں مسجد اقصیٰ کے بارے میں بتاتے رہے، ان کے سوالات کے جوابات دیتے رہے..... مگر بعض سوالات انہوں نے ایسے کئے جن کے جواب میں آپؐ کو کچھ تردد ہونے لگا، کیونکہ ظاہر ہے کہ آپؐ نے بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ میں اپنے اس مختصر ترین قیام کے دوران وہاں کی ہر چیز کا بغور مشاہدہ تو نہیں کیا تھا..... مزید یہ کہ یہ بات تو آپؐ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ اس بارے میں مشرکین مکہ کے ساتھ سوال و جواب کی نوبت آئے گی۔

چنانچہ اب ان کے مسلسل سوالات کے نتیجے میں آپؐ کو جب کچھ تردد ہونے لگا..... تو اللہ کی قدرت سے بطور معجزہ کیفیت یہ ہو گئی کہ آپؐ کیلئے پردے ہٹا دیئے گئے اور مسافتیں سمیٹ دی گئیں، اور آپؐ کو یوں محسوس ہونے لگا گویا مسجد اقصیٰ بالکل آپؐ کی آنکھوں کے سامنے ہی موجود ہے (۱) اور تب آپؐ نہایت روانی کے ساتھ اور بلا کسی تردد کے ان کے ہر سوال کا جواب دینے لگے..... اس پر وہ لوگ آپؐس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے آپؐ کے بارے میں یوں کہنے لگے: أَمَّا النَّعْتُ فَقَدْ أَصَابَ یعنی ”مسجد اقصیٰ کی اوصاف و علامات تو بالکل درست بیان کی ہیں“۔

یوں مشرکین مکہ نے رسول اللہ ﷺ کی اس سچائی کو جان بھی لیا..... اور پھر خوب جانچ بھی لیا..... مگر اس کے باوجود اس سچائی کو قبول نہیں کیا۔

(۱) جیسا کہ حدیث کے الفاظ ہیں: فَجِئِنِي بِالْمَسْجِدِ حَتَّىٰ وَضِعَ، فَنَعْتُ الْمَسْجِدَ وَ أَنَا أَنْظُرُ إِلَيْهِ یعنی گویا کہ مسجد میرے سامنے ہی لا کر رکھ دی گئی اور میں یوں انہیں مسجد کے اوصاف و علامات بتاتا رہا گویا میں اپنی آنکھوں سے مسجد کا نظارہ کر رہا ہوں..... (النسائی فی السنن الکبریٰ: ۱۴۸/۱۰)

سفر اسراء و معراج میں حکمتیں:

☆..... رسول اللہ ﷺ کیلئے تسلی و غمخواری کا انتظام:

اس یادگار اہم ترین، نیز انتہائی محیر العقول قسم کے سفر یعنی ”اسراء و معراج“ سے قبل مسلسل کچھ عرصہ تک پے درپے ایسی مشکلات و صعوبات کا ایک سلسلہ چلتا رہا جو رسول اللہ ﷺ کیلئے حد درجہ ذہنی و جسمانی صدمات اور پریشانیوں کا سبب بنتا رہا، مثلاً آپ کے مشفق و مہربان چچا اور سرپرست ابوطالب کی وفات..... اور پھر کچھ عرصے بعد ہی آپ کی وفا شعار رفیقہ حیات ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال..... جس کے نتیجے میں کیفیت یہ ہوئی کہ نہ باہر آپ کو سکون ملتا تھا..... اور نہ ہی گھر کے اندر دل لگتا تھا۔

نیز یہ کہ ابوطالب کے بعد کفار و مشرکین کی طرف سے ایذا رسانیوں کا سلسلہ بھی مزید شدت اختیار کر گیا..... جس کے نتیجے میں آپ نے طائف کا رخ کیا، مگر وہاں اہل طائف کی طرف سے انتہائی ظلم و جفاء اور پرلے درجے کی بدسلوکی کا سامنا کرنا پڑا..... اور پھر اس کیفیت میں طائف سے مکہ واپسی پر مشرکین مکہ کی طرف سے مزید استہزاء و تمسخر اور طعن و تشنیع کا ایک لامتناہی سلسلہ چل نکلا۔

یہ ایک ہلکی سی تصویر ہے اس انتہائی تکلیف دہ اور آلام و مصائب سے بھرپور دور کی جس سے اُن دنوں آپ ﷺ کو گذرنا پڑ رہا تھا۔

ایسے میں خالق ارض و سماء کی طرف سے اپنے حبیب ﷺ کیلئے تسلی و غمخواری کا انتظام کیا گیا، ملاقات کا ایک سلسلہ ہوا، آسمانوں پر بلایا گیا، کہ اے ہمارے حبیب! اگر یہ تمام زمین آپ پر تنگ کر دی گئی تو کیا ہوا؟ ہم نے تو آپ کیلئے آسمانوں کے دروازے کھول دیئے

ہیں..... ابوطالب جیسا محسن و مددگار..... اور خدیجہ جیسی ہمدرد و فاشعار شخصیات اگر نہیں رہیں تو کیا ہوا..... ہم تو موجود ہیں آپؐ کی تسلی و غمخواری کیلئے..... طائف والوں نے آپؐ کی میزبانی و خبر گیری کی بجائے اگر آپؐ کے ساتھ بدسلوکی کی ہے..... آپؐ پر پتھر برسائے ہیں..... اور آپؐ کا دل دکھایا ہے تو کیا ہوا.....؟ ہم جو موجود ہیں آسمانوں پر ان سے بہت بہتر میزبانی کیلئے۔

لہذا اس سفرِ معراج کے ذریعے جہاں ایک جانب رسول اللہ ﷺ کو عظیم ترین شرف اور بے مثال اعزاز سے نوازا مقصود تھا..... وہیں اس کے ساتھ ساتھ خالق ارض و سماء کی جانب سے اپنے حبیب ﷺ کیلئے مسلسل دکھوں اور پریشانیوں کے بعد اب تسلی و غمخواری کا انتظام بھی مقصود تھا۔

☆..... آئندہ پیش آئیے مراحل کیلئے تیاری:

رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ اگرچہ اب تک مسلسل مشقتوں اور آزمائشوں سے بھرپور تھی، لیکن اب آئندہ عنقریب اس سے بھی بڑھ کر مزید ایسا دور آنے والا تھا جس کیلئے اللہ سبحانہ و تعالیٰ پر مزید پختہ ایمان و یقین از حد ضروری تھا، مثلاً ہجرتِ مدینہ، وہاں نئے ماحول میں نئے مسائل کا سامنا، اور پھر کفار و مشرکین کے خلاف غزوات کی ابتداء..... وغیرہ..... غرضیکہ دین اسلام کی روشنی جواب تک مکہ شہر کی چار دیواریوں تک محدود تھی، اب وقت آ گیا تھا کہ یہ روشنی مکہ شہر سے باہر نکلے اور تمام دنیا ”لا الہ الا اللہ“ کے نور سے جگمگا اٹھے..... بالفاظِ دیگر اب مشکل ترین اور فیصلہ کن مرحلہ قریب تھا..... اور ظاہر ہے کہ اس کیلئے یقیناً بہت بڑی عزیمت اور پختہ یقین ناگزیر تھا۔

جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے جب فرعون جیسے سرکش

انتہائی ظالم و جابر اور مغرور و متکبر انسان کے پاس جانے اور اسے اللہ کا پیغام پہنچانے کا حکم دیا گیا تو پہلے انہیں اللہ کی قدرت کا کچھ مشاہدہ کرایا گیا، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَا مُوسَىٰ﴾ (۱) یعنی ”اے موسیٰ آپ کے ہاتھ میں یہ کیا ہے؟“ اور پھر ان کے ہاتھ میں موجود اس لاٹھی کو زمین پر ڈالنے کا حکم دیا گیا، اور تب وہ لاٹھی بڑا لہراتا ہوا سانپ بن گئی، اور جب اللہ کے حکم سے موسیٰ علیہ السلام نے اس سانپ کو اپنے ہاتھ سے پکڑا تو اب وہ سانپ دوبارہ لاٹھی بن گیا۔ اور اسی طرح دوسری نشانی بھی دکھائی گئی کہ اپنا ہاتھ بغل میں ڈالنے کے بعد جب باہر نکالا تو وہ خوب چمکنے لگا..... اور اس کے بعد اللہ کی طرف سے ارشاد ہوا: ﴿لَخَرِيكَ مِنْ آيَاتِنَا الْكُبْرَىٰ﴾ (۲) یعنی ”اے موسیٰ ہم آپ کو اپنی بڑی بڑی نشانیاں دکھانا چاہتے ہیں“ اور پھر یہ حکم دیا گیا: ﴿إِذْ هَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ﴾ (۳) یعنی ”اب آپ فرعون کی طرف جائیے اس نے تو بڑی سرکشی چارکھی ہے“۔ مقصد یہ کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی جانب سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک بہت بڑی ذمہ داری سونپنے جانے سے قبل اللہ کی قدرت کا مشاہدہ کرایا گیا تاکہ اس طرح اللہ پران کا یقین و ایمان مزید پختہ ہو جائے اور اس فریضے کی راہ میں آئندہ آنے والی مشکلات کا سامنا کرتے وقت کسی قسم کی گھبراہٹ یا تردد کا شکار ہونے کی بجائے وہ خوب ثابت قدم رہیں۔

یعنی اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں سفرِ معراج کے تذکرہ کے ضمن میں ارشاد ہے: ﴿لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا﴾ (۴) یعنی ”تاکہ ہم اسے اپنی قدرت کے کچھ نمونے دکھا دیں“ اس آیت میں خود اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے اس یادگار سفر کا مقصد یہی بیان

(۱) طہ [۲۳] (۲) طہ [۲۴] (۳) النازعات [۱۷] (۴) الاسراء/ بنی اسرائیل [۱]

کیا گیا ہے کہ اللہ کی طرف سے اپنے حبیب ﷺ کو اپنی کی قدرت کے کچھ نمونوں کا مشاہدہ و نظارہ کرانا مقصود تھا۔

اسی طرح قرآن کریم میں دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ﴾ (۱) ترجمہ: ”یقیناً اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے کچھ نشانیاں دیکھ لیں“، یعنی رسول اللہ ﷺ کو اس سفرِ معراج کے موقع پر اللہ کی قدرت کی بہت سی بڑی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ و نظارہ کرا دیا گیا۔

اور ظاہر ہے کہ اس مشاہدے سے مقصود یہی تھا کہ اللہ پر یقین و ایمان مزید پختہ و مستحکم ہو جائے..... یعنی دعوتِ دین کے سلسلہ میں اب آئندہ پیش آنے والے مزید مشکل، اہم ترین اور فیصلہ کن مراحل کیلئے تیاری مقصود تھی۔

سفرِ اسراء و معراج میں امت کیلئے سبق اور پیغام:

☆..... اللہ سے لولگانے کی ضرورت:

سفرِ معراج سے قبل مسلسل ایسے حالات چل رہے تھے جو رسول اللہ ﷺ کیلئے بڑی پریشانی اور ذہنی صدمات کا باعث تھے، مثلاً ابوطالب کی وفات، اس کے بعد جلد ہی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال، اسی دورانِ مشرکینِ مکہ کی طرف سے ایذا رسانی کے معاملے میں شدت و تیزی، اور پھر اہل طائف کی طرف سے انتہائی بدسلوکی و سنگدلی کا مظاہرہ..... ایسی جاں گداز صورتِ حال میں آپؐ نے طائف سے واپسی پر دورانِ سفر ایک مقام پر رک کر نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ اللہ سے دعاء و مناجات اور آہ و فریاد کا سلسلہ شروع کیا..... آپؐ کی اس دعاء کی قبولیت کیلئے آسمانوں کے دروازے کھول دیئے گئے، مزید یہ

کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی جانب سے اپنے حبیب ﷺ کی دلجوئی و تسکینِ قلب کی خاطر عالم بالا کی سیر، یعنی ”سفر اسراء و معراج“ کا انتظام بھی کیا گیا۔

یقیناً اس میں ہمارے لئے یہ نہایت اہم سبق ہے کہ انسان کو ہمیشہ ہی اپنے خالق و مالک کے ساتھ اپنا تعلق اور رشتہ مضبوط و مستحکم رکھنا چاہئے، بالخصوص پریشانی اور مصیبت کے وقت تو اللہ کی مکمل اطاعت و فرمانبرداری کے ساتھ ساتھ اس سے دعاء و مناجات، آفریاد اور اس سے لولگانے کا بہت زیادہ اہتمام کرنا چاہئے۔

☆..... نماز کی پابندی کی ضرورت:

اسراء و معراج کے اس یادگار و اہم ترین موقع پر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی جانب سے اپنے حبیب ﷺ کو ”نماز“ کا تحفہ عطا کیا گیا، تمام اسلامی عبادات میں سب سے پہلے نماز کی فرضیت ہوئی، نماز کی فرضیت معراج کے موقع پر آسمانوں پر ہوئی، جبکہ باقی تمام عبادات کی فرضیت زمین پر ہوئی کہ جبریل امین علیہ السلام کسی عبادت کی فرضیت کی خبر لے کر آئے، اور پھر یہ کہ نماز کی فرضیت فرشتے کے توسط کے بغیر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی جانب سے براہِ راست ہوئی، آخرت میں سب سے پہلے نماز ہی کے بارے میں سوال ہوگا، رسول اللہ ﷺ نے آخری وقت میں بالکل آخری وصیت نماز ہی کے بارے میں فرمائی..... ان تمام باتوں سے دین اسلام میں نماز کی بہت بڑی اہمیت واضح و ثابت ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کو پریشانیوں کے اُس دور میں بالآخر آسمانوں کا یہ سفر کرایا گیا، تسلی کا انتظام کیا گیا..... ہم بھی تو اللہ ہی کے بندے ہیں..... اور ہم بھی تو رسول اللہ ﷺ کے امتی ہیں..... ہمیں بھی تو پریشانیاں ستاتی ہیں..... کون ہے اس دنیا میں جسے کوئی بھی پریشانی نہ ہو..... دنیا کی اس زندگی میں دکھ اور سکھ، خوشی اور غم، دھوپ اور چھاؤں،

نشیب اور فرما..... روشنی اور اندھیرا..... یہ سب کچھ تو ہر ایک کے ساتھ لگا ہوا ہے.....
 ہر انسان کی یہی کہانی ہے..... یہی قانونِ قدرت ہے..... جس کے سامنے امیر و فقیر،
 چھوٹے بڑے، خادم و مخدوم، حاکم و محکوم، سبھی بے بس اور لاچار ہیں.....!
 لہذا پریشانی اور صدمے کے وقت ہم کیا کریں.....؟ ہم کہاں جائیں.....؟ کس کے سامنے
 اپنا دکھڑا بیان کریں.....؟ اور کس سے فریاد کریں.....؟

اس اہم ترین سوال کا جواب یہی ہے کہ اللہ کی طرف سے جب اپنے حبیب ﷺ کیلئے
 مشکلات کے اُس دور میں اور صدمات کے اُس بھنور میں بذریعہ ”معراج“ تسلی و تسکین
 کا سامان کیا گیا..... اسی رات اسی موقع پر ہی اپنے حبیب ﷺ کی امت کیلئے، یعنی ہمارے
 لئے بھی اسی تسلی و تسکین کا انتظام کر دیا گیا..... یعنی ہمارے لئے ”نماز“ کا تحفہ عطاء
 کیا گیا..... یہ ”نماز“ ہمارے لئے معراج ہے..... یہ نماز ہمارے لئے اللہ سے ملاقات
 ہے..... یہ نماز اللہ سے دعاء و مناجات ہے..... یہ نماز اللہ اور بندے کے درمیان وابستگی
 و تعلق کا وسیلہ و ذریعہ ہے..... یہ نماز اللہ کے سامنے اپنی بندگی و محتاجی کا عملی اقرار و اظہار
 ہے..... یہ نماز ٹوٹے ہوئے دل کی فریاد ہے..... اس نماز میں ٹوٹے ہوئے دل کیلئے تسلی کا
 انتظام اور بے قرار روح کیلئے تسکین کا سامان ہے.....!
 لہذا واقعہ ”اسراء و معراج“ سے سبق حاصل کرتے ہوئے ہمیں نماز کی مکمل پابندی کا خوب
 اہتمام کرنا چاہئے۔

☆..... مسجد سے رشتہ جوڑنے کی ضرورت:

رسول اللہ ﷺ کو اللہ کے حکم سے اس سفرِ اسراء و معراج پر مسجد سے لے جایا گیا۔ یعنی عالم
 بالا کے اس سفر کی ابتداء اور اس ”روحانی پرواز“ کا آغاز مسجد سے ہوا، نہ کہ کسی اور مقام سے

یقیناً اس سے ”روحانی پرواز“ اور ”باطنی ارتقاء“ کیلئے مسجد کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔
 لہذا مسلمان کیلئے یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں مسجد کے ساتھ
 اپنا رشتہ خوب جوڑ کر رکھے، یہی معنی و مفہوم اس حدیث کا بھی ہے جس میں اس بات
 کا تذکرہ ہے کہ قیامت کے روز جب تمام کائنات میں کہیں کوئی سایہ نہیں ہوگا، اس
 روز سات قسم کے انسانوں کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے بطور خاص اپنے عرش کے نیچے
 سائے میں جگہ عنایت کی جائیگی، انہی میں سے ایک قسم کے لوگ وہ ہوں گے جن کا دنیا کی
 زندگی میں مسجد کے ساتھ ایسا مضبوط تعلق تھا کہ گویا ان کا دل بس مسجد کے ساتھ ہی جڑ کر رہ
 گیا تھا.....!! (۱)

☆..... ”اخلاقی بلندی“ کیلئے فکر و جستجو کی ضرورت:

رسول اللہ ﷺ کو اس سفرِ اسراء و معراج کے موقع پر ”بلندیوں“ پر لے جایا گیا اور ”عالمِ بالا“
 کا مشاہدہ کرایا گیا۔

لہذا آپ کے امتی ہونے کی حیثیت سے ہماری بھی یہی کوشش و خواہش ہونی چاہئے کہ ہمیں
 بھی ”بلندی“ نصیب ہو، اور ”پستی“ سے ہم محفوظ و مأمن رہیں۔ اور اس مقصد کیلئے ہم
 اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری کا اہتمام کریں، نیز ”بلند“ اخلاق و عادات اور
 ”اعلیٰ“ کردار اپنائیں..... بری عادات اور گھٹیا حرکات سے اپنا دامن بچائے رکھیں.....
 کیونکہ ایمان، عملِ صالح، نیز اعلیٰ اخلاق و کردار دراصل ”بلندی“ ہے، جبکہ اس کے برعکس
 برے کام کرنا اور بری عادات اپنانا ”پستی“ اور ”گراؤٹ“ ہے..... لہذا جب ہمارے نبی

(۱) ملاحظہ ہو حدیث: سَبْعَةُ يُظَلُّهُمْ اللَّهُ فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ..... رَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلَّقٌ فِي

الْمَسَاجِدِ (بخاری [۶۲۹] باب من جلس في المسجد ينتظر الصلاة وفضل المساجد۔

کو اس سفر کے موقع پر ”بلندیوں“ پر لے جایا گیا، تو پھر امتی کی حیثیت سے ہمیں یہ بات ہرگز زیب نہیں دیتی کہ ہم ”پستی“ اور ”گراؤٹ“ میں مبتلا رہیں۔

ارشادِ ربانی: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ، ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ، إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ﴾ کا یہی معنی و مفہوم ہے۔ یعنی ”ہم نے انسان کو پیدا کیا بہترین صورت میں، پھر اسے نیچوں سے نیچا کر دیا، لیکن وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کیلئے اجر ہے کبھی نہ ختم ہونے والا۔“ (۱)

ان آیات میں ”اسفل سافلین“ سے مراد عقیدہ و ایمان کی خرابی اور بد عملی کے ساتھ ساتھ اخلاق و کردار کا گھٹیا پن اور گراؤٹ بھی ہے جس کی وجہ سے جہنم میں ان کا ٹھکانہ سب سے نیچے ہوگا۔

☆..... نوافل کی فضیلت:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: (يَا بَلَالُ! حَدِّثْنِي بِأَرْجَى عَمَلٍ عَمَلْتَهُ عِنْدَكَ فِي الْإِسْلَامِ، فَإِنِّي سَمِعْتُ اللَّيْلَةَ خَشَفَ نَعْلَيْكَ بَيْنَ يَدَيَّ فِي الْجَنَّةِ) یعنی: ”اے بلال! قبولِ اسلام کے بعد آپ نے جو بہترین عمل انجام دیا ہے مجھے اس کے بارے میں بتائیے؟ کیونکہ آج رات میں نے آپ کی جوتیوں کی آواز جنت میں سنی ہے۔“

اس پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: مَا عَمَلْتُ عَمَلًا فِي الْإِسْلَامِ أَرْجَى

عِنْدِي مَنَفَعَةٌ ، مِنْ أَنِّي لَا أَتَطَهَّرُ طَهُورًا تَامًا فِي سَاعَةٍ مِنْ لَيْلٍ وَلَا نَهَارٍ ، إِلَّا صَلَّيْتُ بِذَلِكَ الطَّهْرِ مَا كَتَبَ اللَّهُ لِي أَنْ أَصَلِّيَ (۱) یعنی: ”مسلمان ہونے کے بعد میرا وہ عمل جو میری نظر میں سب سے زیادہ مفید اور بہترین ہے، وہ یہ کہ رات یا دن کے کسی بھی حصے میں جب بھی میں خوب اچھی طرح وضوء کرتا ہوں، تو اس وضوء کے بعد اللہ مجھے جس قدر بھی توفیق عطا فرمادے، میں کچھ نماز ضرور پڑھتا ہوں۔“

یعنی حضرت بلال رضی اللہ عنہ اپنا یہ معمول بیان فرما رہے ہیں کہ رات ہو یا دن، جب بھی میں وضوء کرتا ہوں تو حسبِ توفیق کچھ نہ کچھ نوافل ضرور پڑھ لیتا ہوں۔

یہی وہ عمل ہے جس کی بناء پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی بارگاہ میں اس قدر بلند اور عظیم مقام و رتبہ نصیب ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے معراج کے موقع پر جنت میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے قدموں کی آہٹ محسوس فرمائی۔

یقیناً اس سے نوافل کی فضیلت و اہمیت ثابت ہوتی ہے، لہذا حسبِ توفیق نوافل کی ادائیگی کا ضرور اہتمام کیا جانا چاہئے۔

☆..... ذکر اللہ کی فضیلت:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (لَقِيتُ إِبْرَاهِيمَ لَيْلَةَ أُسْرِي بِي ، فَقَالَ : يَا مُحَمَّدُ! أَقْرَأُ أُمَّتَكَ مِنِّي السَّلَامَ ، وَأَخْبِرُهُمْ أَنَّ الْجَنَّةَ طَيِّبَةُ التُّرْبَةِ ، عَذْبَةُ الْمَاءِ ، وَأَنَّهَا قِيعَانٌ ، وَأَنَّ غِرَاسَهَا ؛ سُبْحَانَ اللَّهِ وَ الْحَمْدُ لِلَّهِ ، وَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ، وَ اللَّهُ أَكْبَرُ) (۲)

ترجمہ: ”شبِ معراج کے موقع پر میری ملاقات ابراہیم [علیہ السلام] سے ہوئی، تب انہوں

نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ”اے محمد! اپنی امت کو میرا سلام کہئے گا، نیز انہیں میرا یہ پیغام بھی پہنچا دیجئے گا کہ جنت کی مٹی تو نہایت خوشگوار ہے، وہاں کاپانی خوب بیٹھا ہے، وہاں کی زمین ہموار ہے، اور اس کی گھاس ”سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ، وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَاللَّهُ أَكْبَرُ“ ہے۔

یعنی ”جنت“ تو بہت ہی عمدہ مقام ہے اور وہاں کے مناظر انتہائی دلکش اور جاذبِ نظر ہیں..... لہذا ہر مسلمان کو خوب ذوق و شوق اور ہمت کے ساتھ جنت کے حصول کیلئے کوشش و جستجو کرنی چاہئے، اور اس مقصد کیلئے یہ بات بھی معلوم ہونی چاہئے کہ وہاں کی لہلہاتی کھیتوں اور سرسبز و شاداب باغوں میں پہنچنے کیلئے طریقہ یہ ہے کہ ”سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ، وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَاللَّهُ أَكْبَرُ“ کا خوب ورد کرتے رہنا چاہئے۔

یقیناً اس سے ”ذکر اللہ“ کی بہت زیادہ اہمیت و فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

معراج کے بعد:

سفرِ اسراء و معراج سے واپسی کے بعد رسول اللہ ﷺ مزید ذوق و شوق اور ہمت و جذبے کے ساتھ خلقِ خدا کو پیغامِ حق پہنچانے میں مشغول و منہمک ہو گئے۔ البتہ اب آپ کی زیادہ توجہ قریش کی بجائے ان قبائل کی طرف تھی جو مکہ شہر سے باہر مضافاتی علاقوں میں آباد تھے، مثلاً بنو عامر، غسان اور کندہ وغیرہ، نیز مذہبی، تجارتی و معاشی امور کی خاطر بیرونِ مکہ سے آنے والے افراد یا قبائلی و فود وغیرہ..... چنانچہ ان دنوں آپ نے اس سلسلے میں مختلف فود اور شخصیات سے ملاقاتیں کیں۔

☆..... انہی دنوں مدینہ (جس کا نام اس دور میں یثرب تھا) سے تعلق رکھنے والے ”سود

بن الصامت، نامی ایک مشہور شاعر اور دانشور کی مکہ آمد ہوئی، یہ صاحب شعر و شاعری کے علاوہ مزید یہ کہ عوام و خواص کی مختلف محافل و تقریبات میں اپنے مخصوص دلنشین انداز میں ”کلام لقمان حکیم“ سنایا کرتے تھے، جس کی وجہ سے لوگ ان سے بہت متاثر تھے، اور اسی بناء پر عوام و خواص میں ان کی اچھی خاصی شہرت اور مقبولیت تھی..... نیز یہ کہ اپنے خاندان اور حسب و نسب کے لحاظ سے بھی کافی معزز سمجھے جاتے تھے۔

ان کی آمد کے موقع پر مشرکین مکہ کو یہ سوچ کر بڑی تشویش ہوئی کہ کہیں یہ صاحب رسول اللہ ﷺ سے متاثر ہو کر مسلمان نہ ہو جائیں، کیونکہ ان کے مخصوص انداز کی وجہ سے لوگ تو پہلے ہی ان سے بہت متاثر ہیں..... اور اگر یہ مسلمان ہو گئے..... تو پھر یہ ہر جگہ..... ہر محفل میں ”کلام لقمان“ کی بجائے ”قرآن“ سنایا کریں گے..... تب ہمارا کیا بنے گا؟ یہ بات سوچ کر مشرکین مکہ نے ہر ممکن کوشش کی کہ رسول اللہ ﷺ سے ان کی ملاقات نہ ہو سکے..... لیکن اس کے باوجود ملاقات ہو گئی، اس ملاقات کے موقع پر آپؐ نے انہیں دین اسلام کے بارے میں اور قرآن کے بارے میں بتایا، جس پر یہ کہنے لگے کہ میرے پاس تو خود بہت عمدہ کلام ہے..... یعنی کلام لقمان..... اور پھر آپؐ کو یہ کلام سنایا، اس پر آپؐ نے فرمایا ”یقیناً یہ بہت عمدہ کلام ہے“ لیکن میرے پاس تو ”کلام اللہ“ ہے، جو کہ تمہارے پاس موجود اس ”کلام لقمان“ سے بہت بہتر ہے..... اور پھر آپؐ نے قرآن کریم کی چند آیات تلاوت فرمائیں، جس پر یہ صاحب انتہائی متاثر ہوئے، اور کہا کہ واقعی یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا..... بیشک یہ تو اللہ ہی کا کلام ہے.....!

چنانچہ سوید بن الصامت آپؐ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے مسلمان ہو گئے، لیکن اس کے بعد انہیں رسول اللہ ﷺ کی صحبت و معیت میں رہنے کا موقع نہیں مل سکا اور جلد ہی اپنے شہر

مدینہ کی جانب واپس روانہ ہو گئے، جہاں واپسی کے چند روز بعد ہی اوس خنزرج کے مابین ایک جنگ کے دوران ان کی وفات ہو گئی۔

☆..... اسی طرح انہی دنوں حجاز اور یمن کے درمیان واقع ”تہامہ“ نامی علاقے سے تعلق رکھنے والے مشہور و معروف اور طاقتور قبیلے ”الدوس“ کے سردار ”طفیل بن عمرو الدوسی“ کی مکہ آمد ہوئی، مشرکین مکہ نے ان کا نہایت گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا اور خوب آؤ بھگت کی، اس کے بعد انہیں رسول اللہ ﷺ سے خوب خوفزدہ کرتے ہوئے خبردار کیا کہ (نعوذ باللہ) اس شخص کا جادو اس قدر طاقتور ہے کہ اس کی تاثیر سے بچنا انتہائی مشکل ہے، لہذا تم اس شخص سے بہت دور رہنا..... اور خاص طور پر یہ کوشش کرنا کہ اس کی کوئی بات تمہارے کانوں تک نہ پہنچنے پائے، ورنہ تمہارے لئے بڑی مشکل کھڑی ہو جائیگی، تمہاری یہ شان و شوکت اور سرداری بھی جاتی رہے گی..... نیز رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اسے مزید خبردار کرتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ وہ اکثر بیت اللہ کے قریب ہی نظر آیا کرتے ہیں۔

چنانچہ مشرکین مکہ کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے احتیاطی تدبیر کے طور پر بیت اللہ کی طرف روانگی کے وقت طفیل نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی، تاکہ اگر وہاں رسول اللہ ﷺ موجود ہوئے تو ان کی کوئی بات ان کے کانوں تک نہ پہنچ سکے..... اور جب یہ بیت اللہ کے قریب پہنچے اور طواف شروع کیا تو وہاں ان کی نظر رسول اللہ ﷺ پر پڑی جو اس وقت وہاں قرآن کریم کی تلاوت میں مشغول تھے، کسی طرح آپ کی کچھ آواز ان کے کانوں میں پڑ گئی اور جو کچھ ان کے کانوں نے سنا اس سے یہ بہت متاثر ہونے لگے اور اس میں انہیں انتہائی حلاوت اور کشش محسوس ہونے لگی..... تب انہوں نے مزید خوب اچھی طرح روئی اپنے کانوں میں ٹھنسی..... تاکہ ”سحر زدہ“ نہ ہو جائیں..... لیکن بے اختیار ان کا دل اس انتہائی

مؤثر و لٹشیں کلام کو دوبارہ سننے کیلئے بیقرار ہونے لگا..... آخر انہوں نے دل ہی دل میں خود کو ملامت کرتے ہوئے سوچا کہ میں کوئی معمولی یا نکما انسان تو نہیں ہوں..... میں تو اپنے اتنے بڑے اور اس قدر طاقتور قبیلے کا سردار ہوں..... تو پھر اس شخص کے کلام سے اتنا خوف کس لئے.....؟ میں کوئی نا سمجھ بچہ تو نہیں ہوں..... میں عقلمند ہوں..... دانشمند ہوں..... اچھے اور برے کی مجھے خوب تمیز ہے..... اور میں تو نہایت فصیح و بلیغ ادیب اور پہنچا ہوا شاعر اور خطیب بھی ہوں..... مجھے درست اور غلط کلام کی خوب پہچان ہے..... تو پھر یہ اتنا خوف آخر کس لئے.....؟ مجھے اس شخص کا کلام سن لینا چاہئے..... اور تب میں خود فیصلہ کر لوں گا کہ اس کا کلام صحیح ہے یا غلط..... اچھا ہے یا برا..... اور پھر بالآخر انہوں نے اپنے کانوں سے وہ روئی نکال پھینکی..... اور انتہائی دلچسپی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی تلاوت قرآن کی طرف متوجہ ہو گئے..... اور پھر کچھ دیر بعد جب رسول اللہ ﷺ وہاں سے اپنے گھر کی جانب روانہ ہوئے تو یہ بھی پیچھے ہو لئے..... اور آپؐ کے گھر پہنچ کر اپنا تعارف کرایا..... آمد کا مقصد بیان کیا..... اور پھر مشرف باسلام ہو گئے.....!

اور پھر مکہ سے واپس اپنے قبیلے میں پہنچنے کے بعد نہایت سرگرمی اور زور و شور کے ساتھ دین اسلام کی تبلیغ شروع کر دی، جس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ تمام قبیلہ مسلمان ہو گیا..... اور اس سلسلے میں ایک خاص قابل ذکر بات یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے انتہائی جلیل القدر صحابی اور آپؐ کی احادیث مبارکہ کے ایک بہت بڑے ذخیرے کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا تعلق بھی اسی قبیلے سے تھا، وہ بھی انہی دنوں اپنے قبیلے کے سردار یعنی طفیل بن عمرو الدوسی رضی اللہ عنہ کی تبلیغی کوششوں اور دعوتی سرگرمیوں کے نتیجے میں ہی مسلمان ہوئے

تھے۔

نئی منزل کی امید:

رسول اللہ ﷺ گذشتہ گیارہ برس سے مسلسل مکہ میں گلی گلی اور کوچہ کوچہ گھوم کر شب و روز پیغام حق پہنچانے میں مشغول تھے..... مگر..... اب اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد آپ ﷺ کو مکہ کی بجائے بہت دور ایک جگہ سے امید کی کرنیں پھوٹی ہوئی نظر آنے لگیں، اور اب ٹھنڈی ہوا کے جھونکے وہاں سے آتے ہوئے محسوس ہونے لگے.....!

آپ کو خواب میں آپ کے ”دارالہجرۃ“ کا مشاہدہ کرایا گیا، آپ نے خواب میں ایک ایسی جگہ دیکھی جہاں نخلستان یعنی کھجوروں کے باغ بکثرت تھے، ظاہر ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام کے خواب سچے ہوا کرتے ہیں، لہذا آپ یہ اشارہ سمجھ گئے کہ مجھے میرا ”دارالہجرۃ“ دکھایا گیا ہے۔

چنانچہ آپ کا ذہن کبھی ”تہامہ“ کی جانب جاتا..... اور پھر کبھی آپ کو اپنا وہ سفر یاد آتا جو آپ نے بہت بچپن میں..... صرف چھ سال کی عمر میں..... اپنی والدہ کے ہمراہ کیا تھا..... یعنی ”سفرِ مدینہ“..... جب آپ خوب غور و فکر کرتے تو بچپن کی ان بھولی ب سری یادوں کے درمیان..... آپ کے تصور میں مدینہ (جو اُس وقت ”یثرب“ تھا) کا جو نقشہ ابھر کر سامنے آتا..... وہ کچھ ایسا ہی تھا..... کہ ہر طرف پھیلے ہوئے بکثرت کھجوروں کے باغ..... اور تب مدینہ کیلئے آپ کا شوق مزید بڑھ جاتا۔

اسی دوران نبوت کے گیارہویں سال ایام حج کے دوران ایک رات آپ ﷺ منیٰ میں بیرون مکہ سے آئے ہوئے حجاج کی اقامت گاہوں میں گھوم پھر کر دعوتِ دین اور پیغام حق پہنچانے میں مشغول تھے، اس موقع پر آپ کے ہمراہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، نیز

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی ہمراہ تھے، تب وہاں آپ ﷺ کی ملاقات چھ افراد سے ہوئی جو کہ ”یثرب“ یعنی مدینہ کے باشندے تھے، آپ نے انہیں اپنی نبوت نیز دین اسلام کے بارے میں بتایا، اور پھر انہیں یہ دین برحق قبول کرنے کی دعوت دی۔ آپ ﷺ کی زبان مبارک سے یہ سب کچھ سننے کے بعد یہ لوگ گہری سوچ میں پڑ گئے، باہم سرگوشی کے انداز میں یوں کہنے لگے ”کہیں یہی وہ آخری نبی نہ ہوں کہ جن سے ہمیں ہمارے یہودی پڑوسی ڈراتے رہتے ہیں“۔

دراصل مدینہ اور مکہ کے ماحول میں ایک بہت بڑا فرق یہ تھا کہ مکہ کے باشندے اگرچہ معمارِ کعبہ اور اپنے جدا امجد یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام سے تو واقف تھے، لیکن آسمانی ادیان، نبوت، یا ایسی طرح آسمانی والہامی کتب کا ان کے یہاں قطعاً کوئی تصور نہیں تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی شدید ترین مخالفت پر کمر بستہ تھے اور آپ کی بات قبول کرنے پر کسی صورت آمادہ نہیں تھے۔

جبکہ اس کے برعکس مدینہ میں یہودی کی بڑی تعداد تھی جو کہ نسل در نسل صدیوں سے وہاں آباد تھے، اور وہ نہ صرف یہ کہ وہاں کے اصل باشندوں یعنی عربوں کو نبوت اور گزشتہ انبیائے کرام علیہم السلام کے بارے میں بتاتے رہتے تھے، بلکہ مزید یہ کہ وہ اپنی برتری اور ان کی کمتری جتانے کی غرض سے انہیں یہ کہہ کر خوف زدہ بھی کرتے رہتے تھے کہ اب آخری نبی کے ظہور کا وقت آچکا ہے..... ان کا ظہور اب کسی بھی وقت متوقع ہے..... نیز یہ کہ جب وہ ظاہر ہو جائیں گے تو ہم ان کے ساتھ مل کر تم لوگوں کو خوب مار پیٹا کریں گے، اور چونکہ وہ اللہ کے نبی ہوں گے اس لئے اللہ کی طرف سے ان کیلئے نصرت و تائید بھی ضروری ہوگی..... لہذا ہمیشہ ہم غالب و فاتح ہو ا کریں گے اور تم مغلوب و مقہور.....!

یہودی طرف سے اس قسم کی باتیں وقفاً وقتاً سنتے رہنے کی وجہ سے مدینہ کے ان عرب باشندوں کے ذہنوں میں ”نبوت“ اور ”انبیاء“ کا تصور موجود تھا، اور یہ ان کیلئے کوئی نئی یا عجیب و غریب بات نہیں تھی کہ جسے رسول اللہ ﷺ کی زبانی وہ سنتے ہی یکسر ٹھکرا دیتے یا رد کر دیتے، لہذا مشرکین مکہ کے برعکس انہوں نے یہ بات سن کر کوئی جارحانہ رویہ اختیار نہیں کیا، اور نہ ہی کسی خاص حیرت یا تعجب کا اظہار کیا۔

اس کے علاوہ یہ کہ سالہا سال سے مدینہ میں ان کی کیفیت یہ چلی آرہی تھی کہ یہ باہم جنگ و جدال میں مشغول تھے، ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار تھے، اوس و خزرج کے مابین تباہ کن جنگوں کے اس لامتناہی سلسلے نے انہیں برباد کر رکھا تھا، اپنے تمام تر وسائل جنگ کی آگ میں جھونک دینے کے باعث معاشی طور پر یہ کنگال ہو چکے تھے، اوپر سے یہودی انہیں وقفاً وقتاً مزید بڑی خطیر رقم بطور قرض دیتے، اور پھر سود در سود کا سلسلہ چلتا رہتا، جس کی وجہ سے یہ مزید کنگال..... جبکہ یہودی مزید خوشحال ہوتے چلے جاتے..... اگر کبھی اوس و خزرج میں صلح کے امکانات نظر آنے لگتے تو یہ یہودی اپنی عیاری و مکاری اور خفیہ سازشوں کے ذریعے فتنے کی اس آگ کو دوبارہ بھڑکا دیتے۔

یہ ایسی خوفناک صورتِ حال تھی کہ جس کی وجہ سے مدینہ کے یہ عرب قبائل انتہائی اضطراب اور بے چینی میں مبتلا تھے، لڑتے لڑتے اب وہ تنگ آچکے تھے، اور ان کی شدید خواہش تھی کہ کسی طرح اس خوفناک جنگ سے اب انہیں نجات نصیب ہو سکے کہ جس نے انہیں تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے.....!

یہی وجہ تھی کہ ایسی پریشان کن صورتِ حال میں جب انہوں نے حج کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کی زبانی دین اسلام کے بارے میں سنا..... تو وہ گہری سوچ میں ڈوب گئے، اور باہم

سرگوشیاں کرنے لگے کہ ”ہم تو پہلے ہی بری طرح برباد ہیں..... اگر یہود کو رسول اللہ ﷺ کے ظہور کی خبر ہوگئی تو پھر ایسا نہ ہو کہ وہ ہم سے پہلے ہی مسلمان ہو جائیں، اور یوں آپ ﷺ کو وہ اپنے ساتھ ملا لیں..... اگر ایسا ہوا تو اس کا یقینی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہماری تباہی و بربادی کے ایک نئے سلسلے کا آغاز ہو جائے گا..... جبکہ اگر یہود سے قبل ہم مسلمان ہو جائیں، تو شاید اس طرح اس دینِ برحق کی برکت سے ہمیں باہم قتل و خونریزی کے اس عذاب سے نجات نصیب ہو جائے اور ہمارے حالات دوبارہ سدھر جائیں۔

چنانچہ وہ کچھ دیر آپس میں اسی بارے میں تبادلہ خیال اور سرگوشیاں کرتے رہے..... اور پھر جلد ہی باہمی صلاح و مشورے کے اس سلسلے کے بعد انہوں نے قبولِ اسلام کیلئے اپنی آمادگی کا اظہار کیا، اور رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کرتے ہوئے مشرف باسلام ہو گئے۔

اور یوں مناسکِ حج سے فراغت کے بعد یہ چھ افراد پہلی بار ”توحید“ کا نور اپنے ہمراہ لئے ہوئے مکہ سے مدینہ کی جانب روانہ ہو گئے۔

بیعتِ عقبہ اولیٰ:

دوسرے سال یعنی نبوت کے بارہویں سال موسمِ حج کے موقع پر مدینہ سے حجاج بیت اللہ کا جو قافلہ آیا، اس میں بارہ افراد ایسے تھے جنہوں نے مکہ میں رسول اللہ ﷺ سے خفیہ ملاقات کا منصوبہ بنا رکھا تھا، ان میں سے پانچ افراد انہی چھ میں سے ہی تھے جن کی گذشتہ سال آپ سے ملاقات ہوئی تھی اور تب وہ آپ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے مشرف باسلام ہو گئے تھے، جبکہ ان کے علاوہ سات نئے افراد تھے، یوں ان کی کل تعداد بارہ تھی۔

ایام حج کے دوران پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق ایک اندھیری رات میں منیٰ میں عقبہ کے مقام پر انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کی اور آپ کے دست مبارک پر بیعت کی، ایام حج کے بعد یہ لوگ واپس مدینہ چلے گئے، روانگی سے قبل انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ان کی دینی تعلیم و تربیت کی غرض سے مسلمانوں میں سے اگر کوئی ان کے ہمراہ مدینہ جاسکے تو بہت اچھی بات ہوگی..... اس پر آپ ﷺ نے نوجوان صحابی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو ان کے ہمراہ روانہ فرما دیا۔ جو کہ آپ کے پہلے سفیر کی حیثیت سے، نیز پہلے معلم کے طور پر مدینہ پہنچے، اور پھر ان کی مسلسل جدوجہد اور سعی پیہم کے نتیجے میں بہت جلد وہاں مدینہ کے ہر گھر میں اور ہر گلی کوچے میں دین اسلام اور پیغمبر اسلام کا چرچا ہونے لگا..... گھر گھر تو حید کی شمع روشن ہونے لگی، اور یوں مدینہ شہر ”لا الہ الا اللہ“ کے نور سے جگمگانے لگا۔

بیعت عقبہ ثانیہ:

اگلے ہی سال یعنی نبوت کے تیرہویں سال مدینہ سے آئے ہوئے حجاج بیت اللہ کے درمیان کچھتر ایسے افراد تھے (۱) جنہوں نے اپنی آمد سے قبل ہی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ منیٰ میں خفیہ ملاقات طے کر رکھی تھی، اور یہ پیغام بھی بھجوا رہا تھا کہ اب آپ مکہ چھوڑ کر ہمارے پاس مدینہ تشریف لے آئیے۔

چنانچہ ایک اندھیری رات جب آپ ﷺ طے شدہ منصوبے کے مطابق عقبہ میں ان سے ملاقات کی غرض سے مکہ سے منیٰ کی طرف روانہ ہونے لگے تو آپ ﷺ کے چچا حضرت

(۱) ۷۳ مرد اور دو عورتیں؛ نسیم بنت کعب اور اسماء بنت عمرو۔

عباسؓ نے ساتھ جانے پر اصرار کیا، حالانکہ وہ اُس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، اپنے پرانے دین پر ہی قائم تھے، لیکن اپنے بھتیجے (یعنی رسول اللہ ﷺ) کے ساتھ محبت و شفقت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اس بات کو گوارا نہیں کیا کہ اس قدر خطرہ مول لیتے ہوئے ان کا بھتیجا تنہا وہاں جائے..... ایک تو راستے میں قدم قدم پر مشرکین مکہ کی طرف سے خطرہ..... اور اس کے علاوہ مزید یہ کہ انہیں کچھ اندازہ ہو چکا تھا کہ اس ملاقات میں آپؐ شاید اب مستقل طور پر مکہ سے مدینہ منتقل ہو جانے کے بارے میں ان لوگوں کے ساتھ کچھ گفت و شنید کریں گے اور اس سلسلے میں کچھ اہم معاملات طے کئے جائیں گے.....!

چونکہ یہ انتہائی نازک معاملہ تھا..... لہذا حضرت عباسؓ کی یہ خواہش تھی کہ اس اہم اور حساس ترین معاملے پر گفت و شنید کے موقع پر وہ بھی موجود ہوں اور فریقین کے مابین اس بارے میں جو کچھ بھی طے ہو وہ ان کی موجودگی میں ہو، تاکہ ان کا پیارا بھتیجا کسی مشکل میں نہ پھنس جائے.....!

اپنے چچا کے اصرار کو دیکھتے ہوئے آپؐ انہیں ہمراہ لے جانے پر آمادہ ہو گئے، اوریوں یہ دونوں حضرات اندھیری رات میں..... چھپتے چھپاتے..... مکہ سے منیٰ جا پہنچے، جہاں مدینہ سے آئے ہوئے ان افراد کے ساتھ ملاقات ہوئی اور گفت و شنید کا آغاز ہوا۔ اس موقع پر ان افراد نے آپؐ کے دست مبارک پر قبولِ اسلام کی بیعت کی، اور اس کے بعد آپؐ کو مستقل طور پر مدینہ چلے آنے کی باقاعدہ دعوت دی.....!

بہی وہ اہم ترین موقع تھا جس کی نزاکت کے پیش نظر آپؐ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ ساتھ چلنے پر مصر تھے، چنانچہ اس مرحلے پر دونوں طرف سے خوب قول و قرار کا سلسلہ ہوا اور تکلف کو ایک جانب رکھتے ہوئے خوب صاف صاف باتیں ہوئیں..... تاکہ فریقین میں

سے کسی کے ذہن میں کوئی ابہام یا کوئی اندیشہ باقی نہ رہے۔

دورانِ گفتگو ایک موقع پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے یہاں تک فرمایا کہ اگر تم ہمارے بھیجے کو اپنے شہر چلے آنے کی دعوت دینے کے بعد پھر وہاں خاطر خواہ طریقے سے ان کی حفاظت نہ کر سکے..... تو..... بہتر ہوگا کہ ابھی سے بتا دو..... کیونکہ ہم ان کی حفاظت کرتے چلے آئے ہیں..... اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے!!

اس پر مدینہ کے ان باشندوں نے کہا کہ اللہ کی قسم ہم زندگی بھر خود اپنی جان و مال، اپنی عزت و آبرو، نیز اپنے اہل و عیال سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کریں گے، اور اس مقصد کیلئے کسی بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔

تب اس موقع پر انہی میں سے ایک شخص مزید یوں گویا ہوا: ”ہماری اس ملاقات میں جب صاف گوئی اس حد تک پہنچ چکی ہے تو پھر میں بھی ایک اندیشے کا اظہار کر رہی دوں..... کہ مختلف عرب قبائل کے ساتھ ہمارے مختلف قسم کے معاہدات ہیں، نیز خود مدینہ شہر کے اندر موجود یہود کے ساتھ کئے گئے ہمارے معاہدات کا ایک سلسلہ چلا آ رہا ہے..... لیکن اب ہمارے قبولِ اسلام اور پھر آپ کے ساتھ اس معاہدے کے بعد وہ تمام معاہدات کا عدم تصور کئے جائیں گے..... اور یوں اے اللہ کے رسول! آپ کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھانے اور آپ کو اپنے شہر میں پناہ دینے کی وجہ سے گویا ہم پورے عرب میں تمہارے جائیں گے..... ہمیں قریش مکہ و دیگر تمام عرب قبائل کی دشمنی..... حتیٰ کہ خود اپنے شہر مدینہ کے اندر موجود قبائلِ یہود کی دشمنی و مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا..... اور آئندہ چل کر جب اللہ کی طرف سے آپ کو فتح و نصرت اور غلبہ عطا کیا جائے گا، تب اگر آپ اپنے شہر مکہ کی محبت، نیز اپنی قوم کے ساتھ فطری محبت و کشش کی وجہ سے ہمیں چھوڑ کر واپس مکہ چلے آئے.....

تب ہم بیچہ جنور میں تن تہارہ جائیں گے..... اور تب ہمارا کیا بنے گا.....؟؟“
 رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کی یہ گفتگو نہایت توجہ اور تحمل سے سنی، اور پھر ان سب کو مخاطب کرتے ہوئے یہ یادگار الفاظ ارشاد فرمائے: ”میرا جینا اور میرا مرنا اب صرف تمہارے ساتھ ہی ہوگا۔“

اور یوں اس موقع پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں مدینہ کے ان باشندوں نے رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کی۔ یہ یادگار بیعت تاریخ میں ہمیشہ کیلئے ”بیعت عقبہ ثانیہ“ کے نام سے مشہور ہو گئی۔

☆ بیعت عقبہ ”اولیٰ“ اور ”ثانیہ“ میں فرق یہ تھا کہ پہلی بیعت کے موقع پر صرف ان چیزوں کی بیعت لی گئی تھی کہ جن کا تعلق ”عقیدہ و ایمان“ اور ”اخلاقیات“ سے تھا، مثلاً یہ کہ ”اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے..... چوری نہیں کریں گے..... زنا سے بچتے رہیں گے.....“ وغیرہ۔

جبکہ دوسری بیعت کے موقع پر ان مذکورہ باتوں کے علاوہ مزید اس چیز کی بیعت بھی لی گئی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی مدینہ منتقلی کی صورت میں آپ کی حفاظت اور آپ کی طرف سے مدافعت و حمایت کی خاطر وہ کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے..... بڑی سے بڑی جنگ لڑنے..... اور سردھڑکی بازی لگا دینے کیلئے ہمہ وقت مستعد و آمادہ رہیں گے..... آپ کی حفاظت کی خاطر تن، من، دھن سب ہی کچھ قربان کر دیں گے۔

یا اس حقیقت کو یوں سمجھ لیا جائے کہ پہلی بیعت کے موقع پر بیعت کے الفاظ بعینہ وہی تھے جو کہ ”بیعت النساء“ کے نام سے معروف ہیں اور جن کا تذکرہ سورہ الممتحہ کی اس آیت میں

ہے: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰ أَنْ لَا يُشْرِكَنَّ

بِاللّٰهِ شَيْئًا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ
بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيَنَّكَ فِي مَعْرُوفٍ
فَبَايَعُهُنَّ وَاسْتَغْفِرَ لَهُنَّ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١﴾

مقصود یہ کہ آپ ﷺ عورتوں سے جب کبھی بیعت لیا کرتے تو اس وقت الفاظ یہی ہوا کرتے تھے جو اس آیت میں مذکور ہیں، اور جن کا تعلق فقط عقیدہ و ایمان اور اخلاقیات سے ہے، دین اسلام یا پیغمبر اسلام کی حفاظت کی خاطر جنگ یا قتال کا اس میں کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

جبکہ دوسری بیعت کے موقع پر دین اسلام نیز پیغمبر اسلام کی حفاظت کی خاطر ہر قسم کی جنگ لڑنے یا قربانی دینے پر آمادہ رہنے کی بیعت بھی لی گئی۔ کیونکہ بدلی ہوئی صورت حال میں اب وقت کا تقاضا یہی تھا۔



(۱) سورۃ الممتحنہ آیت ۱۲۔

الحمد للہ آج بتاریخ ۴/ ذوالقعدہ ۱۴۳۳ھ، مطابق ۲۰/ ستمبر ۲۰۱۲ء بروز جمعرات یہ باب مکمل ہوا۔
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ، وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

ہجرت مدینہ

نبوت کے تیرہویں سال حج کے مہینے میں ”بیعت عقبہ ثانیہ“ کے کچھ عرصے بعد رسول اللہ ﷺ نے اپنے جاں نثار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو مکہ سے نئی منزل یعنی مدینہ کی جانب ہجرت کا حکم دیا، اور تب تقریباً دو ماہ کے اندر اندر تمام صحابہ کرام ہجرت کر گئے، اور مکہ میں صرف اکاؤ کا مجبور و مجوس افراد ہی باقی رہ گئے۔

وطن کی سرزمین میں یقیناً بڑی کشش ہوتی ہے اور وطن کی محبت بہت مضبوط ہوا کرتی ہے..... مگر اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کے مقابلے میں ہر کشش، ہر تعلق، اور ہر محبت ہیچ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے جان نثار صحابہ کرام کا یہی عقیدہ و ایمان تھا..... اسی کے مطابق ان کا عمل بھی تھا..... اور یہی ان کا کردار بھی تھا.....!

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہجرت کے اس حکم کی تعمیل میں وہ اپنا وطن، اپنا شہر، اپنی سرزمین، اپنا مال و اسباب، اپنا کاروبار، اپنا گھر بار، اپنی زمین جائیداد..... سبھی کچھ چھوڑ کر..... خالی ہاتھ روانہ ہو گئے..... اور اس مقصد کیلئے انہوں نے ایسی تکلیفیں اور صعوبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کیں کہ جن کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ہجرت کا حکم آنے کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے کیفیت یہ ہوئی کہ مکہ مسلمانوں سے خالی ہو گیا، صرف چند مجبور و مجوس قسم کے افراد ہی رہ گئے، اس کے علاوہ خود رسول اللہ ﷺ، نیز حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ابھی تک مکہ میں تھے، کیونکہ ان دونوں حضرات کو تاہنوز خود رسول اللہ ﷺ نے روانگی سے روک رکھا تھا۔

اس دوران حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے متعدد بار رسول اللہ ﷺ سے ہجرت کی

اجازت مانگی تھی، لیکن ہر بار آپ کی طرف سے جواب یہ ملتا تھا کہ: یا ابا بکر! لا تَعَجَلْ لَعَلَّ اللّٰهَ يَجْعَلَ لَكَ صَاحِبًا..... یعنی ”اے ابوبکر! جلدی نہ کرو، شاید اللہ تمہارے لئے کسی اچھے ہمسفر کا انتظام کر دے“۔ اور تب حضرت ابوبکرؓ کے دل میں ایک تمنا کروٹ لیتی اور ایک آرزو جاگ اٹھتی اور وہ اس سوچ میں پڑ جاتے کہ کاش میرا وہ ”اچھا ہمسفر“ خود رسول اللہ ﷺ ہی ہوں۔

انہی دنوں ایک روز مشرکین مکہ نے اپنا ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا جس میں تمام رؤسائے قریش سر جوڑ کر بیٹھے اس بارے میں غور و فکر اور تبادلہ خیال کرتے رہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آخر کیا سلوک کیا جائے اور اس نئے دین کی نشر و اشاعت کی روک تھام کیلئے کیا فیصلہ کن اقدامات کئے جائیں.....؟

ان میں سے کسی نے مشورہ دیا کہ رسول اللہ ﷺ کو ہمیشہ کیلئے قید تنہائی میں ڈال دیا جائے، کسی نے کہا کہ ملک بدر کر دیا جائے۔ آخر تمام تر بحث و مباحثہ کے بعد وہ اس رائے پر متفق ہوئے کہ نعوذ باللہ آپ کو قتل کر دیا جائے۔ جیسا کہ اس ارشادِ بانی میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے: ﴿وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ، وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ، وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ﴾ (۱) ترجمہ: (اور وہ وقت یاد کیجئے جب کافر لوگ آپ کے بارے میں تدبیریں سوچ رہے تھے کہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو قتل کر ڈالیں یا آپ کو ملک بدر کر دیں، اور وہ تو اپنی تدبیریں کر رہے تھے، اور اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا، اور اللہ تو بہترین تدبیر کرنے والا ہے)

ان رؤسائے قریش نے آپ ﷺ کے قتل کی مذموم و ناپاک سازش کو عملی جامہ پہنانے

کیلئے طریقہ یہ سوچا کہ مختلف قبائل سے متعدد نو جوانوں کا انتخاب کیا جائے جو کہ آج رات آپ کے گھر کا محاصرہ کر لیں، اور پھر جب آپ حسب معمول رات کے آخری پہر عبادت کی غرض سے بیت اللہ کی جانب روانگی کیلئے اپنے گھر سے باہر نکلیں تو یہ سب ایک ساتھ اپنی تلواروں سے حملہ کر کے آپ کو قتل کر ڈالیں..... اور چونکہ ان سب قاتلوں کا تعلق قبیلہ قریش کے جدا جدا خاندانوں اور مختلف شاخوں سے ہوگا، لہذا بنو ہاشم تنہا کس کس سے لڑیں گے.....؟ اور اتنے سارے خاندانوں سے کس طرح قصاص کا مطالبہ کریں گے.....؟ اور مجبوراً بس خون بہا کے مطالبے پر ہی اکتفاء کریں گے..... چنانچہ صورتِ حال کے تمام پہلوؤں کا بغور جائزہ لینے کے بعد یہ ناپاک منصوبہ تیار کر لیا گیا، اور جلد از جلد اسی رات ہی اسے عملی جامہ پہنانے کے عزم بالجزم کے ساتھ وہ طواغیت وہاں سے رخصت ہوئے۔

دوسری جانب اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی جانب سے بذریعہ وحی رسول اللہ ﷺ کو روئے قریش کے اس مذموم منصوبے کے بارے میں آگاہ کر دیا گیا اور اسی رات مکہ سے ہجرت کر جانے کا حکم خداوندی لئے ہوئے جبریل امین نازل ہوئے۔

اس حکم کی تعمیل میں رسول اللہ ﷺ اُس دن خلاف معمول تپتی دوپہر میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچے، اور ہجرت کے اس حکم کے بارے میں انہیں مطلع فرمایا۔ اس پر ابوبکرؓ نے عرض کیا: الصُّحْبَةُ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ یعنی ”اے اللہ کے رسول اس سفر میں کیا میں آپ کے ہمراہ چلوں.....؟“ آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: نَعَمْ، الصُّحْبَةُ يَا أَبَا بَكْر۔ یعنی ”ہاں اے ابوبکر! اس سفر میں تم میرے ”ہمسفر“ ہو گے۔“ اور تب فرط مسرت کی وجہ سے ابوبکرؓ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے..... ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ گئے..... اور ابوبکرؓ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے.....!!

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اُس وقت یہ تمام منظر دیکھ رہی تھیں..... وہ فرماتی ہیں کہ اُس روز جب میں نے اپنے والد (ابوبکرؓ) کو فطر مسرت کی وجہ سے روتے ہوئے دیکھا..... تو اُس وقت زندگی میں پہلی بار مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ انسان جس طرح بہت زیادہ غم اور صدمے کے وقت روتا ہے..... اسی طرح بہت زیادہ خوشی کے وقت بھی روتا ہے..... انسان کی آنکھوں سے بہنے والے یہ آنسو کبھی ”غم کے آنسو“ ہوا کرتے ہیں، اور کبھی ”خوشی کے آنسو“، اس سے قبل مجھے اس بات کا علم نہیں تھا۔“

اور پھر آپ ﷺ اپنے ”رفیق سفر“ کو چند ضروری ہدایات دینے کے بعد اپنے گھر واپس تشریف لے آئے۔

اور جب رات ہوئی، ہر طرف اندھیرا چھا گیا، تب رؤسائے قریش کی طرف سے مقرر کردہ مسلح نوجوانوں کا ایک چاق و چوبند دستہ وہاں آپہنچا، اور آتے ہی انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے گھر کا محاصرہ کر لیا، تاکہ آپ حسب معمول جب رات کے آخری پہر عبادت کی غرض سے بیت اللہ کی جانب روانگی کیلئے گھر سے نکلیں گے تب یہ سب یکبارگی آپ پر ٹوٹ پڑیں گے.....!

رسول اللہ ﷺ کے پاس مشرکین مکہ کی بہت سی امانتیں تھیں، اس رات آپ نے وہ تمام امانتیں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے حوالے کرتے ہوئے انہیں تاکید فرمائی کہ ”میری روانگی کے بعد یہ تمام امانتیں ان کے مالکوں تک پہنچا دینا، اور اس کے بعد مکہ سے ہجرت کرنا۔“

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ ”اے علی! آج رات تم

میرے بستر پر سوجاؤ اور میری چادر اوڑھ لو۔

اُس رات رسول اللہ ﷺ کے بستر پر سونا یقیناً موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا، یا یوں سمجھ لیا جائے کہ اُس رات آپ کے بستر پر سونا گویا خودکشی کرنا تھا..... لیکن حضرت علیؓ بلا چون و چرا آپ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے فوراً ہی آپ کے بستر پر لیٹ گئے اور آپ کی چادر اوڑھ لی، یقیناً نوجوانی میں یوں بغیر کسی ادنیٰ تا مل یا تردد کے اللہ اور رسول ﷺ کے کسی بھی حکم کی تعمیل کی خاطر اپنی جان تک کی بازی لگا دینے کیلئے ہمہ وقت مستعد اور تیار رہنا..... یہی وہ بے مثال ایمانی جذبہ تھا کہ جس کی عکاسی اُس موقع پر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے اس طرزِ عمل سے ہوتی ہے..... حالانکہ اُس وقت وہ بالکل نوجوان تھے، یقیناً اس سے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی بڑی فضیلت و منقبت ثابت ہوتی ہے۔

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ رات کے آخری پہر قرآن کریم کی آیت: ﴿وَجَعَلْنَا مِّنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ﴾ (۱) پڑھتے ہوئے اپنے گھر سے باہر تشریف لائے، اپنی مٹھی میں کچھ خاک لی، اور پھونک مار کر اسے ان مسلح نوجوانوں کی جانب اڑا دیا، اور نہایت اطمینان کے ساتھ ان کی نگاہوں کے سامنے سے گزر گئے..... لیکن نہ تو انہیں کچھ نظر آیا..... اور نہ ہی انہیں کچھ علم ہوسکا..... اور وہ رات بھر اس اطمینان کے ساتھ وہاں پہرہ دیتے رہے کہ رسول ﷺ اندر اپنے گھر میں موجود ہیں.....!!

رسول اللہ ﷺ اُس رات اپنے گھر سے روانگی کے بعد سیدھے اس شخص کے گھر پہنچے کہ جس

پُر اُس وقت آپ ﷺ کو سب سے زیادہ بھروسہ تھا، یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، اور پھر فوراً ہی وہ دونوں رات کی تاریکی میں گھر کے عقبی دروازے سے نکل کر ایک نئی منزل کی جانب روانہ ہو گئے.....، مدینہ منورہ مکہ مکرمہ سے شمال کی جانب واقع تھا، لیکن یہ دونوں حضرات بالکل مخالف سمت میں یعنی جنوب کی طرف چل دیئے، رات کے اندھیرے میں دشوار گزار پہاڑی راستوں پر کہ جہاں ہر طرف نو کیلے سنگ ریزوں کی بھرمار تھی..... دونوں مسلسل پایادہ چلتے رہے.....، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کبھی رسول ﷺ کے آگے چلتے..... کبھی پیچھے..... کبھی دائیں..... اور کبھی بائیں..... یوں وہ بار بار اپنی جگہ تبدیل کرتے..... گویا بڑی بے چینی میں مبتلا ہوں..... آپ نے ان کی یہ کیفیت دیکھی تو دریافت فرمایا کہ اے ابوبکر! کیا بات ہے.....؟ اس پر ابوبکر نے جواب دیا کہ ”اے اللہ کے رسول! کبھی مجھے یہ اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی دشمن سامنے کہیں چھپا بیٹھا ہو اور وہ اچانک سامنے سے ظاہر ہو کر آپ کو کوئی نقصان پہنچائے، اس لئے میں آپ کے آگے آگے چلنے لگتا ہوں..... اور پھر یہ اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی تعاقب کرنے والا کہیں پیچھے سے اچانک آجائے، یہ سوچ کر میں آپ کے پیچھے آجاتا ہوں..... پھر یہ فکر ستانے لگتی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دائیں یا بائیں کوئی دشمن کہیں گھات لگائے بیٹھا ہو، اس لئے میں کبھی آپ کے دائیں چلنے لگتا ہوں اور کبھی آپ کے بائیں.....!!

اسی کیفیت میں یہ دونوں حضرات مسلسل چلتے رہے..... یہاں تک کہ تقریباً پانچ میل (یعنی تقریباً آٹھ کلومیٹر) کی مسافت پیدل طے کرنے کے بعد ایک انتہائی بلند و بالا پہاڑ کے دامن میں پہنچے، اور انتہائی کٹھن اور مشکل ترین راستہ طے کرتے ہوئے اس کی چوٹی پر واقع ایک غار کے سامنے جا پہنچے جو کہ ”غار ثور“ کے نام سے معروف ہے۔

اس غار کے دہانے پر پہنچنے کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ یہیں توقف فرمائیے، پہلے میں اکیلا اندر جا کر غار کا جائزہ لے لوں..... کہیں ایسا نہ ہو کہ پہلے سے ہی یہاں کوئی دشمن چھپا بیٹھا ہو..... چنانچہ ابوبکر رضی اللہ عنہ تنہا اندر گئے، اچھی طرح جائزہ لیا، اور خوب صفائی وغیرہ بھی کی، ادھر ادھر چند چھوٹے بڑے سوراخ نظر آئے حضرت ابوبکرؓ کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں ان سوراخوں میں کوئی موزی جانور نہ ہو، کہ جو رسول اللہ ﷺ کیلئے تکلیف واذیت کا باعث بن جائے..... یہ سوچ کر انہوں نے اپنے لباس سے کچھ کپڑا بھاڑ کر اس کے ذریعے ان سوراخوں کو بند کر دیا، اور پھر باہر آ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں گزارش کی کہ یا رسول اللہ! اب آپ اندر تشریف لے آئیے..... جس پر آپ ﷺ غار کے اندر تشریف لے آئے، اور اس کے بعد یہ دونوں حضرات اس غار میں تین دن مقیم رہے۔

دوسری طرف مکہ میں وہ مسلح نوجوان رات بھر مسلسل رسول اللہ ﷺ کے گھر کا محاصرہ کئے کھڑے رہے، اس دوران کبھی کبھی وہ کسی سوراخ سے اندر جھانک بھی لیتے اور مطمئن ہو جاتے کہ رسول اللہ ﷺ بدستور اندر گھر میں موجود ہیں اور اپنے بستر پر سو رہے ہیں.....! لیکن صبح ہونے پر جب اس بستر سے رسول اللہ ﷺ کی بجائے حضرت علی رضی اللہ عنہ نمودار ہوئے تو ان مشرکین کی خفت و شرمساری اور جھنجھلاہٹ کی انتہاء نہ رہی، انتہائی شرمندی و افسردگی کے عالم میں سر جھکائے اور منہ لٹکائے ہوئے وہاں سے چل دیئے، اور جا کر اپنے سرداروں کو اس صورتِ حال سے مطلع کیا، جس پر وہ سب طیش میں آ گئے..... اور انتہائی غیظ و غضب، نیز حیرت و پریشانی کی اس ملی جلی کیفیت میں ایک دوسرے کا منہ تکتے لگے.....! اور پھر وہ سب رسول اللہ ﷺ کے گھر پہنچے، وہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جا پکڑا..... خوب

تحقیق و تفتیش کی گئی..... حتیٰ کہ انہیں زد و کوب بھی کیا گیا..... لیکن یہ سب کچھ بے سود اور لا حاصل ہی رہا، ان سے کوئی مفید معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔

آخر ان رؤسائے قریش کا سرغنہ ابو جہل اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا کہ ”اب سب سے پہلے ابو بکر کے گھر کی تلاشی لی جائے“، چنانچہ وہ سب نہایت سرگرمی و تیزی کے ساتھ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچے، دروازے پر دستک دی، جس پر اندر سے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی بیٹی حضرت اسماءؓ نمودار ہوئیں، ان کے آتے ہی ابو جہل نے نہایت کرخٹ اور تند و تیز لہجے میں پوچھا کہ ”لڑکی! تمہارا باپ کہاں ہے؟“ حضرت اسماء نے جواب دیا کہ ”مجھے نہیں معلوم“، ابو جہل نے اصرار کرتے ہوئے بار بار اپنا سوال دہرایا..... اور ہر بار حضرت اسماء کی طرف سے وہی جواب ملا.....

تب ابو جہل کہنے لگا کہ ”محمد بھی غائب..... اور..... ابو بکر بھی غائب..... مطلب صاف ظاہر ہے..... یعنی وہ دونوں اب ہمارے چنگل سے نکل چکے ہیں.....“

اور تب اس نے اپنے ساتھیوں کو وہاں سے چلنے کا اشارہ کیا..... اور جاتے جاتے تیش میں آکر اس بد بخت نے حضرت اسماءؓ کے چہرے پر اس قدر زور سے تھپڑ مارا کہ ان کے کان سے بالی اڑ کر دور جا گری.....!

اس کے بعد تمام شہر مکہ میں نہایت سرگرمی کے ساتھ ان دونوں حضرات کی تلاش شروع کر دی گئی، ان کے تعاقب میں مختلف اطراف میں متعدد دستے روانہ کئے گئے، تمام راستوں پر پہرے بٹھا دیئے گئے، ہر طرف ناکہ بندی کر دی گئی، چپے چپے پر سراغ رساں پھیل گئے.....!

جب کچھ حاصل نہ ہوا تو آخر اعلان عام کیا گیا کہ ”جو کوئی ان دونوں کو زندہ یا مردہ پکڑ کر لائیگا

یا ان کے بارے میں کوئی مفید اطلاع دے گا..... اسے سوانٹ بطور انعام پیش کئے جائیں گے.....“

ظاہر ہے کہ یہ بہت بڑا انعام تھا، کیونکہ اس معاشرے میں ان کیلئے اونٹ بہت بڑی چیز تھی، کہ اس پر وہ سواری بھی کیا کرتے تھے، نقل و حمل اور بار برداری کا وسیلہ بھی یہی تھا، اس کا گوشت بھی کھایا جاتا تھا..... غرضیکہ ان کیلئے اونٹ ہی سبھی کچھ تھا..... ایسے میں اگر کسی کو مفت میں بیٹھے بٹھائے..... ایک دو نہیں..... یادس بیس نہیں..... بلکہ پورے سوانٹ مل جاتے..... تو یقیناً اس کی تونسلیں سنور جاتیں.....!

چنانچہ اس انعام کے اعلان کو سننے کے بعد تو وہاں ہر کوئی دیوانہ ہی ہو گیا..... راتوں کی نیند اور دن کا چین سکون جاتا رہا..... اب ہر کوئی اپنے تمام کام کاج چھوڑ چھاڑ کر..... بس ان دونوں کی تلاش میں ہی سرگرداں ہو گیا۔

آخر ایک روز یہ لوگ تعاقب کرتے کرتے اُس غار کے دہانے پر جا پہنچے کہ جس میں وہ دونوں حضرات پناہ لئے ہوئے تھے، حتیٰ کہ ان کی آوازیں اور ان کی باہمی گفتگو غار کے اندر سنائی دینے لگی۔

اس قدر نازک ترین صورتِ حال کی وجہ سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پریشان ہو گئے، اور عرض کیا کہ ”اے اللہ کے رسول! مجھے اپنی کوئی فکر نہیں ہے، البتہ مجھے یہ غم کھائے جارہا ہے کہ کہیں آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچے، اس لئے کہ اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو..... پھر..... پوری امت کا کیا بنے گا.....؟“ یعنی یہ تو پوری امت کا خسارہ ہوگا۔

تب آپ ﷺ نے انہیں تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: مَا ظَنُّكَ يَا أَبَا بَكْرٍ بَاثِنِينَ، اَللّٰهُ ثَالِثُهُمَا؟ یعنی ”اے ابو بکر! ایسے دو انسان کہ جن کے ساتھ تیسرا خود اللہ ہو ان کے

بارے میں تمہارا کیا گمان ہے؟“ مقصد یہ کہ ہم محض دو نہیں ہیں، بلکہ ہمارے ساتھ اللہ کی معیت و نصرت بھی شامل حال ہے، لہذا فکر کی کوئی بات نہیں۔

اسی واقعے کی طرف قرآن کریم میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے: ﴿لَا تَنْصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيًا إِذْ هَمَّ فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ (۱) ترجمہ: (اگر تم ان (نبی ﷺ) کی مدد نہیں کرو گے، تو اللہ نے ہی ان کی مدد کی اُس وقت جبکہ انہیں کافروں نے نکال دیا تھا، دو میں سے دوسرا جبکہ وہ دونوں غار میں تھے، جب یہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے)

اُس غار کی ہیئت کچھ ایسی تھی کہ اس کا دہانہ نیچے تھا، جبکہ دہانے کے بعد اندر فوراً ہی کچھ بلندی تھی، یعنی غار کے اندر کا منظر دیکھنے کیلئے ضروری تھا کہ نیچے جھک کر یا بیٹھ کر اندر اوپر کی جانب جھانکا جائے، جھکے بغیر اندر کا منظر دیکھنا ممکن نہیں تھا، جبکہ اندر بیٹھے ہوئے ان دونوں حضرات کو باہر کھڑے ہوئے ان افراد کے پاؤں نظر آرہے تھے۔

اللہ کی شان ملاحظہ ہو کہ یہ تعاقب کرنے والے دشمن شب و روز ہر جگہ مارے مارے پھر رہے تھے، چپہ چپہ انہوں نے چھان مارا تھا، حتیٰ کہ تعاقب کرتے ہوئے اس پہاڑ پر اتنی بلندی تک بھی آگئے..... اس غار کے دہانے تک بھی آپہنچے..... لیکن انہیں اتنی توفیق نہ ہو سکی کہ ذرہ جھک کر اندر جھانک ہی لیں..... یقیناً اُس وقت ان سے اس توفیق کا سلب کر لیا جانا اللہ ہی کے حکم سے تھا۔

رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ہمسفر یعنی ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ دونوں تین دن تین رات

مسلسل اس غار میں مقیم رہے، اس دوران حضرت ابو بکرؓ کے بیٹے عبداللہ دن بھر مکہ میں گھوم پھر کر صورتِ حال کا جائزہ لیتے..... رؤسائے قریش کی گفتگو سنتے..... اور رات کی تاریکی میں وہاں جا کر ان دونوں حضرات کو صورتِ حال سے مطلع کرتے..... تاکہ اس صورتِ حال کے مطابق کوئی اگلا قدم اٹھایا جائے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کا ایک غلام، جس کا نام عامر بن فہیرہ تھا، وہ علی الصبح اس راستے پر بکریاں چراتا تا کہ عبداللہ بن ابی بکرؓ کے قدموں کے نشانات مٹ جائیں، نیز اس دوران مناسب موقع پا کر وہ اُس غارتک بھی جا پہنچتا، اور ان دونوں حضرات کو بکریوں کا دودھ بھی پیش کیا کرتا۔

اس طرح اس غار میں جب تین دن گزر گئے اور ان کی تلاش، تعاقب اور بھاگ دوڑ کے اس سلسلے میں کچھ کمی آئی..... تب وہاں سے روانگی کی غرض سے یہ دونوں حضرات غار سے باہر تشریف لائے۔

چونکہ حفاظتی اقدام کے طور پر طے یہ پایا تھا کہ مکہ سے مدینہ سفر کیلئے عام راستہ اختیار کرنے کی بجائے کوئی ایسا غیر معروف اور گمنام راستہ اختیار کیا جائے گا جو کہ نسبۂ ویران اور غیر آباد ہو، جہاں مسافروں کی آمد و رفت اور نقل و حرکت بہت کم ہوتی ہو..... لہذا غارِ ثور سے روانگی کے موقع پر پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق عبداللہ بن اُریقظ نامی ”رہبر“ بھی وہاں آپہنچا، جس کی خدمات اسی مقصد کیلئے حاصل کی گئی تھیں، جو کہ قابلِ بھروسہ بھی تھا، نیز یہ کہ ویران اور خفیہ راستوں سے خوب واقف بھی تھا۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کافی پہلے سے ہی اس سفر کیلئے دو اونٹنیاں تیار کر رکھی تھیں، اور شک سے بچنے کیلئے انہیں اپنے پاس رکھنے کی بجائے اس ”رہبر“ کے حوالے کر

رکھا تھا۔ چنانچہ اس غار سے نکل کر جب آگے روانگی کا مرحلہ آیا تو، پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق یہ رہبر وہاں آمد کے موقع پر یہ دونوں اونٹنیاں بھی ہمراہ لایا۔

☆..... عظیم خاتون:

جب یہ دونوں حضرات اونٹنیوں پر سوار ہو چکے تو عین موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیٹی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بھی کھانا لئے ہوئے وہاں پہنچیں، جو کہ انہوں نے بڑے ہی شوق اور اہتمام کے ساتھ ان دونوں حضرات کیلئے ”زادِ راہ“ کے طور پر تیار کیا تھا۔

اُس زمانے میں اونٹ پر جو گدی ہوا کرتی تھی جس پر سوار بیٹھتا تھا، سوار کسی رسی کے ذریعے اپنا کچھ مختصر سامان بھی اسی گدی کے ساتھ لٹکا دیا کرتا تھا، اُس روز اسماءؓ جب یہ کھانا لائیں تو اب اس برتن کو اونٹنی پر رکھی ہوئی اس گدی کے ساتھ لٹکانے کیلئے کوئی رسی وہاں دستیاب نہیں تھی، تب اسماءؓ نے اپنا دوپٹہ پھاڑ کر دو حصوں میں تقسیم کیا، ایک حصے کو بل دے کر اس سے رسی تیار کی، اور پھر اس سے کھانے کے اُس برتن کو اونٹنی پر رکھی ہوئی گدی کے ساتھ لٹکا دیا..... اسی واقعے کی نسبت سے اسماءؓ تاریخ میں ہمیشہ کیلئے ”ذات الطافین“، یعنی ”اپنے دوپٹے کے دو حصے کر دینے والی“ کے لقب سے مشہور ہو گئیں۔ (۱)

اس کے بعد حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے بھیگی پلکوں کے ساتھ ان دونوں حضرات کو رخصت کیا..... اور تب ان کے دل میں اندیشوں اور وسوسوں کا ایک طوفان برپا ہونے لگا کہ نہ جانے..... اللہ کے رسول ﷺ..... اور ان کے ہمراہ میرے پیارے بابا جان.....

(۱) بعض کتب تاریخ میں دوپٹے کی بجائے اس پٹے کا تذکرہ ہے جو کہ اُس دور میں عورتیں عموماً اپنی کمر کے گرد باندھا کرتی تھیں، تاکہ کام کاج کرتے وقت لباس ادھر ادھر اڑنے اور کام کاج میں رکاوٹ بننے کی بجائے ایک جگہ ٹکا رہے۔ اسماءؓ نے اپنے اس پٹے کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ واللہ اعلم۔

نہ جانے یہ دونوں حضرات اپنی منزل تک پہنچ بھی پائیں گے..... یا خدا نخواستہ.....؟
اور پھر اسی کیفیت میں..... انہی اندیشوں اور وسوسوں کا ایک طوفان دل میں لئے ہوئے وہ
وہاں سے واپس چل دیں..... یکہ وتہا.....

اس نازک ترین موقع پر حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا یہ تاریخی کردار..... عورت ہونے کے
باوجود..... کمزور و ناتواں مخلوق ہونے کے باوجود..... اس قدر خطرات مول لے کر..... کہ
جہاں قدم قدم پر دشمنوں، سراغ رسانوں، اور کھوجیوں کا جال بچھا ہوا تھا..... اور پھر اس قدر
دشوار گزار اور انتہائی خطرناک پہاڑی راستہ..... کہ جہاں قدم قدم پر موت گھات لگائے
بیٹھی تھی..... ان تمام مشکلات کے باوجود اس نازک ترین موقع پر اس خاتون کا یوں تن
تہا..... پیدل سفر کرتے ہوئے..... اور موت سے آنکھیں ملاتے ہوئے..... وہاں چلے
آنا..... محض ان دونوں حضرات کو کھانا پہنچانے کیلئے..... اور اس تاریخی اور خطرناک
سفر پر ان حضرات کی روانگی کے وقت..... اپنی بھیگی پلکوں کے ساتھ..... انہیں رخصت
کرنے کیلئے..... اور کپکپاتے ہونٹوں کے ساتھ..... انہیں سلامتی کی دعا دینے کیلئے.....
یقیناً اس سے اس خاتون کی عظمت ظاہر ہوتی ہے..... (۱)

(۱) یہاں یہ تذکرہ بھی ہو جائے کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے والد بھی صحابی تھے، دادا بھی، بھائی بھی، شوہر بھی،
اور بیٹا بھی (والد: ابو بکر صدیق۔ دادا: ابو قحافہ۔ بھائی: عبداللہ اور عبدالرحمن۔ شوہر: زبیر بن العوام۔
بیٹا: عبداللہ بن زبیر، رضی اللہ عنہم اجمعین)
جبکہ ان کی بہن نہ صرف یہ کہ صحابیہ تھیں، بلکہ ام المؤمنین بھی تھیں، یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا۔
اس خانہ ہمہ آفتاب است!!

غارِ ثور سے روانگی:

تین دن غار میں قیام کے بعد اب وہاں سے آگے روانگی ہوئی، اس موقع پر رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ہم سفر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ دونوں اپنی اپنی اونٹنی پر سوار تھے، ان حضرات نے احتیاطی تدبیر کے طور پر مدینہ کی جانب فوری سفر کی بجائے پہلے کافی دور تک بالکل مخالف سمت میں یعنی یمن کی جانب سفر کیا، اور پھر کافی مسافت طے کرنے کے بعد اپنا رخ تبدیل کر لیا، اور بحرِ احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ غیر معروف اور ویران راستے پر مدینہ کی جانب روانہ ہو گئے۔

اُدھر ہر طرف نہایت زور و شور اور سرگرمی کے ساتھ تلاش کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا، انہی تلاش کرنے والوں میں سراقہ بن مالک المذلجی نامی ایک شخص بھی تھا (۱) ایک روز وہ اپنے گاؤں میں اپنے کچھ دوستوں کے ہمراہ بیٹھا ہوا تھا، محفل جمی ہوئی تھی، ایسے میں ان لوگوں نے دور کافی فاصلے پر دو اشخاص کو اونٹنیوں پر سفر کرتے ہوئے دیکھا، تب ان میں سے کچھ لوگ چلانے لگے کہ..... یہ تو ضرور محمد (ﷺ) اور ابوبکر ہیں..... اور پھر ان میں سے ہر کوئی اُس بڑے انعام کے لالچ میں..... نہایت بیتابی کے ساتھ ان دونوں کے تعاقب میں جانے کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔

سراقہ کو بھی مکمل یقین ہو گیا کہ یہ دونوں سوار وہی ہیں، یعنی رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ..... لیکن سراقہ نے سوچا کہ یہ اتنا بڑا انعام میرے ہاتھ سے کیوں نکل جائے..... کوئی دوسرا کیوں لے اُڑے یہ انعام..... (سواونٹ) تب سراقہ اپنے ساتھیوں کا مذاق اڑاتے (۱) بعد میں سراقہ مسلمان ہو گئے تھے۔

ہوئے انہیں یوں کہنے لگا کہ ”تم سب دیوانے ہو گئے ہو..... سوانٹوں کے لالچ میں تم لوگوں کا یہ حال ہو گیا ہے..... یہ محمد اور ابو بکر ہرگز نہیں ہو سکتے..... یہ تو کوئی اور لوگ ہیں، کیوں خود کو بلا وجہ ہلکان کرنا چاہتے ہو؟ آرام سے بیٹھے رہو تم سب لوگ“

لیکن خود سراقہ کو اس بات کا مکمل یقین تھا کہ یہ دونوں سوار وہی حضرات ہی ہیں، اور اب اس سے صبر نہیں ہو رہا تھا.....

کچھ دیر وہ اسی جگہ اپنے دوستوں کی محفل میں بیٹھا رہا، تاکہ کسی کو اس پر شک نہ ہو..... اور پھر کچھ دیر بعد بہانہ بناتے ہوئے کہنے لگا کہ مجھے گھر میں ایک بہت ضروری کام پڑ گیا ہے..... یوں وہ وہاں سے اٹھا اور اپنے گھر چلا آیا، گھر پہنچتے ہی فوراً اپنے تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہوا، اور گھر کے عقبی راستے سے نکل کر..... اپنے دوستوں کی نگاہوں سے بچتا ہوا..... اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا..... ان دونوں کے تعاقب میں روانہ ہو گیا..... اور بہت جلد ان کے اس قدر قریب جا پہنچا کہ اب اس نے انہیں پہچان بھی لیا، اس موقع پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نہایت پریشانی کے عالم میں بار بار مڑ مڑ کر اس کی جانب دیکھ رہے تھے، جبکہ رسول اللہ ﷺ مسلسل آگے کی جانب دیکھتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے، اور تلاوت قرآن میں مشغول و منہمک تھے۔

اس انعام کے لالچ میں سراقہ بن مالک جب اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا رواں دواں تھا کہ اس دوران اچانک اس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور وہ گھوڑے کی پشت سے نیچے جا گرا..... مگر وہ نہایت مستعدی اور پھرتی کے ساتھ اٹھا اور دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو کر گھوڑے کو ایڑ لگائی..... لیکن کچھ ہی دیر بعد اس کے گھوڑے نے پھر ٹھوکر کھائی..... سراقہ دوبارہ گرا، لیکن فوراً ہی اٹھا اور پھر تعاقب میں رواں دواں ہو گیا..... البتہ اسے اس بات پر

بہت حیرت تھی کہ اس کے گھوڑے کو مسلسل دوبارہ یہ ٹھوکر کس طرح لگی.....؟ اور اب تیسری بار ایسی صورتِ حال پیش آئی کہ جس سے اس کے ہوش و حواس ہی اڑنے لگے..... ہوا یہ کہ دوڑتے دوڑتے اچانک اس کے گھوڑے کی اگلی دونوں ٹانگیں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئیں..... حالانکہ وہ کوئی ایسی نرم یا ریتیلی زمین بھی نہیں تھی..... اور پھر جب اس نے نیچے اتر کر گھوڑے کو اٹھانے کی کوشش کی..... اور گھوڑا اٹھا..... اور اس کی ٹانگیں جب زمین سے نکلیں..... تو عین اس جگہ سے ایک دھواں سا نمودار ہوا اور فضاء میں بلند ہو کر تحلیل ہونے لگا.....!

سراقہ یہ منظر دیکھ کر انتہائی حیرت زدہ رہ گیا، اور اسے رسول اللہ ﷺ کی صداقت و حقانیت کا مکمل یقین ہو گیا، اور اب وہ باواز بلند پکارنے لگا: الْأَمَان يَا مُحَمَّد..... الْأَمَان يَا مُحَمَّد..... یعنی ”اے محمد! مجھے امان چاہئے.....“

اللہ کی شان..... وہ شخص جو ابھی محض کچھ دیر قبل تک نہایت جوش و خروش اور سرگرمی کے ساتھ تعاقب میں چلا آ رہا تھا..... جسے اپنی جرأت و بہادری پر ناز تھا..... اور جسے قیمتی انعام کے لالچ نے بے چین کر رکھا تھا..... دیکھتے ہی دیکھتے..... اب وہی شخص مجبور..... ولاچار..... خود اپنی سلامتی اور عافیت کیلئے فریاد کرنے لگا..... اور خود اپنے لئے پناہ طلب کرنے لگا..... اور وہ بھی کس سے.....؟ رسول اللہ ﷺ سے..... جو کہ اُس وقت خود پناہ کی تلاش میں تھے.....؟؟

آخر اس کی اس قدر آہ و پکار پر رسول اللہ ﷺ نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا، اور قریب چلے آئے کا اشارہ فرمایا، تب وہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اس تعاقب پر معذرت کرنے لگا.....

رسول اللہ ﷺ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ”اے سراقہ، اُس وقت تمہاری کیا

کیفیت ہوگی جب کسریٰ کے کنگن تمہارے ہاتھوں میں ہوں گے؟“

رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ سن کر سراقہ حیرت زدہ رہ گیا..... کہ آپؐ

جو اس وقت خود پناہ کی تلاش میں ہیں..... بے گھر اور بے وطن ہیں..... کس طرح سراقہ کو

اتنی بڑی خوشخبری سنارہے ہیں کہ روئے زمین کی سب سے عظیم ترین قوت یعنی سلطنت

فارس کے فرمانروا ”کسریٰ“ کے کنگن سراقہ کے ہاتھوں میں آنے والے ہیں.....؟؟ (۱)

مزید یہ کہ اس موقع پر اس نے اظہار عقیدت کے طور پر اپنا سامان نیز کچھ اشیائے خورد و نوش

آپؐ کی خدمت میں پیش کیں، لیکن آپؐ نے معذرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ

”ہمیں اس کی ضرورت نہیں، ہاں البتہ تم اس ملاقات کو مخفی رکھنا“

یعنی یہ جو ہماری تمہاری ملاقات ہوئی ہے اس کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتانا، اسے صیغہ

راز میں ہی رہنے دینا۔ اس پر اس نے یہ وعدہ کیا کہ وہ کسی کو اس ملاقات کے بارے میں

کچھ نہیں بتائے گا۔

تب سراقہ وہاں سے واپس روانہ ہو گیا، راستے میں اسے جہاں کہیں بھی کوئی ایسا شخص نظر آیا

جو رسول اللہ ﷺ کے تعاقب میں سرگرداں تھا سراقہ نے اسے یوں کہا کہ ”میں آگے بہت

دور تک خوب اچھی طرح تلاش کر کے آ رہا ہوں..... یہاں ان کا کوئی نام و نشان نہیں

ہے..... لہذا اب تمہیں آگے جانے اور خود کو بلاوجہ ہلکان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے“

اور یوں وہ ہر تعاقب کرنے والے کو واپس بھیجتا گیا.....

(۱) خلیفہ دوم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں جب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ

کی سپہ سالاری میں فارس فتح ہوا اور بہت بڑی مقدار میں مال غنیمت مدینہ پہنچا جس میں کسریٰ کے کنگن بھی تھے،

تب حضرت عمرؓ نے سراقہ کو بلوایا اور وہ کنگن اس کے ہاتھ میں پہنائے۔

اللہ کی قدرت ملاحظہ ہو کہ جو شخص تھوڑی دیر قبل تک رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تلاش میں سرگرداں تھا..... ان کا جانی دشمن..... اور خون کا پیاسا تھا..... اب وہی جاں نثار بن کر وہاں سے لوٹا..... اور اب وہی ان کا محافظ بن گیا.....

مدینہ میں آمد:

اس طویل سفر کے بعد آخر کار رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ہم سفر یعنی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ۸/ ربیع الاول ۱۲ھ نبوی بروز پیر مدینہ کے مضافات میں پہنچ گئے۔ چونکہ آپ ﷺ کی مکہ سے روانگی کی خبر مدینہ پہنچ چکی تھی اس لئے اہل مدینہ نہایت بیتابی کے ساتھ آپ کی آمد کے منتظر تھے، اور وہ ہر روز صبح ہوتے ہی شہر کی حدود سے باہر نکل کر آپ کے استقبال کیلئے وہاں کھڑے ہو جاتے..... اور آپ کی آمد کا نہایت بے چینی کے ساتھ انتظار کرتے..... اور وہ بے چین کیوں نہ ہوتے..... کہ..... آنے والا مہمان آخر کون تھا.....؟ وہ عزیز ترین مہمان..... خاتم الانبیاء..... سید البشر..... بلکہ سید الخلق..... ایسا مہمان جس کیلئے وہ سب اپنا تن من دھن سبھی کچھ نچھاور کر دینے کیلئے بیقرار تھے..... وہ عظیم مہمان کہ جس کا نام نامی اور اسم گرامی ”محمد بن عبد اللہ“ تھا..... اس پیارے مہمان کا انتظار انہیں بیقرار کئے ہوئے تھا.....!!

اس دور میں کوئی ٹیلی فون یا ٹیلی گرام یا دیگر ذرائع اتصالات کا تو کوئی وجود نہیں تھا..... لہذا بس..... آنے جانے والے مسافروں سے وہ مسلسل پوچھتے رہتے کہ ”کیا کوئی سوار..... کوئی قافلہ..... کوئی مسافر..... تمہیں راستے میں نظر آیا.....؟“ اور پھر اسی کیفیت میں جب دھوپ تیز ہو جاتی..... تب وہ سب اپنے اپنے گھروں کی طرف واپس لوٹ جاتے۔

اُس روز بھی وہ لوگ صبح سے انتظار کرتے کرتے واپس اپنے گھروں کی طرف لوٹ گئے تھے، اسی دوران ایک یہودی جو کہ کھجور کے درخت پر چڑھا ہوا تھا، اس نے دور سے رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو آتے دیکھا، تو اس نے ان دونوں کو فوراً ہی پہچان لیا (۱) اور مدینہ کے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے آواز بلند چلانے لگا..... کہ:

”تمہارے نبی آ گئے..... تمہارے نبی آ گئے.....“ جس پر دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک جمع غفیر اکٹھا ہو گیا..... بڑے چھوٹے..... بوڑھے جوان..... مردوں اور عورتوں کی بہت بڑی تعداد وہاں آ پہنچی..... ہر کوئی رسول اللہ ﷺ کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے بیتاب تھا.....!

رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ہم سفر یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مدینہ شہر کے اندر داخل ہونے کی بجائے ”قبا“ نامی مضافاتی بستی میں پڑاؤ ڈالا اور تین دن یہیں قیام فرمایا۔ اس دوران مسجد قبا کی بنیاد بھی رکھی گئی، جس کی فضیلت خود قرآن کریم میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: ﴿لَمَسْجِدُ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَى مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُومَ فِيهِ﴾ (۲) یعنی ”وہ مسجد کہ جس کی بنیاد روزِ اول سے ہی تقویٰ پر رکھی گئی ہے وہ اس لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں“۔

اسی دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی آپ کی تاکید کے مطابق مشرکین مکہ کی امانتیں ان

(۱) جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ﴾ (البقرة: ۱۴۶) یعنی ”وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب عطا کی ہے وہ انہیں یوں پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بچوں کو پہچانتے ہیں“۔

مقصد یہ کہ گذشتہ آسمانی کتابوں میں رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ اور آپ کی علامات و خصائص کا اس قدر مفصل تذکرہ ہے کہ جس کی وجہ سے اہل کتاب آپ کو خوب پہچانتے ہیں اور آپ کی صداقت و حقانیت کو خوب جانتے ہیں۔

کے حوالے کر دینے کے بعد مکہ سے سفر کرتے ہوئے ”قبا“ میں رسول اللہ ﷺ سے آملے۔

☆..... قبا سے اندرونِ مدینہ شہر کی جانب روانگی:

”قبا“ نامی اس مضافاتی بستی میں تین دن قیام کے بعد دونوں حضرات اندرونِ مدینہ شہر کی جانب روانہ ہوئے، اس موقع پر یہ دونوں الگ الگ اونٹنی کی بجائے اب ایک ہی اونٹنی پر سوار تھے، اس دوران رسول اللہ ﷺ کو دھوپ کی شدت سے بچانے کیلئے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے رومال سے مسلسل آپ کے سر مبارک پر سایہ کئے ہوئے تھے۔

اس دوران کتنی ہی بستیوں سے اور کتنے ہی گلی محلوں سے گزر رہا ہوا..... کتنے ہی قبائل کے مسکن راستے میں آئے..... جس قبیلے کے مسکن سے گزر رہا ہوتا..... وہاں ہر کوئی دیدہ و دل فرس راہ کئے ہوئے نظر آتا..... بار بار آوزیں بلند ہوتیں ”هَلُمَّ الْيَنَّا يَا رَسُولَ اللَّهِ..... هَلُمَّ إِلَى الْعَدَدِ وَالْعُدَّةِ..... وَالسَّلَاحِ وَالْمَنْعَةِ.....“ یعنی: ”اے اللہ کے رسول! ہمارے پاس تشریف لائیے..... ہمیں خدمت کا موقع مرحمت فرمائیے..... اے اللہ کے رسول!..... آپ دیکھ لیجئے کہ ہماری تعداد کتنی زیادہ ہے..... اور ہمارے پاس سامانِ جنگ کی کس قدر بہتات ہے..... ہم کتنی اچھی طرح آپ کی حفاظت کا فریضہ انجام دینے کے قابل ہیں.....“

یوں دیوانہ وار ہر قبیلے والے بھی صدائیں بلند کرتے..... اور یہی اصرار کرتے..... اور رسول اللہ ﷺ کی میزبانی کا شرف حاصل کرنے کیلئے بچھے بچھے جاتے.....!!

ایسے میں بسا اوقات بہت سے لوگ آگے بڑھ کر آپ کی اونٹنی کی مہار پکڑ لیتے..... تاکہ اونٹنی یہیں بیٹھ جائے اور آپ یہیں پڑاؤ ڈال دیں..... لیکن ہر بار آپ نہایت شفقت و محبت سے انہیں سمجھاتے..... اور بار بار اپنی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ دہراتے: ”دَعُوْهَا

..... فَإِنَّهَا مَأْمُورَةٌ ”یعنی ”لوگو! میری اونٹنی کو چھوڑ دو..... کیونکہ یہ تو اللہ کے حکم سے چل رہی ہے.....“

تمام راستے میں چھوٹے بڑے..... بوڑھے..... جوان اور بچے..... مرد اور عورتیں..... سب ہی راستے کے دونوں جانب صف بستہ کھڑے تھے..... گویا آج تمام مدینہ شہر ہی اٹھ آیا تھا..... اور اس دوران پچیاں نہایت دل کش انداز میں، خوب ترنم کے ساتھ..... بیک آواز خیر مقدمی اشعار گارہی تھیں:

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيَّةِ الْوَدَاعِ

وَجَبَّ الشُّكْرُ عَلَيْنَا مَا دَعَا لِلَّهِ دَاعِ

أَيُّهَا الْمُبْعُوثُ فِينَا جِئْتَ بِالْأَمْرِ الْمُطَاعِ

مفہوم: ”آج تو ہمارے شہر مدینہ میں..... چودہویں کا چاند نکل آیا ہے..... اللہ کی طرف سے ہم پر یہ تو ایسا احسان عظیم ہو گیا ہے کہ..... جس کی وجہ سے اب ہم پر ہر لمحہ اللہ کا شکر بجالانا ضروری ہو گیا ہے..... اے ہماری جانب بھیجے جانے والے اللہ کے رسول..... یقیناً آپ تو ایسا دین لائے ہیں کہ..... جسے قبول کرنا سب کیلئے لازمی ہے.....!!“۔

اسی کیفیت میں اونٹنی مسلسل چلتی رہی..... چلتی رہی..... کتنے ہی گلی کوچے آئے..... اور گذر گئے..... آخر..... چلتے چلتے..... ایک جگہ پہنچ کر اونٹنی اچانک رک گئی..... کچھ دیر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی..... اور اس کے بعد بیٹھ گئی..... لیکن پھر فوراً ہی اٹھی..... چند قدم آگے چلی..... اور پھر رُک کر..... گردن گھما گھما کر..... پیچھے اسی جگہ کی جانب دیکھنے لگی..... اس کے بعد واپس مڑی..... دوبارہ اسی جگہ آئی..... اور بیٹھ گئی..... اور بیٹھتے ہی

فوراً اپنی گردن زمین کے ساتھ ٹکادی..... یعنی اشارہ دیدیا کہ منزل مقصود یہی ہے..... جس منزل کی تلاش میں مکہ سے سینکڑوں میلوں کی مسافت طے کرتے ہوئے چلے آ رہے ہیں..... وہ منزل یہی ہے..... اور تب رسول اللہ ﷺ نیز آپ کے ہم سفر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ دونوں اونٹنی سے نیچے اتر آئے..... اور یہ بعینہ وہی مقام تھا کہ جہاں آج مسجد نبوی آباد ہے.....!!

اونٹنی سے نیچے اترتے ہی آپ نے دریافت فرمایا کہ ”یہ سامنے سب سے قریب جو دروازہ نظر آ رہا ہے، یہ کس کا ہے؟“ جواب ملا کہ ”یہ دروازہ ابویوب انصاریؓ کا ہے“ تب آپ اس دروازے کی جانب بڑھے..... ابویوب انصاریؓ نے جب یہ منظر دیکھا..... تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا..... اور وہ دیوانہ وار آپ کی جانب لپکے..... اور یوں اس نئے شہر میں..... مدینہ میں..... سید الاولین والآخرین..... اشرف الانبیاء والمرسلین..... خیر البشر..... رسول اکرم..... صلی اللہ علیہ وسلم..... کی میزبانی کا عظیم شرف حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ عنہ کو نصیب ہوا..... ذَلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَن یَّشَاءُ..... آپ سات ماہ مسلسل انہی کے گھر میں تشریف فرما رہے۔

رسول اللہ ﷺ کی مدینہ تشریف آوری کے بعد چند روز ہی گزرے تھے کہ اس دوران حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کی زیر قیادت ایک مختصر سا قافلہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچا اور آپ سے آملاء اس مختصر قافلے میں آپ ﷺ کے اہل خانہ میں سے ام المؤمنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا، ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، آپ کی صاحبزادیوں میں سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا، نیز حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا، ان کے علاوہ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما جو کہ اس

وقت کافی کم سن تھے، اور ان کی والدہ ام ایمن رضی اللہ عنہا شامل تھیں۔

سفر ہجرت میں ہمارے لئے سبق اور پیغام:

☆..... اللہ پر توکل:

اس تاریخی اور یادگار ترین سفر میں امت کیلئے یقیناً سب سے پہلا سبق یہی ہے کہ حالات کیسے ہی کٹھن اور مشکل ترین کیوں نہ ہوں..... بہر صورت صرف اور صرف اللہ پر توکل و اعتماد کیا جائے، اسی سے التجاء و فریاد کی جائے، اور اسی سے مدد طلب کی جائے.....

اس سفر کے دوران ہر ایک ایک قدم پر، اور بالخصوص غارِ ثور میں قیام کے دوران جب مشرکین مکہ تعاقب کرتے ہوئے اس غار کے دہانے تک آپہنچے تھے..... رسول اللہ ﷺ کی سیرت و کردار میں توکل علی اللہ کی ایسی نادرونیاب مثالیں نظر آتی ہیں کہ شاید تمام انسانی تاریخ میں ایسی کوئی اور مثال نہیں مل سکے گی۔

☆..... توکل کی حقیقت:

البتہ اس مناسبت سے یہ تذکرہ بھی ضروری ہے کہ اس تاریخی موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے مبارک عمل سے ہمیشہ کیلئے امت کو ”توکل کی حقیقت“ بھی بتادی۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس تاریخی اور انتہائی خطرناک سفر کے موقع پر آپ نے اللہ سبحانہ و تعالیٰ پر تہمتاً توکل اور غیر متزلزل اعتماد اور بھروسے کے باوجود ہر وہ سبب اختیار کیا جو اس سلسلے میں مفید ثابت ہو سکتا تھا، مثلاً:

☆..... اس سفر کے بارے میں انتہائی رازداری برتی گئی۔

☆..... مکہ سے روانگی کے فوری بعد شمال یعنی مدینہ کی جانب چلنے کی بجائے بالکل مخالف

سمت یعنی جنوب کی جانب سفر کیا گیا۔

☆..... مسلسل سفر جاری رکھنے کی بجائے ابتداء میں چند روز ”غارِ ثور“ میں توقف کیا گیا، تاکہ تلاش اور تعاقب کا سلسلہ جب کچھ ٹھنڈا پڑ جائے تب وہاں سے آگے اصل سفر کا آغاز کیا جائے۔

☆..... اصل سفر پر روانہ ہوتے وقت معروف راستے کی بجائے گمنام اور ویران راستہ اختیار کیا گیا۔

☆..... اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو تمام جہاں والوں کیلئے ”رہبر“ بنا کر بھیجا گیا تھا، مگر اس کے باوجود اس سفر ہجرت کے موقع پر آپؐ نے ”احتیاطی تدبیر“ کے طور پر عبداللہ بن اریقظ نامی ”رہبر“ کی خدمات حاصل کیں۔

☆..... قدموں کے نشانات مٹانے کیلئے عامر بن فہیرہ نامی چرواہے کو پیشگی تاکید کی گئی کہ وہ اس راستے پر اپنی بکریاں چرائے، نیز بکریوں کا دودھ بھی انہیں پہنچا دیا کرے۔

غرضیکہ رسول اللہ ﷺ نے محض بیٹھے بٹھائے یہ دعویٰ کرنے کی بجائے کہ اپنے اللہ پر مجھے مکمل بھروسہ ہے..... آپؐ نے اس سفر کی تیاری کے سلسلے میں انتہائی کوشش اور محنت و مشقت کی، ہر اس سبب کو اختیار کیا جو اس سفر کو کامیاب بنانے کے سلسلے میں اللہ کے حکم سے نافع و مفید ثابت ہو سکتا تھا۔

یقیناً اس سے ”توکل کی حقیقت“ سمجھ میں آتی ہے کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہنے اور ”توکل“ کا دعویٰ کرنے کی بجائے، خوب کوشش، جدوجہد اور محنت و مشقت کیا کرے، ہر اس سبب کو اختیار کرے جو ”مقصود“ تک پہنچنے کیلئے نافع و مفید ثابت ہو سکتا ہو، اور اس کے بعد معاملہ اللہ پر چھوڑ دے، خود کو اللہ کے حوالے کر دے، خوب گڑ گڑا کر اور دل لگا کر

اللہ سے مناجات اور دعاء و فریاد کرے..... یہ ہے ”توکل کی حقیقت“۔

پرندہ جب اپنے گھونسلے سے نکلتا ہے، تب اللہ اسے رزق عطاء فرماتا ہے، وہی اللہ اس کمزور مخلوق کو اس کے گھونسلے کے اندر بیٹھے بٹھائے بھی یقیناً رزق عطاء فرما سکتا ہے..... لیکن ایسا نہیں ہوتا..... جب وہ گھونسلے سے باہر آتا ہے..... محنت کرتا ہے..... تلاش و جستجو کرتا ہے..... تب اللہ کی طرف سے اس کیلئے رزق کا انتظام کیا جاتا ہے۔

لہذا قانونِ قدرت یہی ہے کہ انسان جو کچھ کر سکتا ہے وہ ضرور کرے..... اور اس کے بعد اللہ پر توکل کرتے ہوئے معاملہ اس کے حوالے کر دے..... اور پھر جو بھی نتیجہ ظاہر ہو اس پر راضی و قانع رہے..... اسی کا نام ”توکل“ ہے۔

☆..... امانت و دیانت:

اُس دور میں مشرکین مکہ کا یہ معمول تھا کہ وہ اپنی تمام قیمتی اشیاء حفاظت کی غرض سے رسول اللہ ﷺ کے پاس بطور امانت رکھوایا کرتے تھے، ہجرت کی رات آپ ﷺ نے وہ تمام امانتیں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے حوالے کرتے ہوئے انہیں تاکید فرمائی کہ ”میری روائگی کے بعد تم یہ تمام امانتیں ان کے مالکوں تک پہنچا دینا، اور اس کے بعد مکہ سے ہجرت کرنا“۔

مشرکین مکہ کے کردار کا یہ عجیب تضاد تھا..... بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ یقیناً ان کے کردار کا یہ ایک بڑا عجبہ تھا کہ ایک طرف تو وہ سب رسول اللہ ﷺ کے خون کے پیاسے تھے اور آپ کی جان کے درپے تھے..... جبکہ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف یہ عجیب صورتِ حالت تھی کہ آپس میں تمام تر محبتوں اور قربتوں کے باوجود وہ باہم ایک دوسرے پر بھروسہ کرنے کیلئے قطعاً تیار نہیں تھے..... پورے شہر مکہ میں اگر انہیں بھروسہ تھا، تو صرف

رسول اللہ ﷺ پر ہی تھا..... اسی لئے اپنی امانتیں وہ سب ہمیشہ بلا خوف و خطر آپ کے پاس ہی رکھوایا کرتے..... اور پھر بے فکر ہو جایا کرتے تھے.....!

اور پھر اس موقع پر رسول اللہ ﷺ کی بے مثال امانت و دیانت بھی قابلِ غور ہے کہ آپ نے لمحہ بھر کیلئے بھی یہ نہیں سوچا کہ میرا یوں گھر سے بے گھر، اور وطن سے بے وطن ہو جانا..... اور یہ تمام تر مشکلات اور یہ نقصانات..... ان سب کی اصل وجہ تو یہی مشرکین مکہ ہی ہیں..... لہذا کیوں نہ میں یہاں سے چلتے چلتے ان کی یہ تمام امانتیں اپنے ہمراہ لیتا چلوں..... تاکہ اس طرح میرے اس نقصان کی کچھ تلافی تو ہو سکے کہ جس کا سبب خود یہی مشرکین مکہ ہی ہیں.....!

لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا..... اور آپ ایسا کس طرح کرتے.....؟ کہ خود آپ نے ہی تو اپنی امت کو یہ سنہری تعلیم دی تھی کہ: (أَدِّ الْأَمَانَةَ إِلَى مَنِ اسْتَمْتَكَ ، وَ لَا تَخُنْ مَنْ خَانَكَ) (۱) ترجمہ: (جس نے تمہارے پاس کوئی امانت رکھوائی ہو، تم اس کی امانت اس کے حوالے کر دو، اور جس کسی نے تمہارے ساتھ خیانت کی ہو، تم اس کے ساتھ ہرگز خیانت نہ کرو)۔

یعنی اگر کوئی تمہارے پاس اپنی کوئی چیز بطور امانت رکھوائے، اس کے بعد جب بھی وہ اپنی امانت کا تم سے مطالبہ کرے، تم بلا چون و چرا فوراً اس کی امانت اصل حالت میں پوری طرح اور بغیر کسی کمی بیشی کے اس کے حوالے کر دو، اگرچہ اس نے کبھی تمہارے ساتھ کوئی خیانت و بددیانتی کی ہو..... لیکن تم جواب میں اس کے ساتھ ایسا نہ کرو،

چنانچہ اپنی امت کیلئے جس طرح رسول اللہ ﷺ کی یہ سنہری اور بے مثال تعلیم تھی، یقیناً آپ

کا اپنا طرزِ عمل اور اخلاق و کردار بھی ایسا ہی بے مثال اور روشن تھا..... آپؐ اپنے بدترین مخالفین اور اپنے جانی دشمنوں کی وہ امانتیں اپنے ہمراہ نہیں لے گئے..... بلکہ وہ تمام تر امانتیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالے کرتے ہوئے انہیں ان کے مالکوں کے حوالے کرنے کی تاکید و تلقین فرمائی۔

امانت و دیانت کے حوالے سے تمام دنیائے انسانیت ایسی روشن مثال پیش کرنے سے ہمیشہ عاجز و قاصر ہی رہے گی.....!

لہذا مسلمان ہونے کی حیثیت سے، اور آپ ﷺ کے امتی اور نام لیوا ہونے کی حیثیت سے ہمارا یہ فرض ہے کہ واقعہ ہجرت کے تعلق سے ہم ”امانت و دیانت“ کے سلسلے میں اپنے گریبان میں جھانکیں..... اپنے ضمیر کو جھنجھوڑیں..... اور اپنے اخلاق و کردار کو ٹٹولیں.....!!

☆..... قیمتی ترین متاع؛ دین و ایمان:

رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے جاں نثار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے رب کے حکم کی تعمیل میں مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی، اس مقصد کیلئے انہوں نے اپنی تجارت، زمیں جائیداد، گھر بار وغیرہ سب ہی کچھ قربان کر دیا، حالانکہ آپ ﷺ نیز آپؐ کے جاں نثار ساتھیوں کو راجح سے برگشتہ کرنے کیلئے مشرکین مکہ نے ”ترہیب“ کے ساتھ ساتھ ”ترغیب“ میں بھی کوئی کسر اٹھانہ رکھی تھی، یعنی ہر قسم کی بدسلوکی، ایذا رسانی، اور ظلم و تعدی کے ساتھ ساتھ..... ہر قسم کا لالچ بھی دیا، مختلف حیلوں بہانوں سے مسلمانوں کو بہکانے اور ورغلانے کی سرتوڑ کوششیں کیں، اور ہر قسم کے حربے آزمائے..... غرضیکہ مسلمان اگر ان مشرکین مکہ کا مطالبہ تسلیم کرتے ہوئے دین اسلام کو ترک کر دیتے، تو نہ صرف یہ کہ ان پر ظلم و تشدد کا سلسلہ بند کر دیا جاتا اور انہیں ان کی دولت اور زمین و جائیداد

سے زبردستی محروم نہ کیا جاتا..... بلکہ اس سے بھی بڑھ کر مزید یہ کہ انہیں بہت کچھ دیا جاتا اور انعام و اکرام سے نوازا جاتا۔

لیکن اس کے باوجود حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا، زندگی بھر کی جمع پونجی راہِ حق میں لٹا کر..... بس ایمان کی دولت کو غاصبوں اور لٹیروں سے بچانے کیلئے وہاں سے ہجرت کر گئے.....

اس سلسلے میں مثالیں تو بہت سی ہیں، لیکن یہاں صرف ایک مثال ذکر کی جا رہی ہے:

حضرت صہیب بن سنان رومی رضی اللہ عنہ جب سفر ہجرت پر روانہ ہونے لگے تو مشرکین مکہ نے ان کا راستہ روکا، اور یوں کہنے لگے کہ ”اے صہیب! تم ملکِ روم سے یہاں خالی ہاتھ آئے تھے، اور پھر یہاں ہمارے شہر مکہ میں رہتے ہوئے تم نے تجارت کی اور یہ تمام روپیہ پیسہ جمع کیا، لہذا تم ہمیں یہاں سے ہرگز جانے نہیں دیں گے“

اس پر انہوں نے جواب دیا کہ ”ٹھیک ہے، میرا تمام روپیہ پیسہ فلاں جگہ موجود ہے..... وہ تم وہاں سے لے لو..... اور مجھے جانے دو“

اس پر وہ مشرکین مکہ خوش ہو گئے اور انہیں جانے کی اجازت دے دی۔

غرضیکہ اس طرزِ عمل سے حضرت صہیب بن سنان رومیؓ نے ہمیشہ کیلئے دنیائے انسانیت کو یہ انمول پیغام دیا کہ مؤمن کیلئے سب سے اہم ترین دولت ایمان کی دولت ہے، کہ سب کچھ لٹا کر بھی اگر اس دولت کو بچا لیا جائے تو یہ بہت بڑے فائدے کا سودا ہے۔

اسی واقعے کی طرف قرآن کریم کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِى نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ رَؤُوفٌ بِالْعِبَادِ﴾ (۱)

ترجمہ: (لوگوں میں سے ایک وہ بھی ہے جو اپنی جان تک فروخت کر دیتا ہے اللہ کی رضا حاصل کرنے کیلئے، اور اللہ تو بندوں پر بڑا ہی مہربان ہے)

یعنی رسول اللہ ﷺ اور آپ کے جاں نثار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی نظر میں دنیا کی ہر دولت سے زیادہ، بلکہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز اور قیمتی ترین متاع ”ایمان“ کی دولت تھی، اور ان کا یہ نظریہ تھا کہ مال و دولت باقی رہے یا نہ رہے، جان بچے یا نہ بچے، مگر ”ایمان“ بہر صورت سلامت رہے۔

چنانچہ واقعہ ہجرت ہمیں دعوتِ فکر دیتا ہے کہ ہم اپنے دلوں کو ٹٹولیں، اپنے گریبانوں میں جھانکیں، اپنی ایمانی کیفیت کا محاسبہ کریں، اور اپنے اخلاق و کردار کا جائزہ لیں، اور اس عظیم اور تاریخی سفر، یعنی ”سفرِ ہجرت“ میں پوشیدہ اس پیغام کو ہمیشہ یاد رکھیں کہ ”ہم جن کے نام لیوا اور امتی ہیں..... جن سے محبت کے ہم دعویٰ دار ہیں..... ان کا نظریہ اور اندازِ فکر تو یہ تھا کہ جو کچھ لٹتا ہے لٹ جائے، مگر ایمان سلامت رہ جائے..... یہی واقعہ ہجرت کا پیغام ہے۔

☆..... ہجرت سے مقصود نئے معاشرے کا قیام:

واقعہ ہجرت کے حوالے سے یہ بات بھی ذہن نشین رکھی جائے کہ رسول اللہ ﷺ، نیز حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مکہ سے مدینہ کی جانب یہ ہجرت محض مشرکین مکہ کے ظلم و استبداد سے نجات اور ان کی ایذا رسانیوں سے فرار کی خاطر نہیں تھی.....

بلکہ ان کی اس ہجرت سے اصل مقصود ایک نئے اور ایسے مثالی معاشرے کا قیام تھا کہ جس کی بنیاد عقیدہ و ایمان، حق و صداقت، اور عدل و انصاف پر ہو، جہاں کسی کے ساتھ کسی قسم کی ظلم و زیادتی، نا انصافی اور حق تلفی کا کوئی تصور نہ ہو، جہاں ہر ایک کی جان و مال اور عزت و آبرو مکمل محفوظ ہو، کیونکہ ایسے مثالی معاشرے کا قیام بھی ضروریاتِ دین میں سے ہے۔

☆..... اسلامی کیلنڈر کا آغاز:

☆ اس دنیا میں جتنی اقوام ہیں اور جتنے مذاہب و ادیان کے پیروکار ہیں ان سبھی کے یہاں کیفیت یہ نظر آتی ہے کہ ان میں سے کسی کے سال کا آغاز ہوتا ہے ان کی کسی اہم ترین اور محبوب و محترم شخصیت کی پیدائش سے، چنانچہ وہ لوگ ہمیشہ نئے سال کی آمد کے موقع پر اس حوالے سے خوشیاں مناتے ہیں۔

اس کے برعکس کسی کا نیا سال شروع ہوتا ہے ان کی کسی اہم شخصیت کی وفات کے دن سے، لہذا یہ لوگ ہمیشہ رونے دھونے اور غم منانے میں ہی مشغول و منہمک رہتے ہیں۔ جبکہ اسلام تو ”اللہ“ کا دین ہے، اور اللہ تو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ کیلئے ہے، نہ اس کی کوئی ابتداء ہے اور نہ ہی اس کی کوئی انتہاء ہے، لہذا اسلامی سال کا تعلق نہ تو کسی کی پیدائش سے ہے اور نہ ہی کسی کی وفات سے..... بلکہ اسلامی سال کا آغاز تو ”واقعہ ہجرت“ سے ہوتا ہے۔

☆ رسول اللہ ﷺ کے مبارک دور میں متعدد ایسے واقعات پیش آئے جو کہ تمام مسلمانوں کیلئے انتہائی مسرت کا باعث بنے..... جبکہ اسی طرح بہت سے ایسے واقعات بھی تو اتر کے ساتھ پیش آتے رہے جو کہ انتہائی رنج و غم اور بڑے صدمے کا سبب بنے۔

لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ اسلامی سال کے آغاز کیلئے مسرتوں سے بھرپور کسی واقعے کا انتخاب نہیں کیا گیا..... کیونکہ ہمیشہ خوشیاں مناتے رہنا اور اصل مقصد سے غافل ہو جانا دین اسلام کے مزاج کے خلاف ہے۔

بعینہ اسی طرح کسی اندوہناک واقعے کو بھی اسلامی سال کے آغاز کیلئے منتخب نہیں کیا گیا، کیونکہ ہمیشہ غم منانا، روتے رہنا، اور پست ہمتی کا شکار ہو جانا بھی یقیناً مسلمان کی شان کے

خلاف ہے۔

لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ ”اسلامی سال“ کا آغاز ”واقعہ ہجرت“ سے کیا گیا، تاکہ ہمیشہ نئے سال کی آمد کے موقع پر وہ قیمتی ترین سبق اور وہ اہم ترین پیغام ذہنوں میں تازہ ہوتا رہے کہ جو اس تاریخی واقعے میں ہمارے لئے پوشیدہ ہے..... یعنی: اللہ پر سچا ایمان، حقیقی توکل، امانت و دیانت کی ضرورت و اہمیت، دین و ایمان کی حفاظت کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی کیلئے ہمہ وقت مستعد رہنے کا جذبہ و شعور، حق کی سر بلندی کی خاطر جہد مسلسل اور سعی پیہم..... نیز ہر قسم کے حالات میں صراطِ مستقیم پر مکمل استقامت کے ساتھ گامزن رہنا.....!

☆ اسلامی کیلنڈر کے آغاز کیلئے ”واقعہ ہجرت“ کے انتخاب کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ یہ اس قدر عظیم الشان اور ایسا بے مثال واقعہ ہے کہ جس کے نتیجے میں اسلامی تاریخ ہمیشہ کیلئے بدل گئی..... دین اسلام جو کہ ہجرت سے قبل محض مکہ شہر کے اندر محصور تھا، اب ہجرت کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے زمان و مکان کی تمام حدود قیود کو توڑتا ہوا مشرق و مغرب میں..... شمال اور جنوب میں..... دنیا کے ہر خطے..... اور ہر گوشے میں جا پہنچا۔

مکہ میں مسلمان انتہائی کمزور اور مظلوم و مجبور تھے، بے بسی و کمپرسی کی زندگی بسر کر رہے تھے، جبکہ ہجرت کے بعد ان کیلئے اب ایک نئی اور بدلی ہوئی زندگی کا آغاز ہوا..... ایسی زندگی جو کہ ان کی کمی زندگی سے یکسر مختلف تھی۔

غرضیکہ ”واقعہ ہجرت“ چونکہ مسلمانوں کیلئے دینی، معاشی، سیاسی..... غرضیکہ ہر لحاظ سے ہمیشہ کیلئے انتہائی خوشگوار تبدیلی کا ”نقطہ آغاز“ ثابت ہوا..... لہذا اسلامی سال کا آغاز بھی واقعہ ہجرت سے ہی کیا گیا۔

نئی زندگی:مدینہ میں دینی، معاشرتی، و سیاسی صورت حال:

رسول اللہ ﷺ نے بعثت سے قبل اپنی حیات طیبہ کے چالیس سال اس دنیا میں گزارے، اور پھر جب آپ کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے نبوت عطاء کی گئی تو اب آپ کی پیغمبرانہ زندگی کا آغاز ہوا، آپ کی یہ پیغمبرانہ زندگی تیس سال کے عرصے پر محیط ہے، جس میں سے ابتدائی تیرہ سال آپ نے مکہ مکرمہ میں گزارے، اور پھر ہجرت کا حکم نازل ہونے پر آپ مکہ سے مدینہ (اُس دور میں جسے یثرب کہا جاتا تھا) ہجرت فرما گئے، جہاں آپ نے اپنی حیات مبارکہ کے آخری دس سال گزارے۔

رسول اللہ ﷺ کی تیرہ سالہ ”مکی زندگی“ کو جس طرح تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا، اسی طرح دس سال کے عرصے پر محیط اس ”مدنی زندگی“ کو بھی تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

☆..... پہلا دور:

مدینہ آمد کے بعد سے سنہ ۶ ہجری میں پیش آنے والے ”صلح حدیبیہ“ کے واقعے تک کا چھ سالہ دور، جس کے دوران چھپے ہوئے اندرونی دشمنوں، نیز بیرونی دشمنوں نے مختلف مشکلات پیدا کیں، متعدد جنگوں کی نوبت آئی، بالآخر ”صلح حدیبیہ“ کے نتیجے میں صورت حال میں تبدیلی رونما ہوئی۔

☆..... دوسرا دور:

صلح حدیبیہ کے بعد دو سالہ دور، اس صلح کی وجہ سے چونکہ رسول اللہ ﷺ نیز آپ کے جاں

نثار ساتھیوں کو مشرکین مکہ کی طرف سے قدرے بے فکری میسر آئی تھی، لہذا اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ ﷺ نے تبلیغِ دین کا فریضہ انجام دیتے ہوئے مختلف سربراہانِ مملکت، فرمانرواؤں، اور حکمرانوں کے نام دعوتی خطوط ارسال فرمائے۔

تاہم یہ امن عارضی ثابت ہوا، مشرکین مکہ کی طرف سے مسلسل عہد شکنی کے نتیجے میں بالآخر دو سال کا عرصہ گزرنے کے بعد سنہ ۸ ہجری میں اس معاہدہ صلح کا خاتمہ ہو گیا۔

☆..... تیسرا دور:

سن ۸ ہجری ماہ رمضان میں فتح مکہ کے تاریخی واقعہ سے سن ۱۱ ہجری ماہ ربیع الاول میں رسول اللہ ﷺ کی اس جہان فانی سے رحلت تک کا تقریباً ڈھائی سالہ دور۔

اس دور میں چونکہ فتح مکہ کے نتیجے میں مشرکین کا غلبہ ختم ہو گیا، ان کی شان و شوکت جاتی رہی..... اور وہ ظاہری و نفسیاتی طور پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے..... جس کے نتیجے میں ملکِ عرب کے طول و عرض میں لوگ فوج در فوج دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے..... دور دراز کے علاقوں سے لوگ بڑی تعداد میں بڑے بڑے فوجی لشکر میں دین اسلام قبول کرنے کیلئے مدینہ آنے لگے..... اس دو سالہ دور میں ان فوجی لشکر کا مستقل تانتا بندھا رہا۔

☆..... نیا معاشرہ:

ہجرتِ مدینہ سے مقصود یہ نہیں تھا کہ محض مشکلات سے نجات کی خاطر کسی ایک جگہ سے دوسری جگہ کی جانب ”نقل مکانی“ کر لی جائے۔

بلکہ اصل مقصود ایک نئے معاشرے کا قیام تھا کہ جس کی بنیاد عقیدہ و ایمان پر ہو، جس کا اپنا کوئی تشخص ہو، کوئی قانون ہو، کوئی دستور ہو..... ورنہ محض ”نقل مکانی“ کی تو کوئی

ضرورت نہیں تھی۔

ہجرت کے بعد اب اس نئی جگہ پر ہر مسلمان کا یہ فرض تھا کہ وہ اس نئے معاشرے کی تشکیل کیلئے محنت و کوشش اور فکر و جستجو کرے، ہر کوئی اپنی ذمہ داری نبھائے اور اپنا فرض پورا کرے..... اور اس سلسلے میں ان سب کے متفقہ قائد اور رہبر و رہنما خود رسول اللہ ﷺ تھے۔

مکی دور میں تمام مسلمان اگرچہ عقیدہ و ایمان کے معاملے میں یقیناً باہم متفق و متحد تھے، لیکن ان کا کوئی مستقل معاشرہ نہیں تھا، وہ سب وہاں متفرق اور منتشر تھے، الگ الگ محلوں اور رستیوں میں..... کسی ایک محلے میں اکا دکا مسلمان..... دور دراز کسی دوسرے محلے میں دو چار مسلمان..... لہذا مکی دور میں مسلمانوں کی کوئی مستقل معاشرتی زندگی نہیں تھی۔

یہی وجہ ہے کہ مکی دور میں قرآن کریم کی جو سورتیں یا جو آیات نازل ہوئیں ان میں صرف ایسی بنیادی تعلیمات تھیں کہ جن پر ہر کوئی اپنی اپنی جگہ انفرادی طور پر عمل کر سکتا تھا، ان میں اجتماعی یا معاشرتی مسائل کا کوئی تذکرہ نہیں تھا۔

لیکن اب یہاں مدینہ میں وہ سب یکجا تھے، آزاد تھے، مکمل خود مختار بھی تھے، اب اس نئے اور آزاد و مکمل خود مختار معاشرے کیلئے نئے قانون، نئے آئین، اور نئے دستور کی ضرورت تھی، کیونکہ اب تو گویا باقاعدہ ایک نئی مملکت وجود میں آچکی تھی..... اس نوزائیدہ مملکت کو کس طرح چلانا ہے؟ یہاں قواعد و قوانین کیا ہوں گے؟ معیشت اور روزگار کے مسائل کا حل کیا ہوگا؟ اندرونی و بیرونی خطرات سے کس طرح بچنا جائے گا؟ جغرافیائی و نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کا کیا انتظام ہوگا؟ نیز اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل..... تجارت، سیاست، معیشت و اقتصاد سے متعلق امور..... وغیرہ..... یقیناً یہ سب کچھ بہت بڑا چیلنج تھا۔

اور پھر مزید یہ کہ اس بڑے چیلنج سے نپٹنے کیلئے اس شہر، اس علاقے، اس ماحول، نیز وہاں آباد لوگوں کے مذہبی، سیاسی، معاشی، و معاشرتی امور اور ان کے پس منظر سے مکمل واقفیت و آگاہی ضروری تھی، تاکہ کوئی بھی قاعدہ و قانون یا آئین و دستور ترتیب دیتے وقت ان تمام امور کو ملحوظ خاطر اور مد نظر رکھا جاسکے۔

چنانچہ اُس وقت مدینہ کے باشندوں کی صورتِ حال کچھ یوں تھی کہ انہیں درج ذیل تین اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

☆.....صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین:

سب سے پہلی قسم کے لوگ رسول اللہ ﷺ کے جاں نثار صحابہ کرام تھے جو آپ کے محض ایک اشارے پر ہمہ وقت اپنا تن من دھن سب ہی کچھ قربان کر دینے کیلئے آمادہ و تیار رہتے تھے۔ پھر ان صحابہ کرام کی دو قسمیں تھیں، مہاجرین و انصار:

☆”مہاجرین“ وہ حضرات تھے جو دراصل مکہ کے باشندے تھے، اور محض اپنے دین و ایمان کی حفاظت کی خاطر اللہ کے حکم کی تعمیل میں اپنا گھربار، اپنا کاروبار..... اور اپنا سبھی کچھ..... مکہ میں چھوڑ کر وہاں سے خالی ہاتھ اور بے سروسامان مدینہ چلے آئے تھے۔

☆ جبکہ ”انصار“ مدینہ ہی کے اصل باشندے تھے اور دین اسلام قبول کر لینے کے بعد بھی بدستور اپنے شہر میں اور اپنے گھروں میں ہی آباد تھے، لہذا (اس لحاظ سے) ان دونوں یعنی مہاجرین و انصار کے حالات کافی مختلف تھے۔

☆.....مقامی مشرکین:

یہ لوگ ابھی تک اپنے آبائی دین یعنی شرک و بت پرستی پر ہی قائم تھے، اور ان کی بھی دو

قسمیں تھیں:

☆ ایک تو وہ لوگ کہ جواب تک، یعنی رسول اللہ ﷺ کی مدینہ منورہ تشریف آوری کے بعد بھی متردد تھے کہ اپنے آباؤ اجداد کے دین پر ہی بدستور قائم رہیں..... یا یہ کہ اب دین اسلام قبول کر لیں.....؟

ایک طرف آباؤ اجداد کے دین سے محبت نے انہیں پریشان کر رکھا تھا، اس دین کو چھوڑ کر کوئی نیا دین اپنالینا ان کی نظر میں گویا اپنے آباؤ اجداد کے ساتھ غداری و بیوفائی کے مترادف تھا..... جبکہ دوسری طرف یہ کہ مدینہ میں اب وہ جہاں جاتے..... جس طرف ان کی نگاہ اٹھتی..... ہر طرف مسلمان ہی نظر آتے..... لہذا اب اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے ان مسلمانوں کے درمیان اجنبی بن کر رہنا بہت مشکل محسوس ہوتا تھا..... یوں یہ لوگ ابتداء میں کچھ عرصہ ذہنی کشمکش میں مبتلا رہے..... اور بڑے تردد کا شکار رہے..... لیکن جلد ہی انہیں شرح صدر ہو گیا اور انہوں نے دین اسلام قبول کر لیا اور یوں ہمیشہ کیلئے بہت ہی اچھے اور سچے مسلمان ثابت ہوئے۔

☆ جبکہ دوسرے وہ لوگ تھے کہ جو اپنے ظاہری و دنیاوی مفادات کی خاطر بظاہر مسلمان ہو گئے..... یعنی یہ ”ابن الوقت“، قسم کے لوگ تھے، اور چڑھتے سورج کے پجاری تھے، کہ دنیاوی مفادات کی خاطر بظاہر مسلمان ہو گئے..... لیکن..... دل ہی دل میں اپنے پرانے دین اور پرانے طور طریقوں کو ہی اچھا سمجھتے رہے..... گویا ”زبان پر کچھ..... اور دل میں کچھ.....“ یوں آئندہ چل کر یہ لوگ ”منافقین“ کہلائے۔

یہ منافقین ہمیشہ رسول اللہ ﷺ کو، نیز دیگر تمام مسلمانوں کو پریشان کرتے رہے، بیرونی دشمنوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کیلئے قدم قدم پر مشکلات پیدا کرتے رہے، اور درپردہ

سازشوں کے جال بنتے رہے..... اور ان تمام منافقین کا سرغنہ ”عبداللہ بن ابی“ تھا۔
 دراصل رسول اللہ ﷺ کی مدینہ منورہ تشریف آوری سے قبل وہاں عرصہ دراز سے صورتِ حال کچھ ایسی چلی آرہی تھی کہ باہمی قبائلی جنگوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا، جس نے مدینہ کے تمام باشندوں کو ہلکان اور ٹڈھال کر رکھا تھا، آپس کی ان خونریزیوں اور تباہ کاریوں سے وہ تنگ آ چکے تھے، اور اب وہ اس مصیبت سے مستقل نجات کا کوئی پائیدار حل چاہتے تھے۔
 آخر غور و فکر کے بعد پہلی بار وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ نسل در نسل چلی آنے والی ان طویل اور خونریز جنگوں کے پیچھے اقتدار کی خواہش کا فرما ہے، اور یہ تمام تر ترسہ کشی محض حصولِ اقتدار کیلئے ہے..... اور تب انہوں نے سوچا کہ ”اقتدار“ کی اس ”ہوس“ سے جان چھڑائی جائے..... اور تمام قبائل متفقہ طور پر کسی ایک شخص کو اپنا ”بادشاہ“ تسلیم کر لیں۔

چنانچہ ان سب نے متفقہ طور پر یہ طے کیا کہ عبداللہ بن ابی ان کا بادشاہ ہوگا..... اور پھر اس کیلئے ایک شاہی تخت کا انتظام کیا گیا..... شاہی تاج بھی تیار کیا گیا..... حتیٰ کہ اس کی تخت نشینی اور تاج پوشی کی تاریخ بھی مقرر کر لی گئی..... اور اس مقصد کیلئے تمام تر انتظامات کر لئے گئے۔

لیکن عین انہی دنوں رسول اللہ ﷺ اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے آبائی شہر مکہ مکرمہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منورہ آپہنچے..... جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عبداللہ بن ابی کا بادشاہ بننے کا وہ خواب ادھورا رہ گیا..... اسے اپنے خواب کی تعبیر مل سکی..... ظاہر ہے کہ اس کیلئے یہ بہت بڑا صدمہ تھا..... لہذا رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کی مدینہ آمد اسے انتہائی ناگوار گذری..... اور پھر بظاہر اسلام قبول کر لینے کے باوجود وہ ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف مکر و فریب اور سازشوں کے تانے بانے میں پیش پیش رہا..... حتیٰ کہ اپنی انہی مذموم

و مکروہ حرکتوں کی وجہ سے ہمیشہ کیلئے ”رئیس المنافقین“ کے لقب سے مشہور ہو گیا۔

☆..... یہود:

مدینہ میں یہودی بڑی تعداد میں آباد تھے، جو کہ دراصل مقامی باشندے نہیں تھے، اصل میں ان کا تعلق ملک شام کے مختلف علاقوں سے تھا، لیکن جب وہاں مختلف جنگوں اور خونریزیوں کے نتیجے میں، اور بالخصوص رومیوں کے غلبہ اور تسلط کے بعد جب وہاں ان کیلئے حالات ناسازگار ہوتے گئے تو وہ اپنا وطن چھوڑ کر پناہ کی تلاش میں ادھر ادھر منتشر ہونے لگے، اسی سلسلے میں بڑی تعداد میں وہ حجاز کے مختلف علاقوں اور بالخصوص خیبر اور مدینہ (جس کا نام اُس وقت یثرب تھا) میں بھی آ کر بس گئے۔

ان کی اصل زبان عبرانی تھی، لیکن انہوں نے رفتہ رفتہ عربی زبان سیکھ لی، مقامی رسم و رواج اور طور طریقے اپنائے، اور یوں لسانی، ثقافتی اور تمدنی لحاظ سے مقامی آبادی میں خوب رچ بس گئے، حتیٰ کہ مقامی آبادی کا ہی ایک حصہ بن گئے۔

یہودیوں کو اپنے دین کی نشر و اشاعت سے کوئی غرض نہیں تھی، کیونکہ وہ خود کو باقی لوگوں سے اعلیٰ و افضل تصور کرتے تھے، لہذا انہیں یہ بات ہرگز قبول نہیں تھی کہ دوسرا کوئی اس شرف اور اعزاز میں ان کے ساتھ حصے دار بنے۔

مقامی لوگوں کو یہ جاہل، گنوار اور حقیر سمجھتے، جب موقع ملتا اپنے مکرو فریب کے ذریعے انہیں لوٹ لیتے، انہیں دھوکہ دیتے، ان کا مال دبا لیتے، ان کا حق چھین لیتے..... اور اس حرکت کو وہ اپنا پیدائشی اور جائز حق قرار دیتے..... حتیٰ کہ ان کی اسی مذموم حرکت کی طرف خود قرآن کریم میں بھی اشارہ کیا گیا: ﴿.....ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِی

الْأَمِّيِّينَ سَبِيلٌ ﴿۱﴾ ترجمہ: (۱)..... یہ اس لئے کہ انہوں نے یہ کہہ رکھا ہے کہ ہم پر ان جاہلوں کے حق کا کوئی گناہ نہیں ہے)

یعنی یہ لوگ پیدائشی طور پر اپنا یہ جائز حق سمجھتے تھے کہ ہم چونکہ دوسروں سے بہت اعلیٰ و افضل ہیں..... اللہ کے بیٹے اور اس کے لاڈلے ہیں..... جبکہ یہ مقامی افراد تو بس جاہل، گنوار..... اور حقیر و کمتر قسم کے لوگ ہیں..... لہذا ہم اگر اپنی عیاری و مکاری کے ذریعے ان کا حق دبا لیتے ہیں..... اور انہیں لوٹ لیتے ہیں..... تو اس میں قطعاً کوئی قباحت نہیں..... کیونکہ یہ تو ہیں ہی اسی قابل کہ ہم انہیں لوٹا ہی کریں.....

اُن دنوں وہاں مدینہ میں ان یہودیوں کے دو پسندیدہ ترین مشاغل تھے، جادو ٹونہ اور تجارت۔

جادو ٹونے میں یہ بہت پینچے ہوئے تھے، بس یہی ان کا شب و روز کا مشغلہ تھا..... حتیٰ کہ خود رسول اللہ ﷺ پر بھی انہوں نے جادو کیا۔

اسی طرح تجارت میں انہیں بڑی مہارت حاصل تھی، اور یہ اس حقیقت سے خوب آگاہ تھے کہ کسی بھی معاشرے پر اپنا تسلط قائم رکھنے کیلئے معاشی برتری بہت ضروری ہے..... جائز و ناجائز ہر قسم کے ہتھکنڈے اپنا کر کسی بھی صورت بس اپنی اجارہ داری اور معاشی برتری قائم رکھی جائے..... دوسروں کو ہر صورت اپنا محتاج بنا کر رکھا جائے..... کوئی کتنا ہی بیہت ناک، خونخوار، اور طاقتور شیر ہی کیوں نہ ہو..... لیکن اگر چند دن کیلئے اس کا دانہ پانی بند کر دیا جائے..... اور اسے بھوکا پیاسا رکھا جائے..... تو وہ خود بخود قابو میں آ جائے گا.....

یہ ان کا اندازِ فکر تھا، اور پھر اسی کے مطابق ان کا طرزِ عمل بھی تھا، لہذا تجارت اور معیشت پر

ان کی خوب مضبوط گرفت تھی۔

مزید یہ کہ مکروفریب، عیاری و مکاری، اور سازشوں کے تانے بنے بننے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

چنانچہ یہ لوگ مقامی افراد کو، اور بالخصوص ان میں سے جو صاحب حیثیت اور قبائلی سردار قسم کے لوگ ہوتے، انہیں یہ جان بوجھ کر ایسی نازیبا حرکتوں اور بری عادتوں پر اُکساتے کہ جن کیلئے مال کی ضرورت ہوتی..... انہیں برائی کا راستہ دکھانے اور بری عادتوں میں مبتلا کر دینے کے بعد اب اس نشے اور برے شوق کی تکمیل کیلئے انہیں سود پر روپیہ پیسہ بھی مہیا کرتے..... اور یوں ان کی اخلاقی و معاشرتی بربادی کے ساتھ ساتھ..... مالی طور پر بھی انہیں مفلس و کنگال کرتے چلے جاتے..... اور اپنے شکنجے میں کستے چلے جاتے.....!

اس کے علاوہ یہ کہ یہ یہودی مختلف مقامی قبائل کو آپس میں لڑواتے، خود خفیہ اور پس پردہ رہتے ہوئے ان میں باہمی اختلافات اور فتنوں کو ہوا دیتے، جس کے نتیجے میں عرصہ دراز تک جاری رہنے والی بڑی خونریز جنگوں کی نوبت آتی، اور ان جنگوں کیلئے مقامی افراد کو اسلحہ کی جب ضرورت پیش آتی تو اسلحہ و دیگر سامان جنگ خریدنے کی غرض سے یہ یہودی انہیں بڑی بڑی رقیں سودی قرض پر مہیا کرتے..... اور یوں مقامی افراد آپس میں لڑتے لڑتے مسلسل کمزور و ناتواں ہوتے چلے جاتے، اپنے تمام تر وسائل ان تباہ کن جنگوں کی آگ میں جھونک دیتے..... جبکہ یہودی اپنی صفوں میں اتفاق و اتحاد اور اپنی بستیوں میں امن و امان کی وجہ سے مضبوط سے مضبوط تر ہوتے چلے جاتے..... نیز اس سودی قرضے کی وجہ سے مقامی افراد مسلسل محتاج و کنگال..... جبکہ یہودی اپنی تجوریاں بھرتے چلے جاتے.....!

اس صورتِ حال میں رسول اللہ ﷺ و دیگر مسلمانوں کی جب مکہ سے مدینہ آمد ہوئی تو یہ چیز یہودِ مدینہ کو سخت ناگوار محسوس ہوئی، ان کی کتابوں میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں جو تذکرہ تھا، اور جو واضح نشانیاں بیان کی گئی تھیں..... ان کی وجہ سے وہ دینِ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی حقانیت و صداقت سے بخوبی آگاہ تھے..... لیکن اس کے باوجود محض اپنی ضد اور عناد اور حبِ باطن کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں سے سخت نالاں تھے اور ہر وقت عداوت و مخالفت پر آمادہ و کمر بستہ رہتے تھے۔

☆..... ان داخلی اور اندرونی پریشانیوں کے علاوہ مزید یہ کہ مسلمان ابھی مدینہ میں سکھ کا سانس بھی نہ لینے پائے تھے کہ مشرکین مکہ کے بارے میں مسلسل ایسی خبریں آنے لگیں کہ وہ خوب زور و شور کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف لشکر کشی کی تیاریوں میں مشغول ہیں، تاکہ مدینہ میں مسلمانوں کے سنبھلنے اور پھلنے پھولنے سے پہلے ہی ان کا خاتمہ کر دیا جائے.....

لہذا مدنی زندگی میں مسلمانوں کو ابتداء سے ہی اندرونی خفیہ دشمنوں (یعنی منافقین اور یہود) کے علاوہ مزید یہ کہ مشرکین مکہ کی طرف سے بھی بڑے اندیشے اور تشویش کا سامنا تھا۔ یہ تھے وہ حالات..... اور یہ تھے وہ اندرونی و بیرونی خطرات جن کے درمیان رسول اللہ ﷺ نے اس نوزائیدہ اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی۔



الحمد للہ آج بتاریخ ۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ، مطابق ۱۸/ مارچ ۲۰۱۳ء بروز پیر یہ باب مکمل ہوا۔
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ، وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

نئے معاشرے کی تشکیل کیلئے

فوری اقدامات

رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں نئے معاشرے کی تشکیل اور اس نوزائیدہ اسلامی ریاست کی تاسیس کی غرض سے چند فوری اور بنیادی قسم کے اقدامات کئے جن کے اثرات و ثمرات آئندہ چل کر انتہائی مفید اور دور رس ثابت ہوئے۔

☆..... مسجد نبوی کی تعمیر:

رسول اللہ ﷺ ہجرت کے موقع پر جب مکہ سے سفر کرتے ہوئے مدینہ منورہ تشریف لائے تھے، اُس موقع پر آپ کی اونٹنی مختلف گلیوں، محلوں، نیز مختلف قبائل کے مساکن میں سے گذرتی ہوئی مسلسل آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی، راستے میں بار بار لوگ دیوانہ وار آگے بڑھ کر اس اونٹنی کو روکنے کی کوشش کرتے اور اور انتہائی عقیدت و محبت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں گزارش کرتے کہ ”اے اللہ کے رسول! بس یہیں ہمارے محلے میں رُک جائیے..... ہمیں خدمت کا موقع عنایت فرمائیے..... لیکن آپ بار بار یہی ارشاد دہراتے:

”دَعُوَهَا فَإِنَّهَا مَأْمُورَةٌ“ یعنی ”اسے چھوڑ دو، یہ اللہ کے حکم سے چل رہی ہے“

بالآخر چلتے چلتے وہ اونٹنی مدینہ کے مشہور خاندان ”بنو نجار“ کے محلے میں ایک جگہ جا کر رُک گئی تھی، اور پھر کچھ دیر ادھر ادھر گردن گھمانے کے بعد اسی جگہ بیٹھ گئی تھی..... اور یہ جگہ حضرت ابوالیوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر کے دروازے کے عین سامنے تھی۔

مدینہ منورہ میں چند دن گزرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے جب مسلمانوں کیلئے روزانہ

پانچ وقت کی نماز باجماعت کی ادائیگی کی غرض سے مسجد کی تعمیر کا فیصلہ فرمایا تب اس مقصد کیلئے جس جگہ کا انتخاب کیا گیا، اتفاقاً یہ وہی جگہ تھی کہ جہاں آپ کی اونٹنی آکر رُک جاتی تھی۔ چنانچہ تعمیر مسجد کے مبارک کام کا آغاز کیا گیا، اس کام میں رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کرام کے شانہ بشانہ مستقل طور پر بنفس نفیس شریک رہے..... آپ اس موقع پر لکڑی، پتھر، مٹی وغیرہ دیگر سامانِ تعمیر اپنے کندھوں پر اٹھا کر ادھر ادھر لے جاتے رہے..... غرضیکہ تعمیر مسجد کے اس مشکل اور کٹھن کام میں آپ ابتداء سے انتہاء تک خود شریک رہے۔

☆ رسول اللہ ﷺ کی ہر بات میں اس قدر تاثیر کیوں تھی؟ آپ کی ہر بات فوراً مخاطب کے دل کی گہرائیوں میں کیوں اتر جاتی تھی؟ اس کی بہت بڑی وجہ یہی تھی کہ آپ کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں تھا، آپ جب بھی دوسروں کو کسی کام کا حکم دیتے تو سب سے پہلے خود وہ کام انجام دیتے..... دوسروں سے پیش پیش رہتے..... اور یوں آپ کے قول و فعل میں مکمل مطابقت کی وجہ سے لوگ آپ کی گفتگو سے..... آپ کی شخصیت سے..... اور آپ کی تعلیمات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے.....!

قول و فعل میں مطابقت کے اسی زریں اصول کا عملی نمونہ ہمیں ”تعمیر مسجد“ کے موقع پر بھی خوب واضح نظر آتا ہے کہ آپ دوسروں کو اس کام میں شرکت کی ترغیب دینے کے بعد خود کسی ایک جگہ آرام سے بیٹھ نہیں گئے..... بلکہ آپ بنفس نفیس اس کام میں شریک رہے..... دوسروں سے آگے آگے رہے..... یہی وجہ تھی کہ آپ کو اس طرح محنت و مشقت کرتے ہوئے دیکھ کر صحابہ کرام کے دلوں میں بھی جذبہ تازہ ہو جاتا..... ہمتیں بلند ہو جاتیں..... تھکاوٹ سے چور ہو جانے کے باوجود وہ خوب ہنسی خوشی اور انتہائی ذوق و شوق اور دلجمعی کے ساتھ اس مقدس کام میں لگن رہتے..... اور اسی موقع پر ان میں سے

کسی نے یہ یادگار شعر کہا تھا:

لَئِنْ قَعَدْنَا وَ النَّبِيُّ يَعْمَلُ لَذَاكَ مِنَّا الْعَمَلُ الْمُضَلَّلُ

یعنی ”ہم اگر اپنی جگہ بیٹھے رہیں جبکہ ہماری آنکھوں کے سامنے اللہ کے نبی ﷺ کا کام کاج اور محنت و مشقت میں مشغول رہیں یقیناً یہ تو بہت ہی بڑی گمراہی ہوگی!.....“

چنانچہ اسی طرح محنت و مشقت اور ایسے ہی بے مثال جذبے کے ساتھ تعمیر مسجد کا مبارک کام انجام دیا گیا اور یہ کام بخیر و خوبی پایہ تکمیل کو پہنچا۔

اس مسجد کی عمارت بہت ہی سیدھی سادھی تھی، فرش ریت اور کنکریوں کا تھا چھت کھجور کے پتوں کی ستون کھجور کے تنوں کے جبکہ دیواریں کچی تھیں جب کبھی بارش ہوتی تو چھت ٹپکنے لگتی، اور پیروں میں کچھ نمازیوں کیلئے پریشانی کا باعث بن جاتا۔

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ میں اپنی تشریف آوری کے فوری بعد جو تعمیر مسجد کا کام انجام دیا، اور پھر اس کام میں بنفس نفیس خود بھی شرکت فرمائی یقیناً اس سے اسلامی معاشرے میں مسجد کی اہمیت و ضرورت واضح ہوتی ہے حقیقت یہ ہے کہ مسجد اسلامی معاشرے کی پہچان ہے، جہاں کہیں مسلمانوں کی کوئی بستی ہوگی، وہاں مسجد ضرور نظر آئے گی!.....

مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ کی تعمیر فرمودہ یہ مسجد مسلمانوں کیلئے عبادت گاہ بھی تھی روحانی و مادی علوم کی عظیم درس گاہ بھی داخلی و خارجی تعلقات کی تعلیم و تربیت کا ادارہ بھی اور عسکری تربیت کا مرکز بھی اس مسجد کے سامنے آج کے بڑے بڑے علمی و ثقافتی و عسکری ادارے ہیچ ہیں اور اسی مسجد سے ہی علم و معرفت کا اور نور کا وہ سیلاب پھوٹا کہ جس کی شعاعوں نے ساری دنیا کو منور کر دیا!.....!!

☆.....مواخاۃ:

مدنی زندگی کے آغاز میں دوسرا جو فوری اور اہم ترین اقدام کیا گیا وہ ”مواخاۃ“ تھا، جس کے لفظی معنی ہیں ”آپس میں بھائی بھائی بنا دینا“۔

رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں میں سے کچھ مہاجرین تھے، جن کا تعلق شہر مکہ سے تھا، اور جو محض اپنے دین و ایمان کی حفاظت کی خاطر اپنا شہر اپنا گھربار اپنا کاروبار اپنی زمین جائیداد اور اپنا سبھی کچھ مکہ میں چھوڑ کر اللہ و رسول ﷺ کے حکم کی تعمیل میں خالی ہاتھ مدینہ چلے آئے تھے، جو اصل میں مفلس و نادار نہیں تھے، وہاں مکہ میں ان کے پاس سبھی کچھ تھا، ان میں سے اکثر وہاں اپنے گھروں میں خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے تھے، لیکن اب یہ افراد جب خالی ہاتھ مدینہ پہنچے تو ان کی فوری آباد کاری اور ان کیلئے بنیادی ضروریات کی فراہمی یقیناً بہت بڑا مسئلہ تھا۔

قرآن کریم میں انہی حضرات کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا وَ يَنْصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ﴾ (۱) ترجمہ: (اُن مہاجر مسکینوں کیلئے جو اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے نکال دیئے گئے ہیں، وہ اللہ کے فضل اور اس کی رضامندی کے طلبگار ہیں، اور اللہ کی اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی سچے لوگ ہیں)

اس آیت میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے حضرات مہاجرین کی فضیلت، ان کا مقام و مرتبہ ان کا اخلاص، اور ان کا سچا اور حقیقی مومن ہونا بیان کیا گیا ہے..... ظاہر ہے کہ یہ

بہت بڑی بات ہے.....!

جبکہ اس کے فوری بعد اگلی آیت میں خالق ارض و سماء کی طرف سے انصارِ مدینہ کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: ﴿وَالَّذِينَ تَبَوَّؤُا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُورِهِمْ حَاجَةً مِمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُوقِ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (۱) ترجمہ: (اور وہ لوگ جنہوں نے اس گھر (مدینہ) میں اور ایمان میں ان سے پہلے جگہ بنالی ہے، اور وہ اپنی طرف ہجرت کر کے آنے والوں سے محبت کرتے ہیں، اور مہاجرین کو جو کچھ دے دیا جائے اُس پر وہ اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہیں رکھتے، بلکہ خود اپنے اوپر انہیں ترجیح دیتے ہیں، گو خود کتنے ہی سخت ضرورت مند ہوں، بات یہ ہے کہ جو کوئی بھی اپنے نفس کے بخل سے بچایا گیا وہی کامیاب و بامراد ہے)

اس آیت میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے انصارِ مدینہ کے بے مثال جذبہٴ ایثار کی تعریف بیان کی گئی ہے کہ یہ حضرات خود تنگی و محتاجی کے باوجود جو کچھ انہیں میسر آتا ہے سبھی کچھ اپنے مہاجر بھائیوں کیلئے قربان کر دیتے ہیں..... اس سلسلے میں اپنے دلوں میں ذرہ برابر تنگی و انقباض اور ناگواری محسوس نہیں کرتے..... انہوں نے تو ان مہاجرین کی مدینہ آمد سے قبل ہی ایمان بھی تیار کر رکھا تھا..... اور ان کیلئے ٹھکانہ بھی تیار کر رکھا تھا..... غرضیکہ انصارِ مدینہ نے اپنے مہاجر بھائیوں کو اپنے گھروں میں جگہ دی..... اپنے دلوں میں بسایا، سر آنکھوں پر بٹھایا..... اپنا سب کچھ ان کے حوالے کر دیا..... ان کیلئے اپنے گھروں کے دروازے بھی کھول دیئے..... اور..... اپنے دلوں کے دروازے بھی کھول دیئے..... اور

ہمدردی و ایثار کے ایسے نمونے پیش کئے کہ تاریخِ عالم میں اس کی مثال نہیں مل سکے گی.....!!

☆..... انصار کے دلوں میں اپنے مہاجر بھائیوں کیلئے ایثار کا یہ بے مثال جذبہ اپنی جگہ..... لیکن حقیقت کی دنیا میں محض جذبات سے کام نہیں چلتا..... محض جذبات سے نہ کسی کا پیٹ بھر سکتا ہے..... اور نہ ہی گھروں کے چولھے جل سکتے ہیں..... اس چیز کیلئے تو حقیقت کو مد نظر رکھنا پڑتا ہے..... اور اُس وقت حقیقت یہی تھی کہ انصارِ مدینہ بہت زیادہ خوش حال نہیں تھے..... ان کے مالی حالات ایسے نہیں تھے کہ اُن پر مہاجرین کا اضافی بوجھ بھی ڈال دیا جائے..... یہی وہ حقیقت تھی جسے مد نظر رکھتے ہوئے اُس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے انصار پر بہت زیادہ بوجھ نہیں ڈالا..... بلکہ بہت ہی ہلکی پھلکی سی ذمہ داری ہر انصاری کو سونپی..... یعنی ہر ایک انصاری کے ذمے اپنے صرف ایک مہاجر بھائی کی ذمہ داری۔ اور یوں آپؐ نے مہاجرین و انصار کے درمیان تاریخی ”رشتہٴ مَوَاخَاة“ قائم فرمایا، یعنی ایک انصاری کو ایک ایک مہاجر کا بھائی بنا دیا..... یوں آپؐ نے مہاجرین و انصار کو ہمیشہ کیلئے اس بے مثال اُخوت کے رشتے میں پرو دیا۔

☆..... اس تاریخی موقع پر جہاں انصار کا اپنے مہاجر بھائیوں کیلئے جذبہٴ ہمدردی و ایثار قابلِ ذکر ہے..... وہیں مہاجرین کا یہ اعلیٰ ترین اخلاق، ان کے دلوں میں یہ احساس، اور ان کا یہ جذبہٴ بھی آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے کہ انہوں نے انصار کی اس خوش اخلاقی اور شرافت سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی کہ بس ہمیشہ کیلئے ”مفت خورے“ بن کر..... اور انصار پر بارِ گراں بن کر..... اسی طرح انہی کے گھروں میں بیٹھے رہتے..... ایسا کرنے کی بجائے حضراتِ مہاجرین نے ”مَوَاخَاة“ کے اس رشتے میں بندھنے کے بعد

اپنے انصاری بھائیوں کا دل و جان سے شکریہ ادا کیا..... اور پھر فوراً ہی رزق حلال کیلئے تلاش و جستجو اور جدوجہد میں مشغول و منہمک ہو گئے..... ان میں سے ہر کوئی جلد از جلد خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوششوں میں لگ گیا..... یوں شب و روز کی مسلسل محنت و مشقت اور تگ و دو کے نتیجے میں وہ سب اپنا بوجھ خود اٹھانے کے قابل ہو گئے.....!!

☆..... یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مدینہ میں اوس و خزرج و دیگر قبائل سالہا سال سے باہم برسرِ پیکار تھے، ان میں نسل در نسل خونریزیوں کا اور تباہ کاریوں کا ایک لامتناہی سلسلہ چلا آ رہا تھا..... ان کی باہم دشمنی ضرب المثل تھی.....

لیکن اب کلمہ ”لا الہ الا اللہ“ پر ایمان کی بدولت..... ان کی صورتِ حال یکسر بدل گئی..... پہلے جن کی دشمنی ضرب المثل تھی..... اب ان کا ”ایثار“ ہمیشہ کیلئے ضرب المثل بن گیا..... پہلے ایک ہی شہر (مدینہ) کے باشندے ہونے کے باوجود وہ آپس میں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے..... لیکن اب مسلمان ہو جانے کے بعد نہ صرف یہ کہ آپس میں بھائی بھائی بن گئے..... بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ بہت دور دراز..... یعنی مکہ سے آئے ہوئے مہاجرین کے ساتھ بھی وہ اُخوت و محبت کے ایسے بے مثال اور لازوال رشتے میں بندھ گئے کہ انسانی تاریخ میں شاید ایسی کوئی اور مثال نہیں مل سکے گی۔ یقیناً یہ ”اللہ پر سچے اور حقیقی ایمان“ ہی کا کرشمہ تھا، اور یہ چیز آج تمام امتِ مسلمہ کو ”دعوتِ غور و فکر“ دے رہی ہے۔

☆..... میثاقِ مدینہ:

مدنی زندگی کے آغاز میں تیسرا جو فوری اور اہم ترین اقدام کیا گیا وہ ”میثاقِ مدینہ“ کے نام سے معروف معاہدہ تھا جو رسول اللہ ﷺ نے اُس وقت وہاں موجود دیگر اقوام، خصوصاً یہود کے ساتھ کیا، یہ معاہدہ دولتِ اسلامیہ کے قیام کی طرف پیش قدمی کے سلسلے میں اہم

ترین اقدام کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس معاہدے میں تمام شرکائے معاہدہ کے حقوق و فرائض کا تعین کیا گیا اور اس سے متعلق تمام تفصیلات طے کی گئیں، گویا یہ معاہدہ بنیادی دستور کی حیثیت رکھتا تھا۔

نیز اس معاہدے میں یہ بھی طے کیا گیا کہ تمام شرکائے معاہدہ باہم مل جل کر رہیں گے، ایک دوسرے کا مکمل احترام کریں گے، ایک دوسرے کیلئے ہمیشہ نیک نیتی، خلوص اور خیر سگالی کا اظہار کریں گے، آپس میں ایک دوسرے کے خلاف کسی قسم کی کوئی سازش نہیں کریں گے، ایک دوسرے کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔

یہی وجہ تھی کہ اس معاہدے کو ”معاہدہ صلح“، نیز ”معاہدہ عدم جارحیت“ کے نام سے بھی تاریخ میں یاد کیا جاتا ہے۔

نیز یہ بھی طے کیا گیا کہ کسی بھی بیرونی دشمن کی طرف سے حملے کی صورت میں تمام شرکائے معاہدہ مشترکہ طور پر دفاع کریں گے۔

مدنی زندگی کے آغاز اور دولتِ اسلامیہ کے قیام کے بالکل ابتدائی دنوں میں ہی رسول اللہ ﷺ نے اس معاہدے کے ذریعے مدینہ میں موجود دیگر تمام اقوام کیلئے اپنی طرف سے نیک نیتی اور خیر سگالی کا اظہار فرمایا، نیز تمام دنیا کو روزِ اول سے ہی یہ پیغام دے دیا کہ دینِ اسلام مل جل کر رہنے کا سبق سکھاتا ہے، دینِ اسلام بقائے باہمی، تحمل، برداشت، اور رواداری کی تاکید و تلقین کرتا ہے.....

رسول اللہ ﷺ نے اس معاہدے کے ذریعے روزِ اول سے ہی دیگر تمام اقوام کے ساتھ مل جل کر رہنے کے اس اصول کو اپناتے ہوئے نئے دور کا آغاز فرمایا.....

لیکن دوسری طرف نیک نیتی یا خیر سگالی کے جذبات کا کوئی نام و نشان تک نظر نہیں آتا تھا،

بلکہ وہاں تو مسلسل خفیہ سازشوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا..... جس نے مرورِ وقت کے ساتھ رفتہ رفتہ بڑے فتنوں کی شکل اختیار کر لی۔



الحمد للہ آج بتاریخ ۱۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ، مطابق ۲۴/ مارچ ۲۰۱۳ء بروز اتوار

یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ، وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

مشرکین مکہ کے خلاف غزوات

کا مختصر تذکرہ اور تنقیدی جائزہ:

رسول اللہ ﷺ نے تو ”بقائے باہمی“ کے سنہری اصول کو اپناتے ہوئے مدنی زندگی کے بالکل آغاز میں ہی ”ميثاقِ مدینہ“ کے ذریعے وہاں آباد غیر مسلم اقوام کیلئے جذبہ خیر سگالی کا اظہار فرمایا، لیکن افسوس کہ دوسری طرف مسلمانوں کیلئے کوئی خیر سگالی نہیں تھی، بلکہ وہاں تو شب و روز مسلمانوں کے خلاف نفرتوں اور سازشوں کے تانے بانے بنے جا رہے تھے، اور اس سلسلے میں سب سے زیادہ افسوس ناک اور قبیح ترین کردار ”رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی“ کا تھا۔

انہی نامساعد حالات میں مزید پریشانی یہ کھڑی ہو گئی کہ رسول اللہ ﷺ کو باوثوق ذرائع سے یہ اطلاع ملی کہ ادھر مکہ میں مشرکین بھی مسلسل مسلمانوں کے خلاف جلد از جلد کوئی فیصلہ کن اقدام کرنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کیلئے زور و شور کے ساتھ منصوبہ بندی کی جا رہی ہے، کیونکہ مشرکین کو یہ بات ہرگز گوارا نہیں تھی کہ مسلمان ان کے شکار سے نکلنے کے بعد اب مدینہ میں جا کر سکون و اطمینان کی زندگی بسر کریں، وہاں پھلتے پھولتے رہیں اور ان کی قوت میں اضافہ ہوتا چلا جائے، بالخصوص انہیں اُس تجارتی شاہراہ کی وجہ سے بہت زیادہ پریشانی لاحق تھی کہ جس پر سفر کرتے ہوئے ان کے تجارتی قافلے مکہ سے ملکِ شام آتے جاتے تھے، اور وہ شاہراہ مدینہ کے قریب سے گذرتی تھی۔

ایسی ہی صورت حال میں ایک روز مشرکین مکہ کے چند سرداروں کی طرف سے مدینہ میں ”رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی“ کو ایک خط موصول ہوا، جس میں مشرکین مکہ کی طرف سے

اسے خبردار کرتے ہوئے یہ تحریر کیا گیا تھا کہ ”ہم یہ بات ہرگز برداشت نہیں کر سکتے کہ محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھی ہمارے شہر مکہ سے نکلنے کے بعد اب تمہارے شہر مدینہ میں چین و سکون کی زندگی بسر کریں اور پھلتے پھولتے رہیں..... لہذا تم سے ہمارا یہ پرزور مطالبہ ہے کہ تم ان مسلمانوں کو جلد از جلد اپنے شہر سے نکال باہر کرو..... اور اگر تم نے ہماری اس ہدایت پر عمل نہ کیا تو یاد رکھو..... ہم بہت جلد تمہارے شہر پر تباہ کن حملہ کریں گے..... اور تب صرف مسلمانوں کو ہی نہیں..... ان کے ساتھ ساتھ تم سب کو بھی ہم مدینہ سے نکال باہر کریں گے۔“

اس خط میں مشرکین مکہ کی طرف سے مدینہ میں موجود منافقین و یہود کو بظاہر اگرچہ ”دھمکی“ دی گئی تھی..... لیکن درحقیقت یہ ان کیلئے ”دھمکی“ نہیں..... بلکہ بہت بڑی خوشخبری تھی..... کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ و دیگر مسلمانوں کی مدینہ آمد سے انتہائی نالاں اور ناخوش تھے، اور چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ لوگ مدینہ سے نکل جائیں..... اور پھر ہمارے وہی پرانے دن لوٹ آئیں..... اور اس مقصد کیلئے ان کی دلی خواہش تھی کہ کاش انہیں کسی بڑی قوت کی پشت پناہی حاصل ہو سکے۔

لہذا اب مشرکین مکہ کی طرف سے جب انہیں یہ دھمکی موصول ہوئی تو انہوں نے اسے دھمکی کی بجائے اپنے لئے بہت بڑی خوشخبری سمجھا..... اور اب مسلمانوں کے خلاف یہ اندرونی دشمن اور بیرونی دشمن دونوں متحد اور یکجا ہو گئے، اور پھر ان بدلے ہوئے حالات میں مسلسل ایسے ٹھوس ثبوت پے درپے شواہد و دلائل اور آثار و قرائن نظر آتے رہے جن کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو مکمل یقین ہو گیا کہ یہ اندرونی و بیرونی دشمن مل کر کسی بھی وقت مسلمانوں کیلئے کوئی بڑی مشکل پیدا کر سکتے ہیں، نیز یہ کہ اس گٹھ جوڑ کے نتیجے میں مشرکین مکہ کسی بھی

وقت مدینہ پر کوئی بڑا اور اچانک حملہ کر سکتے ہیں۔

ایسی صورتِ حال میں رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنے ساتھیوں سے مشورے کے بعد کسی بھی مشکل کا سامنا کرنے کیلئے تیاریاں شروع کر دیں..... اور آپ ﷺ و دیگر تمام مسلمان ذہنی طور پر اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ اپنی حفاظت و سلامتی کیلئے جو کچھ بن پڑے گا وہ ضرور کریں گے..... خواہ اس مقصد کیلئے ہتھیار اٹھانا پڑیں..... یا میدان میں نکل کر باقاعدہ جنگ لڑنی پڑے.....!

غزوہ بدر:

چنانچہ ایسے ہی حالات میں ہجرت کے بعد دوسرے ہی سال مشرکین مکہ کا ایک لشکر جو کہ ہر قسم کے سامانِ حرب و ضرب سے مسلح تھا، مسلمانوں پر حملے کی غرض سے مدینہ کی جانب روانہ ہوا، رمضان کے مبارک مہینے میں مدینہ شہر سے کچھ فاصلے پر واقع ”بدر“ نامی مقام پر مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان یہ پہلی باقاعدہ جنگ تھی، عجب کیفیت تھی، ایک طرف ایک ہزار آزمودہ کار جنگجو..... سامانِ جنگ کی بہتات..... جبکہ دوسری طرف محض مٹھی بھر..... تین سو تیرہ افراد..... جنہیں سامانِ جنگ کی شدید قلت کا سامنا تھا..... اس مختصر سی بے سرو سامان جماعت کو کسی صورت ”فوج“ نہیں کہا جاسکتا تھا.....!

لیکن جب جنگ شروع ہوئی تو ”ساز و سامان“ اور ”کثرتِ تعداد“ کی بجائے مسلمانوں کا اپنے اللہ پر خالص ایمان، سچا توکل، اور جذبہٴ سرفروشی کام آیا..... چنانچہ انہوں نے انتہائی شجاعت و بہادری اور ثابت قدمی کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کیا..... جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرکین مکہ کے پاؤں اکھڑ گئے..... ان کے متعدد بڑے بڑے سردار اور نامی گرامی قسم کے

شہسوار اس جنگ میں مارے گئے، اور وہ بہت زیادہ جانی و مالی نقصان اٹھانے کے بعد میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

یوں مسلمانوں کے حق میں اس جنگ کا بہت ہی اچھا نتیجہ برآمد ہوا، جبکہ مشرکین مکہ کی صفوں میں صفِ ماتم بچھ گئی..... اور وہ بدترین شکست و ہزیمت اور ذلت و رسوائی کا داغ لئے ہوئے وہاں سے واپس مکہ کی جانب روانہ ہوئے۔

غزوہ اُحد:

مٹھی بھر مسلمانوں کے ہاتھوں اس بدترین شکست اور ذلت و رسوائی کی وجہ سے مشرکین مکہ کے دلوں میں چونکہ انتقام کے شعلے خوب بھڑک رہے تھے..... اس لئے ان سے زیادہ عرصہ صبر نہ ہوسکا..... اور اگلے ہی سال پہلے سے بہت زیادہ تیاری اور جوش و خروش کے ساتھ وہ مسلمانوں کو نیست و نابود کر دینے کی غرض سے مدینہ کی جانب روانہ ہوئے..... ہجرت کے تیسرے سال شوال کے مہینے میں مدینہ شہر کے مضافات میں واقع ”اُحد“ نامی مشہور و معروف پہاڑ کے دامن میں یہ دوسری جنگ لڑی گئی، اس موقع پر دشمن کی تعداد تین ہزار تھی جبکہ ان کے مقابلے میں مسلمان صرف سات سو تھے..... لیکن اس کے باوجود مسلمانوں نے اللہ پر توکل کرتے ہوئے بہادری کے ایسے جوہر دکھائے کہ دشمن کے چھکے چھوٹ گئے..... اور یوں گویا مسلمانوں کی فتح یقینی ہو گئی..... لیکن وہ ”تیر انداز“ جنہیں رسول اللہ ﷺ نے ایک پہاڑی راستے پر مقرر فرمایا تھا، انہوں نے جب دیکھا کہ دشمن شکست کھا کر بھاگ رہا ہے..... تو وہ اپنی جگہ سے اتر آئے..... اُدھر بھاگتے ہوئے دشمن نے جب یہ منظر دیکھا تو موقع غنیمت جانتے ہوئے پلٹ کر مسلمانوں پر عقب سے پوری قوت کے ساتھ حملہ کر دیا

اور یوں صورتِ حال یکسر بدل کر رہ گئی..... جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو شدید پریشانی کا اور بڑے نقصان کا سامنا کرنا پڑا.....

البتہ ”اُحد“ کے موقع پر مسلمانوں کی یہ ”بھول“ انہیں ہمیشہ کیلئے یہ ناقابلِ فراموش ”سبق“ سکھا گئی کہ انہیں ہر حال میں اللہ اور رسول ﷺ کے حکم کی تعمیل کرنا چاہئے..... ورنہ نتیجہ ایسا ہی برآمد ہوگا.....!

غزوہ خندق:

اسی طرح ہجرت کے پانچویں سال پیش آنے والے ”غزوہ خندق“ (جسے ”احزاب“ بھی کہا جاتا ہے) کے موقع پر صورتِ حال یہ ہوئی کہ ”غزوہ اُحد“ کے محض دو سال بعد مشرکین مکہ دوبارہ آئے، اور اس بار مسلمانوں کو ہمیشہ کیلئے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا پختہ عزم لے کر آئے، اس موقع پر ان کی تعداد دس ہزار تھی، رسول اللہ ﷺ نے حفاظتی تدابیر کے سلسلے میں اپنے صحابہ کرام سے مشورہ فرمایا، آخر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورے پر مدینہ شہر کے اطراف میں کافی وسیع و عریض اور گہری خندق کھودی گئی، اس مشکل ترین اور انتہائی پُر مشقت کام میں آپ ﷺ بنفسِ نفیس اپنے جاں نثار ساتھیوں کے شانہ بشانہ شریک رہے، بلکہ پیش پیش رہے۔

مشرکین کا لشکر جب وہاں پہنچا تو ”خندق“ کو دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گئے، اور لاکھ لاکھ کوشش کے باوجود وہ اسے پار نہ کر سکے، بس خندق کے اُس پار سے ہی تیروں کی بارش برساتے رہے، اور مدینہ شہر کا محاصرہ کر کے بیٹھ گئے۔ اس جان لیوا محاصرے نے جب طول پکڑا تو مدینہ شہر کے اندر اشیائے خورد و نوش کی شدید قلت ہونے لگی۔ مسلمانوں کو جب بھوک اور

پیارا ستاتی تو اس تکلیف کی شدت کو کم کرنے کیلئے پیٹ پر پتھر باندھ لیتے..... تاکہ بھوک کی یہ شدت ان کے عزم و استقلال کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکے..... اور یونہی شب و روز گذرتے رہے۔

آخر ایک رات بہت تیز آندھی آئی، طوفانی جھکڑ پوری طاقت سے چلنے لگے، سخت سردی کا موسم تھا، اوپر سے ایسی سیاہ اور بھیا نک رات..... اور پھر تیز رفتار آندھی اور گرد و غبار کا ایسا خوفناک طوفان آیا..... کہ..... ان کے خیمے اکھڑ گئے، برتن الٹ گئے، کھانے پینے کا تمام سامان ریت میں مل گیا، خالی برتن ہوا میں اڑ اڑ کر ان کے سروں سے ٹکرانے اور انہیں زخمی کرنے لگے..... گھوڑے اور اونٹ بدحواس ہو کر..... اور رسیاں تڑا کر سر پٹ ادھر ادھر دوڑنے لگے..... اور انہیں پاؤں تلے کچلنے لگے..... بالآخر اس بلائے ناگہانی سے گھبرا کر وہ سب وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے..... جب صبح کی روشنی پھیلی تو مسلمانوں نے اپنے سامنے صاف میدان دیکھا..... دشمنوں کا دور دور تک کوئی نام و نشان نظر نہ آیا..... یہی وہ کیفیت ہے جس کا قرآن کریم میں سورۃ الأحزاب میں تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔

قیمتی ترین سبق:

رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کے دوران جتنے غزوات پیش آئے..... ان سب میں ہمیں جو میدانی صورت حال..... اور پھر جو نتیجہ نظر آتا ہے..... اس میں ہمیشہ کیلئے یہ انتہائی قیمتی ترین سبق اور پیغام پوشیدہ ہے کہ کسی بھی جنگ میں فتح یا شکست کا دار و مدار تعداد کی کثرت یا قلت پر نہیں ہے..... نہ ہی اس چیز کا تعلق سامان جنگ کی کثرت یا قلت سے ہے..... اگرچہ ان چیزوں کی بھی اپنی جگہ یقیناً بڑی اہمیت ہے، کیونکہ اسباب و وسائل کو اختیار کرنا

ضروری ہے..... لیکن..... فتح اور کامیابی کا اصل دار و مدار اس بات پر ہے کہ ”نیت خالص ہو، اور جذبہ صادق ہو“ کیونکہ میدانِ کارزار میں ہتھیار تو ٹوٹ سکتے ہیں..... لیکن جذبہ اگر سچا ہو تو وہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا.....!!

اسلام بزورِ شمشیر نہیں پھیلا:

”غزوات“ کے تذکرے کے موقع پر یہ حقیقت بھی قابلِ ذکر ہے کہ بہت سے لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ”اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ہے..... اور یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے خوب تلوار چلا چلا کر..... لوگوں کو ڈرا ڈرا کر..... زبردستی مسلمان بنایا.....“

بیارذہنیت رکھنے والے ان افراد کا یہ دعویٰ سراسر غلط اور باطل ہے، ان کی یہ بات مکمل طور پر بے بنیاد اور حقائق کے منافی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسلام تلوار کی نوک سے نہیں پھلایا..... بلکہ اسلام تو آپ کے حسنِ اخلاق، بلند کردار اور آپ کی مسلسل دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں پھیلا ہے..... اسلام دینِ رحمت ہے، اسلام امن و امان کا دین ہے، اسلام سلامتی کا دین ہے، اسلام ہر انسان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کا حکم دیتا ہے، انسانی خون کی جتنی قدر و قیمت اور حرمت و عظمت دینِ اسلام میں ہے اس کی مثال شاید کہیں اور نہیں مل سکے گی۔

قرآن کریم میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ: ﴿..... أَنَّهُ مَن قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا.....﴾ (۱) ترجمہ: (..... جو شخص کسی کو بغیر اس کے کہ وہ قاتل ہو زمین میں فساد برپا کرنے والا ہو، قتل کر ڈالے، تو گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کر دیا، اور جو

شخص کسی ایک کی جان بچالے اس نے گویا تمام لوگوں کو زندہ کر دیا.....)

یعنی قرآن کریم میں اس ارشادِ بانی کی رو سے ایک انسان کا ناحق خون کر دینے والا شخص تمام انسانیت کا قاتل ہے، جبکہ جس کسی نے محض کسی ایک انسان کی جان بچائی اس نے گویا تمام انسانیت کو بچا لیا..... گویا وہ تمام انسانیت کا محسن ہے اور نجات دہندہ ہے.....!

اسی طرح قرآن کریم میں اللہ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جس مشہور و معروف اور انتہائی جامع و مفصل دعاء کا تذکرہ ہے، اس میں یہی کیفیت نظر آتی ہے کہ انہوں نے اس دعاء میں سب سے پہلے اللہ سے امن و امان کی نعمت کا سوال کیا، جیسا کہ ارشادِ بانی ہے: ﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا الْبَلَدَ آمِنًا﴾ (۱) ترجمہ: (اور جب ابراہیم نے کہا کہ: اے میرے رب! تو بنادے اس شہر کو امن کی جگہ) اور پھر اس کے بعد آگے چل کر اسی دعاء میں اللہ سے اپنے لئے نیز اپنی ذریت اور اہل و عیال کیلئے عقیدہ و ایمان کی سلامتی کا سوال کیا، اس کے بعد نماز کی توفیق کا سوال کیا..... اور پھر رزق کی فراوانی اور خوشحالی مانگی۔

لہذا اس دعاء میں جو ترتیب وارد ہوئی ہے، اس سے یہی بات واضح و ثابت ہوتی ہے کہ امن و امان اور سلامتی و عافیت اس قدر اہم چیز ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے اللہ سے اسی چیز کا سوال کیا..... اور اس کے بعد باقی چیزیں مانگیں..... یقیناً جب امن و امان کی نعمت نصیب ہوگی، انسان کی جان و مال محفوظ ہوگی، تبھی تو انسان اللہ کی عبادت کا فریضہ انجام دینے کے قابل ہو سکے گا، جان و مال محفوظ ہوگی تبھی تو انسان مسجد جاسکے گا، اور تبھی حج بیت اللہ کیلئے سفر ممکن ہوگا، اور تبھی تو انسان اپنے لئے اور اپنے اہل و عیال کیلئے

رزقِ حلال کی تلاش میں گھر سے نکل سکے گا، محنت مشقت کر سکے گا..... یہ ہے دینِ اسلام کی تعلیم، اور یہی چیز رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارکہ میں بھی واضح نظر آتی ہے۔

ہاں البتہ جب مخالفین اور دشمنوں کی طرف سے ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے، معاملہ حد سے تجاوز کر گیا، زبردستی جنگ مسلط کر دی گئی..... تب رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنی حفاظت اور دفاع کی خاطر جو راستہ مناسب سمجھا وہ اختیار کیا۔

☆ اس سلسلے میں بہت بڑا ثبوت یہی ہے کہ دشمنوں کے خلاف مسلح جدوجہد کی سب سے پہلے جس آیت میں اجازت دی گئی اس کا انداز ہی کچھ اس طرح ہے، چنانچہ ارشادِ بانی ہے: ﴿اِنَّ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظَلَمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌۭ﴾ (۱) **الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّا اَنْ يَقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ.....** (۱) ترجمہ: (جن کے خلاف جنگ لڑی جا رہی ہے انہیں مقابلے کی اجازت دی جاتی ہے، کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے، بے شک اللہ ان کی مدد پر قادر ہے، یہ وہ ہیں جنہیں ناحق ان کے گھروں سے نکال دیا گیا، محض اس وجہ سے کہ انہوں نے یوں کہا کہ ”ہمارا رب صرف اللہ ہے۔“

اس آیت کے مفہوم سے اور اس کے انداز سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مخالفین کی طرف سے مظلوم مسلمانوں کے ساتھ ہر قسم کی ظلم و زیادتی، جبر اور سفاکی کا سلسلہ پہلے سے بلکہ دینِ اسلام کے ظہور کے بعد روزِ اول سے ہی چلا آ رہا تھا..... اور اسی کیفیت میں طویل عرصہ گزر گیا..... بلکہ پورا کی دور گزر گیا..... اور اب ہجرت کے بعد مسلمانوں کی مدینہ منقلی کے باوجود یہ مخالفین اپنی حرکتوں سے اور ظلم و زیادتی کے اس سلسلے سے باز نہ آئے..... تب

جا کر اس آیت میں مخالفین اور دشمنوں کے خلاف مظلوم مسلمانوں کو اپنی حفاظت اور اپنے دفاع کی خاطر مسلح جدوجہد کی اجازت دی گئی۔

☆ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مشرکین مکہ کے خلاف جن غزوات کی نوبت آئی ان میں سے مشہور و معروف اور اہم ترین غزوات ”بدر“ ”اُحد“ اور ”خندق“ (جسے احزاب بھی کہا جاتا ہے) ہیں۔ ان جنگوں کے ناموں سے ہی یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ مشرکین مکہ اپنی پرانی فطرت اور اسلام دشمنی کے ہاتھوں مجبور ہو کر مسلمانوں کو نیست و نابود کر دینے اور انہیں صفحہ ہستی سے ہمیشہ کیلئے مٹا دینے کے جنون میں خود مکہ سے سفر کر کے مدینہ پہنچے..... کیونکہ یہ تمام مقامات مکہ میں نہیں ہیں، بلکہ مدینہ میں یا اُس کے مضافات میں واقع ہیں..... ”بدر“ مدینہ شہر سے کچھ فاصلے پر ہے، ”اُحد“ نامی پہاڑ تو مدینہ شہر سے بالکل متصل ہی ہے، جبکہ ”خندق“ کے آثار تو آج تک عین مدینہ شہر کے اندر ہی موجود ہیں۔

لہذا ان تمام غزوات کے نام ہی یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ مشرکین مکہ اپنے شہر سے سفر کرتے ہوئے مدینہ پہنچے تھے، اور یوں یہ جنگیں مسلمانوں پر مسلط کی گئی تھیں..... نہ یہ کہ مسلمان خود لڑنے کیلئے مدینہ سے مکہ جا پہنچے..... اور وہاں جا کر مشرکین مکہ کو لاکارا..... اور ان بے چاروں کو لڑنے پر مجبور کر ڈالا.....!

کچھ جنگیں مشرکین مکہ کے سوا دیگر مشرکین عرب کے خلاف لڑی گئیں، اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ مشرک قبائل کسی نہ کسی شکل میں مسلمانوں کے خلاف جارحیت، اشتعال اور فتنہ و فساد پھیلانے میں مشغول تھے، لہذا ان کی اس شرارت کے جواب میں ان کی سرکوبی ضروری سمجھی گئی۔

☆ مشرکین مکہ کے سوا دیگر مشرکین کے خلاف لڑی جانے والی جنگوں میں ”غزوہ حنین“ سب سے اہم اور مشہور جنگ تھی، اس کا پس منظر بھی یہی تھا کہ فتح مکہ کے فوری بعد طائف اور اس کے مضافات میں آباد بہت ہی مشہور اور طاقتور قسم کے قبائل ”ہوازن“ اور ”ثقیف“ وغیرہ..... مسلمانوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی حسرت دل میں لئے ہوئے بہت بڑے لشکرِ جرار کے ساتھ طائف سے مکہ کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کو مکہ میں جب یہ خبر ملی تو آپؐ نے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہنے کی بجائے اپنا دفاع ضروری سمجھا، اور اس مقصد کیلئے مکہ سے ان کی جانب روانگی کا فیصلہ فرمایا..... اور تب مکہ اور طائف کے درمیان ”حنین“ نامی مقام پر یہ بہت ہی خطرناک اور تاریخی جنگ لڑی گئی، لہذا اس موقع پر بھی جارحیت کی ابتداء مشرکین کی طرف سے ہوئی تھی، نہ کہ مسلمانوں کی طرف سے۔

☆ چند غزواتِ مدینہ شہر میں، نیز خیبر نامی شہر میں آباد یہودیوں کے خلاف لڑے گئے، اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ بظاہر صلح اور عدم جارحیت کے معاہدات کر رکھے تھے، مگر درپردہ وہ ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف سازشوں کے جال پھیلانے میں ہی مصروف رہے، بار بار مکہ جا کر مشرکین مکہ کو مسلمانوں کے خلاف ورغلاتے اور اُکساتے رہے..... انہیں مسلمانوں پر لشکر کشی کی ترغیب دیتے رہے اور اس مقصد کیلئے انہیں اپنی مکمل حمایت اور ہر قسم کے خفیہ تعاون کا یقین دلاتے رہے۔

لیکن ان کی ان شرانگیزیوں کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی طرف سے کبھی باقاعدہ ان کے خلاف کوئی لشکر کشی نہیں کی گئی..... البتہ انہیں بار بار تنبیہ کی گئی..... لیکن جب سب کچھ لا حاصل رہا تو آخر ان سے شہرِ مدینہ سے کوچ کر جانے کا مطالبہ کیا گیا، اور اس موقع پر بھی کسی اکادکا معمولی جھڑپ کے سوا باقاعدہ کسی جنگ یا عام یلغار کی نوبت نہیں آئی، اور

پھر مزید یہ کہ مسلمانوں کی طرف سے مدینہ سے انخلاء کے اس مطالبے پر یہ تمام یہودی نہایت آرام و اطمینان کے ساتھ وہاں سے خیبر کی جانب روانہ ہوئے، اپنا تمام تر ساز و سامان..... حتیٰ کہ اپنے گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں تک اکھاڑ کر اونٹوں پر لاد کر اپنے ہمراہ لے گئے..... کسی نے انہیں روکا نہیں..... کسی نے انہیں ٹوکا نہیں..... (۱)

☆ غزوہ تبوک، نیز غزوہ موتہ سلطنتِ روم کے خلاف لڑے گئے، جسے اُس دور میں تمام روئے زمین کی عظیم ترین قوت تصور کیا جاتا تھا، اور ان غزوات کی وجہ بھی یہی تھی کہ سرحدی علاقوں پر رومی افواج کا بکثرت اجتماع، نیز مسلمانوں کے خلاف اشتعال انگیزیوں کے سلسلے اور بالخصوص رسول اللہ ﷺ کے قاصد حارث بن عمیر الازدی رضی اللہ عنہ کو بغیر کسی قصور کے حاکم موتہ کے حکم پر رسیوں سے جکڑ کر انتہائی بیدردی کے ساتھ قتل کر دینا..... جو کہ سفارتی آداب کی کھلی خلاف ورزی، نیز اخلاقی اقدار کی بہت بڑی پامالی تھی..... اور جو کہ یقیناً انتہائی سنگین جرم تھا..... یہ وہ تمام اسباب تھے جن کی وجہ سے رومیوں کے خلاف ان غزوات کی نوبت آئی۔

☆ غرضیکہ یہ تمام غزوات خواہ مشرکین مکہ کے خلاف ہوں، یا دیگر مشرک قبائل کے خلاف، یا یہود مدینہ اور پھر یہود خیبر کے خلاف، یا سلطنتِ روم کے خلاف..... ان میں سے ہر غزوہ خود دشمنوں کی طرف سے شرانگیزی و زیادتی کے نتیجے میں پیش آیا، جس کی وجہ سے مسلمانوں نے اپنی حفاظت کی خاطر مناسب جوابی کارروائیاں کیں۔

اور پھر ایسی صورتِ حال میں بھی مسلمانوں کے ہر لشکر کی روانگی کے موقع پر ”رحمۃ للعالمین“ رسول اکرم ﷺ نے ہمیشہ مسلمانوں کو یہ تلقین فرمائی کہ: ”اللہ سے ڈرتے رہنا، کسی بے گناہ

(۱) مدینہ سے یہود کے انخلاء کے بارے میں مزید تفصیل کیلئے سورۃ الحشر کی تفسیر کا مطالعہ کیا جائے۔

کا خون نہ بہانا، کمزوروں، عورتوں، اور بچوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچانا، کوئی لوٹ مار نہ مچانا، سایہ دار درخت نہ کاٹنا، کسی عبادت گاہ کو نقصان نہ پہنچانا۔“

اسی بارے میں قرآن کریم میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے شدید الفاظ میں تاکید کی گئی: ﴿وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ﴾ (۱) یعنی: ”تم لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی نہ کرو، بیشک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔“

غرضیکہ کوئی بھی انصاف پسند انسان اس ناقابل انکار حقیقت کو قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ رسول اللہ ﷺ نے دین اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا یا..... بلکہ سچی بات یہ ہے کہ دشمنوں نے ہمیشہ ہر دور میں تلوار کے زور سے دین اسلام کا راستہ روکنے کی سر توڑ کوشش کی..... مگر..... دین اسلام تلوار کے مقابلے میں ہمیشہ پھلتا پھولتا ہی رہا.....!!

(۱) البقرة [۱۹۰]

الحمد للہ آج بتاریخ ۸/ رجب ۱۴۳۴ھ، مطابق ۱۸/ مئی ۲۰۱۳ء بروز ہفتہ

یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ، وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

صلح حدیبیہ:

مدنی زندگی کے دوسرے دور کا آغاز:

نبوت کے تیرہویں سال جب ہجرت کا حکم نازل ہوا تھا، تو اس حکم کی تعمیل میں رسول اللہ ﷺ نیز دیگر تمام مسلمان اپنے آبائی شہر مکہ کو چھوڑ کر ایک نئی منزل یعنی مدینہ کی جانب ہجرت کر گئے تھے، مدنی زندگی کی زندگی سے بہت مختلف اور بہت بہتر تھی، کیونکہ یہاں مدینہ میں مشرکین مکہ نہیں تھے، نہ ہی ان کی طرف سے وہ تلخیوں اور ایذا رسانیوں کے سلسلے تھے..... نہ ہی وہ خوف اور دہشت کی فضاء تھی..... بلکہ یہاں تو انصارِ مدینہ کی طرف سے ملنے والی محبتیں اور عنایتیں تھیں، جنہوں نے مکہ سے آئے ہوئے اپنے ان بے سروسامان بھائیوں پر اپنا سبھی کچھ بچھا کر دیا تھا..... انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا تھا..... ان کیلئے اپنے گھروں کے بھی اور اپنے دلوں کے بھی دروازے کھول دیئے تھے.....!

لیکن اس سب کچھ کے باوجود اپنے آبائی وطن کی محبت اور اس کیلئے دل میں کشش اور تڑپ انسان کی فطرت کا حصہ ہے..... جس گھر میں انسان نے آنکھ کھولی ہو..... ہوش سنبھالا ہو..... جس گھر کے آنگن میں ”ماں کے آنچل کی خوشبو“ رچی بسی ہو..... اس گھر کو انسان مرتے دم تک کبھی فراموش نہیں کر سکتا..... لہذا مدینہ میں ہر طرح کے آرام و اطمینان کے باوجود مکہ سے آئے ہوئے مسلمانوں کو اپنے آبائی شہر کی یاد ستاتی تھی۔

اور پھر اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہاں مکہ میں ”بیت اللہ“ تھا، جس کی زیارت اور دیدار کیلئے رسول اللہ ﷺ و دیگر اہل ایمان بیتاب و بیقرار رہتے تھے۔

مسلمانوں کے دلوں میں بیت اللہ کیلئے اور اپنے آبائی شہر مکہ کیلئے یہ فطری تڑپ تو یقیناً موجود تھی، البتہ مجموعی طور پر وہ اب یہاں مدینہ میں پرسکون اور خوشگوار زندگی بسر کر رہے تھے۔

لیکن ان کی یہی خوشگوار زندگی مشرکین مکہ سے برداشت نہیں ہوئی اور وہ مسلمانوں کو نیست و نابود کر دینے کی غرض سے وقتاً فوقتاً لشکر کشی کرتے رہے..... جس کے نتیجے میں غزوہ بدر اور پھر غزوہ احد کی نوبت آئی..... اور یوں مسلح جدوجہد کا ایک سلسلہ چل نکلا تھا۔

البتہ اب غزوہ خندق کے موقع پر مشرکین مکہ کی اتنے بڑے پیمانے پر پساپی کے نتیجے میں جب رسول اللہ ﷺ کو ان کی طرف سے ایک حد تک بے فکری نصیب ہوئی تو آپ کے قلب مبارک میں عمرہ کی ادائیگی اور بیت اللہ کی زیارت کی خواہش پیدا ہوئی، انہی دنوں آپ نے ایک خواب بھی دیکھا، جس میں کچھ ایسا منظر تھا کہ آپ اپنے صحابہ کرام کے ہمراہ بیت اللہ کے طواف میں مشغول ہیں، ظاہر ہے کہ یہ خواب اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے اپنے حبیب ﷺ و دیگر اہل ایمان کیلئے بہت بڑی بشارت تھی اور نبی اشارہ تھا۔ (۱)

چنانچہ ۶ ہجری میں رسول اللہ ﷺ اپنے چودہ سو جاں نثاروں کے ہمراہ عمرے کی ادائیگی کی غرض سے مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کی جانب روانہ ہوئے، اس موقع پر ان سبھی حضرات

(۱) قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلَنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ.....﴾ یعنی ”یقیناً اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا کہ ان شاء اللہ تم یقیناً پورے امن و امان کے ساتھ مسجد حرام میں داخل ہو گے..... (سورۃ الفتح / ۲۷)

رسول اللہ ﷺ نیز مسلمانوں نے اس خواب کو بشارتِ عظیمہ سمجھا، کیونکہ نبی کا خواب بمنزلہ وحی ہی ہوتا ہے، اگرچہ اس خواب میں یہ تعین نہیں کی گئی تھی کہ امن و امان کے ساتھ یہ عمرہ اسی سال ہوگا یا آئندہ سال..... لیکن مسلمانوں نے اس خوشخبری کو سننے کے بعد فوری تیاری شروع کر دی اور پھر روانہ بھی ہو گئے۔

نے احرام باندھ رکھے تھے، کیونکہ عمرے کی ادائیگی مقصود تھی، مزید یہ کہ مشرکین مکہ پر بھی یہ بات تاکہ خوب واضح ہو جائے کہ مسلمان محض عمرے کی نیت سے مکہ آرہے ہیں..... اور یہ کہ جنگ لڑنے کا ان کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں ہے۔

لیکن طویل سفر کے بعد جب یہ حضرات مکہ کے قریب ”حدیبیہ“ نامی مقام پر پہنچے تو انہیں یہ افسوسناک اطلاع ملی کہ مشرکین مکہ جنگ لڑے بغیر کسی صورت مکہ میں داخلے کی اجازت نہیں دیں گے۔ (۱)

یہ خبر رسول اللہ ﷺ و دیگر مسلمانوں کیلئے بڑی تشویش اور پریشانی کا باعث بنی، کیونکہ یہ حضرات تو محض بیت اللہ کی زیارت اور عمرے کی نیت سے آئے تھے، جنگ و جدال ان کا مقصود نہیں تھا، اور یہی وجہ تھی کہ وہ سب اس موقع پر غیر مسلح تھے اور حالت احرام میں تھے، اس موقع پر رسول اللہ ﷺ اور مشرکین مکہ کے مابین اس سلسلے میں پیغامات کا تبادلہ بھی ہوتا رہا، لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا، تب مشرکین مکہ نے گفت و شنید کی غرض سے اپنا ایک باقاعدہ وفد مسلمانوں کے پاس بھیجا، لیکن گفت و شنید کے محض آغاز پر ہی یہ صورت حال پیش آئی کہ اس وفد کے سربراہ کے بارے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے محسوس کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس کا اندازِ مخاطب مناسب نہیں ہے، اس پر انہوں نے اسے ٹوکا اور تنبیہ کرتے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ادب اور تمیز سے گفتگو کرو، اس تنبیہ پر وہ سردار مگڑ گیا..... اور دونوں میں جھڑپ ہو گئی..... اور یوں یہ مذاکرات بھی ناکام ہو گئے اور وہ وفد واپس مکہ لوٹ گیا (۲)

(۱) ”حدیبیہ“ نامی یہ مشہور و معروف تاریخی مقام مکہ مکرمہ سے نکلنے کے بعد جدہ کے راستے میں واقع ہے، آجکل یہ جگہ ”شمسی“ کے نام سے معروف ہے۔

(۲) قریش مکہ نے اس موقع پر اپنے سرداروں میں سے کسی کو رسول اللہ ﷺ کی طرف بھیجنے کی بجائے طائف

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ فرمایا کہ مشرکین مکہ کے ساتھ مزید گفت و شنید کی غرض سے اپنے صحابہ میں سے کسی کو مکہ روانہ کیا جائے، اور غور و فکر کے بعد اس مقصد کیلئے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا انتخاب کیا گیا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ مکہ پہنچے، لیکن مشرکین مکہ نے ان کی کوئی بات سننے کی بجائے انہیں نظر بند کر دیا، مزید یہ کہ مسلمانوں کو نفسیاتی صدمہ پہنچانے کی غرض سے یہ افواہ پھیلا دی کہ ہم نے عثمان کو قتل کر دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ خبر رسول اللہ ﷺ کیلئے نیز آپ کے تمام جاں نثار ساتھیوں کیلئے انتہائی تشویش ناک اور بڑے صدمے کا باعث تھی، لہذا آپ نے یہ افسوسناک خبر سننے کے بعد اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ”عثمان کے خون کا بدلہ لینا فرض ہے“ یہ ارشاد فرمانے کے بعد آپ وہاں ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور وہاں موجود

(باقی از حاشیہ صفحہ گزشتہ)

سے آئے ہوئے اس سردار کو بھیجا جس کا نام عروہ بن مسعود ثقفی تھا، واضح ہو کہ اگرچہ اس موقع پر اس جھڑپ کی وجہ سے عروہ واپس چلے گئے تھے، لیکن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ یہ مختصر ملاقات ان کے دل میں ہمیشہ کیلئے نقش ہو کر رہ گئی تھی اور وہ بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے، آخر دو سال بعد (سن آٹھ ہجری میں) غزوہ طائف کے موقع پر یہ مسلمان ہو گئے تھے اور جب قبول اسلام کے بعد انہوں نے اپنی قوم کو دین اسلام کی طرف دعوت و تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا تو ان کی قوم کو یہ بات پسند نہ آئی، اور ایک روز جب یہ کسی ٹیلے پر چڑھے ہوئے نماز کیلئے اذان دے رہے تھے تو ان کی قوم سے رہانہ گیا اور انہوں نے چاروں طرف سے ان پر تیروں کی بوچھاڑ کر دی (حالانکہ یہ ان کے سردار تھے) جس کے نتیجے میں یہ شہید ہو گئے..... یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بعد میں ان کی ایک صاحبزادی ”ام سعید“ کا حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ساتھ نکاح ہوا تھا، جن سے ان کی دو بیٹیاں تھیں ”ام حسن“ اور ”رملہ“۔

(ملاحظہ ہو: البدایہ والنہایہ۔ فصل فی ذکر زواجہ و ہدیہ و ہباتہ...../ج: ۱۱۔ ص: ۲۳۰۔ طبعہ: دار ہجر)

اپنے تمام صحابہ کرام سے ”جاں نثاری“ کی بیعت لی۔ (۱)
 اب مسلمان ذہنی طور پر ”جنگ“ کیلئے مکمل آمادہ ہو چکے تھے، اور ”جاں نثاری“ کی بیعت
 بھی کر چکے تھے، اور اب ان کے جذبات عروج پر تھے۔
 مشرکین مکہ نے اب مسلمانوں کے یہ بدلے ہوئے تیور دیکھے اور یہ ناقابلِ تسخیر جذبہ اور
 زبردست قسم کا جوش و خروش دیکھا..... تو وہ مرعوب اور خوفزدہ ہو گئے، اور نہ صرف یہ کہ اب
 انہوں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو رہا کر دیا بلکہ مزید یہ کہ اب رسول اللہ ﷺ
 کی خدمت میں ”صلح“ کا پیغام بھی بھجوا دیا..... آپؐ نے ہمیشہ کی طرح اب بھی ”صلح پسندی“
 کا ثبوت دیتے ہوئے اس پیغام کو قبول فرمایا۔

گفت و شنید کا آغاز ہوا، مشرکین مکہ نے اس موقع پر تمام شرائط اپنی پسند کی پیش کیں، جن
 میں ان کا خالص مفاد تھا..... جبکہ مسلمانوں کیلئے انہیں قبول کرنے میں سراسر نقصان تھا.....
 لہذا یہ شرائط تمام مسلمانوں کیلئے ناقابلِ قبول تھیں۔

خصوصاً یہ کہ سب سے پہلی شرط انہوں نے یہ پیش کی کہ اس سال مسلمان عمرہ کئے بغیر واپس
 چلے جائیں اور آئندہ سال آ کر عمرہ کریں، نیز یہ کہ بالکل خالی ہاتھ اور غیر مسلح ہو کر آئیں۔

(۱) اس بیعت کے بارے میں قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ
 تَحْتَ الشَّجَرَةِ.....﴾ یعنی ”یقیناً اللہ راضی ہو گیا مؤمنوں سے جبکہ وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے
 تھے.....“ (سورۃ الفتح: ۱۸)

یعنی اس آیت، نیز اس کے بعد چند آیات میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے ان خوش نصیب افراد کیلئے کچے اوچے
 مؤمن ہونے کی گواہی دی گئی ہے جو اس بیعت میں شریک ہوئے، نیز انہیں اللہ کی طرف سے متعدد خوشبریوں
 سے نوازا گیا، جن میں اہم ترین خوشخبری یہ تھی کہ انہیں ہمیشہ کیلئے اللہ کی طرف سے ”رضامندی و خوشنودی“ سے
 شاد کام کیا گیا..... یہی وجہ ہے کہ اس یادگار اور مبارک ترین بیعت کو ”بیعتِ رضوان“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے،
 اور اس موقع پر جتنے مسلمان موجود تھے ان کی بڑی فضیلت و منقبت ہے۔

مسلمان گذشتہ چھ سال سے بیت اللہ کی زیارت کیلئے بے چین تھے، اور اب اس قدر طویل سفر کی صعوبتیں اور مشقتیں برداشت کرنے کے بعد یہاں پہنچے تھے، مزید یہ کہ حالتِ احرام میں بھی تھے..... ایسے میں مکہ کی حدود میں پہنچ کر اب یہاں سے عمرہ کئے بغیر واپس لوٹ جانا کس قدر تکلیف دہ تھا۔

لیکن اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے ان تمام شرائط کو منظور فرمایا اور اس معاہدہ صلح کو قبول فرمایا، اس سے یقیناً آپ کی صلح پسندی ظاہر ہوتی ہے، نیز یہ کہ جہاں تک ممکن ہو سکے خونریزی، جنگ و جدال اور فتنہ و فساد سے اجتناب کا جذبہ نمایاں ہوتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اس صلح میں اللہ کی طرف سے مسلمانوں کیلئے بڑی مصلحتیں پوشیدہ تھیں۔



الحمد للہ آج بتاریخ ۸/ رمضان المبارک ۱۴۳۴ھ، مطابق ۱۶/ جولائی ۲۰۱۳ء بروز منگل

یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ، وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

فرماں رواؤں کو دعوتِ اسلام:

۶ ہجری میں مشرکین مکہ کے ساتھ کئے گئے معاہدہ صلح یعنی ”صلح حدیبیہ“ کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ کو جب مشرکین مکہ کی طرف سے قدرے بے فکری نصیب ہوئی تو آپؐ نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دینِ اسلام کی نشر و اشاعت کے کام کو مزید وسعت دینے کی غرض سے ہجرت کے ساتویں سال مختلف فرماں رواؤں اور حکمرانوں کو خطوط ارسال فرمائے جن میں انہیں دینِ برحق قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی، کیونکہ دینِ اسلام کسی خاص قوم کیلئے نہیں ہے، بلکہ یہ تو عالمگیر دین ہے، آخری اور مکمل دین ہے، تمام بنی نوع انسان کی صلاح و فلاح اور نجات اسی دین سے وابستہ ہے، اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو ”تمام دنیائے انسانیت“ کیلئے ”رحمت“ بنا کر بھیجا تھا، نہ کہ کسی مخصوص قوم کیلئے، لہذا آپؐ کی نبوت و بعثت زمان و مکان کی حدود و قیود سے بالاتر تھی۔

جیسا کہ ارشادِ باری ہے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ (۱)

ترجمہ: (اور ہم نے آپ کو تمام جہان والوں کیلئے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے)

نیز ارشاد ہے: ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَ الْأَرْضِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ﴾ (۲) ترجمہ: (آپ کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا ہوں جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے)

نیز ارشاد ہے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا﴾ (۱)
 ترجمہ: (ہم نے آپ کو تمام لوگوں کیلئے خوشخبریاں سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے)
 نیز ارشاد ہے: ﴿وَأَوْحِي إِلَيَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ لِأُنذِرَكُمْ بِهِ وَمَنْ بَلَغَ﴾ (۲)
 ترجمہ: (اور میرے پاس یہ قرآن بطور وحی کے بھیجا گیا ہے تاکہ میں اس قرآن کے ذریعہ
 سے تم کو اور جس کو یہ قرآن پہنچے ان سب کو ڈراؤں)

نیز ارشاد ہے: ﴿تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا﴾ (۳) ترجمہ: (بہت بابرکت ہے وہ اللہ تعالیٰ جس نے اپنے بندے پر فرقان
 اتارنا کہ وہ تمام لوگوں کیلئے آگاہ کرنے والا بن جائے)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (كَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلَىٰ قَوْمِهِ خَاصَّةً ، وَبُعِثْتُ إِلَىٰ
 النَّاسِ عَامَّةً) (۴) ترجمہ: (مجھ سے پہلے ہر نبی کو صرف اپنی ہی قوم کی طرف مبعوث
 کیا جاتا تھا، جبکہ مجھے تمام بنی نوع انسان کی طرف مبعوث کیا گیا ہے)
 چنانچہ صلح حدیبیہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے ”تبلیغ دین“ کے اس فریضے
 کی انجام دہی کے طور پر متعدد دعوتی خطوط تحریر فرمائے۔

☆..... ”اصلاح“ کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ انسان سب سے پہلے خود اپنی اصلاح
 کرے، اس کے بعد اپنے اہل و عیال اور افرادِ خانہ کی، پھر اپنے اعزہ و اقارب اور اپنے
 احباب کی، اس کے بعد علاقائی سطح پر یہ کام ہو، پھر ملکی سطح پر..... اور اگر حالات اجازت دیں
 تو مناسب طریقے سے اور حکمت کے ساتھ عالمی سطح پر یہ فریضہ انجام دیا جائے۔

[۳] الفرقان [۱]

[۲] الانعام [۱۹]

[۱] سبأ [۲۸]

[۴] بخاری [۳۲۸] کتاب التیم قول اللہ تعالیٰ: فان لم تجدوا ماء.....، مسلم [۵۲۱] کتاب المساجد ومواضع الصلاة۔

رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے دین کی طرف دعوت کا جو فریضہ انجام دیا، اس میں بھی ”اصلاح“ کا یہی بنیادی اصول کا فرما نظر آتا ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ:

آپ کے اعلیٰ اخلاق، بے داغ کردار اور پاکیزہ سیرت کے اپنے اور پرائے سبھی معترف تھے۔

اس کے بعد جب آپ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا اور اللہ کا پیغام پہنچانے کا فریضہ سونپا گیا، تب آپ نے سب سے پہلے اپنے اہل خانہ کو دین حق قبول کرنے کی دعوت دی۔

اس کے بعد جب اللہ کی طرف سے اپنے حبیب ﷺ کیلئے یہ حکم نازل ہوا: ﴿وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ (۱) یعنی: ”آپ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیے“ تب آپ نے بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب کو اللہ کا پیغام پہنچاتے ہوئے دین حق کی طرف بلایا، اور اسی سلسلے میں ”کوہ صفا“ پر اجتماع کا مشہور واقعہ پیش آیا تھا۔

اور پھر جب آیت: ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ﴾ (۲) یعنی: ”آپ کو جس چیز کا حکم دیا جا رہا ہے اسے آپ کھول کر سنا دیجئے اور مشرکین سے منہ پھیر لیجئے“ (۳) نازل ہوئی تو اس ارشادِ بانی کی تعمیل کے طور پر آپ نے دعوتِ دین کے اس سلسلے کو وسعت دیتے ہوئے تمام مکہ والوں کو اللہ کا پیغام پہنچایا، جس کے نتیجے میں مشرکین مکہ کی جانب سے ایذا رسانیوں کا آغاز ہوا۔

اس کے بعد آپ نے مکہ شہر سے باہر قرب و جوار کے علاقوں میں دعوت کا فریضہ سرانجام

(۱) النمل [۲۱۳] (۲) الحج [۹۴] (۳) یعنی اب رسول اللہ ﷺ کو یہ حکم دیا گیا کہ چھپ کر تبلیغ کرنے کی بجائے کھلم کھلا اور علی الاعلان اللہ کے دین کی تبلیغ کریں، اور اس سلسلے میں مشرکین مکہ کی طرف سے مخالفت و عداوت کا جب سامنا کرنا پڑے تو ان سے الجھنے کی بجائے یا اس بات پر افسردہ ہونے کی بجائے ان سے منہ موڑ لیں (یعنی بس اللہ پر بھروسہ رکھیں اور افسردہ و رنجیدہ نہوں.....)

دیا، اسی سلسلے میں ”سفر طائف“ کا تاریخی واقعہ پیش آیا، نیز انہی دنوں آپؐ نے مشرکین مکہ کی بجائے بیرون مکہ سے آنے والے ان افراد و قبائل پر اپنی توجہ زیادہ مرکوز کی جن کی حج و عمرہ کی ادائیگی کی غرض سے، یا تجارت کے سلسلے میں مکہ شہر میں آمد و رفت رہتی تھی، اسی سلسلے میں حج کے موقع پر مدینہ سے آئے ہوئے چند افراد کے قبولِ اسلام کا واقعہ اور پھر ”بیعت عقبہ“ کا مشہور واقعہ پیش آیا تھا۔

اور پھر بالآخر ۶ ہجری میں ”صلح حدیبیہ“ کے نتیجے میں جب مشرکین مکہ کی جانب سے قدرے بے فکری نصیب ہوئی اور حالات سازگار محسوس ہوئے تو ہجرت کے ساتویں سال آپؐ نے ارشادِ باری ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا﴾ (۱) یعنی ”ہم نے آپ کو تمام لوگوں کیلئے خوشخبریاں سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے“ کے مصداق کے طور پر دعوت و تبلیغ کے اس سلسلے کو جزیرۃ العرب سے باہر کی دنیا تک وسعت دینے کا آغاز فرمایا، اور اسی سلسلے میں مختلف فرمانرواؤں، حکمرانوں، امراء و سلاطین، والیان ریاست، اور سردارانِ قبائل کو دعوتی خطوط ارسال کئے گئے۔

اس سلسلے میں درج ذیل امور قابلِ ذکر ہیں:

☆..... اُس دور میں چونکہ یہ رواج تھا کہ کسی بھی قسم کی سرکاری خط و کتابت کیلئے مہر کو ضروری تصور کیا جاتا تھا، ان فرمانرواؤں کے شاہی درباروں میں پہنچنے والا کوئی ایسا خط قبول نہیں کیا جاتا تھا کہ جس پر لکھنے والے کی مہر ثبت نہ ہو، بغیر مہر کے خط کو جعلی اور نقلی تصور کیا جاتا تھا۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ان فرمانرواؤں کے ساتھ دعوتِ اسلام کے سلسلے میں خط و کتابت

کے موقع پر ایک مہر تیار کروائی، اور پھر مزید یہ کہ اس مہر میں کوئی عبارت بھی درج ہوا کرتی تھی، جسے خط تحریر کرنے والے کی طرف سے دستخط یا شناخت کی حیثیت سے دیکھا جاتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے جو مہر تیار کروائی اس میں بطور شناخت یہ عبارت تحریر کی گئی: ”محمد رسول اللہ“، اور اس عبارت کی تحریر کیلئے انداز یہ اختیار کیا گیا کہ اسے دائیں سے بائیں جانب لکھنے کی بجائے اوپر سے نیچے کی جانب لکھا گیا، سب سے اوپر ”اللہ“ اس کے نیچے ”رسول“ اور پھر سب سے نیچے ”محمد“ لکھا گیا، تاکہ جس کسی کو یہ خط تحریر کیا جا رہا ہے وہ خط پر نظر پڑتے ہی..... مضمون تک پہنچنے سے پہلے ہی..... اس خط کے تحریر کنندہ کی سوچ اور اس کے عقیدہ و ایمان سے..... نیز اس کی حیثیت اور مقام و مرتبے سے آگاہ ہو جائے..... اسے اس حقیقت کا ادراک ہو جائے کہ اس خط کے تحریر کنندہ کا نام ”محمد“ ہے اور یہ کہ وہ اللہ کے رسول ہیں، نیز یہ کہ ان کا عقیدہ و ایمان یہ ہے کہ اس تمام کائنات میں ”اللہ عز و جل“ کا مقام و مرتبہ سب سے بلند ہے..... تمام زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے اس کا مقام و مرتبہ اللہ سے کم ہے۔

☆..... ان تمام خطوط کا بنیادی مضمون اگرچہ مشترک تھا کہ ان سب میں اُن فرمانرواؤں کو دین برحق قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی، البتہ عام مضمون ہر خط میں قدرے مختلف تھا، کیونکہ جن فرمانرواؤں کے نام یہ خطوط تحریر کئے گئے تھے ان سب کا پس منظر مختلف تھا، ان میں سے کوئی نصرانی تھا، کوئی مجوسی، کوئی مشرک، کوئی اللہ پر اور نبوت و رسالت پر یقین و ایمان رکھتا تھا، کوئی اس چیز کا منکر تھا، جبکہ ان میں سے کسی کو اس بارے میں سرے سے کوئی علم ہی نہیں تھا..... لہذا..... جیسا کہ مقولہ مشہور ہے کہ ”لکل مقام مقال“، یعنی ہر موقع کیلئے گفتگو جدا ہوا کرتی ہے، ایک ہی بات ہر موقع پر اور ہر مقام پر نہیں کی جاسکتی، موقع و محل کی

مناسبت سے ہی گفتگو کی جاتی ہے۔

اور پھر یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے مقاصدِ بعثت میں سے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ آپؐ دنیا کو ”حکمت و دانش“ کی تعلیم دیں (۱) لہذا خود آپؐ کا اپنا ہر اقدام اور ہر قول و عمل کس قدر حکمت و دانائی سے بھرپور ہوگا..... چنانچہ اسی حکمت اور فہم و فراست کا مظاہرہ ہمیں آپؐ کی طرف سے مختلف فرمانرواؤں کے نام تحریر فرمودہ ان خطوط میں بھی نظر آتا ہے کہ ان سب کا بنیادی مضمون اگرچہ ایک ہی تھا، تاہم خط کا عام مضمون ہر مکتوب الیہ کی مذہبی، فکری و سماجی کیفیت کے مطابق جدا جدا تھا۔

☆..... ان خطوط میں ہر فرمانروا پر یہ بات واضح کر دی گئی تھی کہ اس کے قبولِ اسلام کی صورت میں بھی اس کی یہ بادشاہت، نیز اس کے ملک میں اور اس کی رعیت میں اس کی یہ حیثیت اور یہ رتبہ بدستور اسی طرح برقرار رہے گا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو، آپؐ کے جاں نثار ساتھیوں کو اس مکتوب الیہ کے ملک اور اس کی دولت اور مال و متاع سے کوئی غرض نہیں تھی، دنیا کی ہوس یا لالچ کا وہاں کوئی تصور نہیں تھا..... وہاں مالِ غنیمت یا کشور کشائی کا کوئی جذبہ نہیں تھا..... بلکہ اصل مقصود تو ان فرمانرواؤں کو دعوتِ حق پہنچانا..... اور خود انہی کو راہِ نجات پر لانا تھا..... خود انہی کی بھلائی اور دنیا و آخرت میں ان کی صلاح و فلاح مقصود تھی، نہ کہ ان کے ملک اور مال و متاع پر قبضہ جمانا۔

یقیناً یہ بھی رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ”استغناء عن الدنيا“ کی اعلیٰ مثال، نیز حکمت و دانائی اور سیاسی بصیرت کا بہت بڑا مظاہرہ تھا۔

(۱) جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ.....﴾ یعنی ”تا کہ وہ (یعنی نبی ﷺ)

انہیں سکھادیں کتاب اور حکمت..... (البقرہ: ۱۲۹)

دعوتِ اسلام کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ نے متعدد حکمرانوں اور فرمانرواؤں کے نام خطوط ارسال فرمائے، البتہ ان میں سے سلطنتِ روم اور سلطنتِ فارس خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، کیونکہ اُس زمانے میں روئے زمین پر یہی دو بہت عظیم قوتیں تھیں، ان کی بڑی شان و شوکت تھی، بڑا رعب اور دبدبہ تھا، دنیا کے باقی ممالک کی دینی، سیاسی، تمدنی، معاشرتی، و معاشی صورتِ حال پر ان دونوں سلطنتوں کی بہت مضبوط گرفت تھی، علاقے کی باقی تمام قوتیں ہر لحاظ سے ان کے زیرِ اثر تھیں، چنانچہ ان عظیم سلطنتوں کے فرمانرواؤں کے ساتھ خط و کتابت کا حال درج ذیل ہے:

☆.....قیصرِ روم:

دعوتِ اسلام کے سلسلے میں پہلا خط قیصرِ روم کے نام لکھا گیا، اُس زمانے میں سلطنتِ روم کا جو کوئی بھی بادشاہ ہوتا اسے ”قیصر“ کے لقب سے یاد کیا جاتا، اُس دور میں ”ہرقل“ نامی شخص قیصرِ روم تھا، یعنی روئے زمین کی عظیم ترین قوت ”سلطنتِ روم“ کا بادشاہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابی حضرت وحید بن خلیفہ الکھی رضی اللہ عنہ قیصرِ روم کے نام آپ کا تحریر فرمودہ نامہ مبارک لے کر مدینہ منورہ سے سفر کرتے ہوئے سلطنتِ روم کے دار الحکومت ”قُسطنطنیہ“ کی جانب عازم سفر ہوئے (۱) (۲) دورانِ سفر انہیں یہ اطلاع ملی کہ قیصر آجکل ”ایلیاء“ (یعنی بیت المقدس) آیا ہوا ہے، جس پر انہوں نے قُسطنطنیہ کی بجائے اپنے سفر کا رخ ایلیاء کی جانب موڑ دیا۔

(۱) حضرت وحید بن خلیفہ الکھی رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جبریل امین علیہ السلام جب بھی انسانی شکل میں رسول اللہ ﷺ کے پاس تشریف لاتے تو ہمیشہ انہی کی شکل میں آیا کرتے تھے۔
(۲) اُس زمانے میں سلطنتِ روم کا دار الحکومت ”قُسطنطنیہ“ تھا، یعنی موجودہ ”استنبول“ جو کہ اب ترکی کا مشہور و معروف شہر ہے۔

دراصل سلطنتِ روم اور سلطنتِ فارس میں باہم سا لہا سال سے مختلف محاذوں پر خونریز قسم کی جنگوں کا سلسلہ چلا آ رہا تھا، کبھی ایک فریق کو غلبہ نصیب ہوتا، اور کبھی دوسرے فریق کو..... یوں سا لہا سال سے یہ سلسلہ جاری تھا..... اور چونکہ خطے کے دیگر تمام ممالک اور ان میں بسنے والے عوام ان دونوں میں سے کسی ایک کے تابع فرمان اور زیرِ اثر تھے، لہذا فریقین میں سے کسی ایک کی فتح اور دوسرے کی شکست کے دینی، سیاسی، سماجی و اقتصادی اثرات صرف انہی دونوں تک محدود نہیں رہتے تھے، بلکہ اس چیز کا اثر دور دراز کے علاقوں تک پہنچتا تھا، حتیٰ کہ اس چیز کا اثر مکہ تک بھی پہنچتا تھا..... فارسی چونکہ مشرک (آتش پرست) تھے، لہذا جب کسی محاذ پر انہیں غلبہ نصیب ہوتا تو مشرکین مکہ خوشیاں مناتے اور مسلمان غمگین ہو جاتے..... جبکہ رومی چونکہ اہل کتاب تھے، لہذا ان کی کامیابی پر مسلمان خوش ہوتے، جبکہ مشرکین غمزدہ ہو جاتے..... اس چیز کا تذکرہ قرآن کریم میں بھی ”سورۃ الروم“ کی بالکل ابتدائی آیات میں موجود ہے۔

جن دنوں حضرت وحیہ بن خلیفہ الکلمی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کا نامہ مبارک قیصرِ روم تک پہنچانے کی غرض سے محو سفر تھے، دراصل انہی دنوں کسی اہم محاذ پر رومیوں کو فارسیوں کے مقابلے میں کوئی بڑی فتح نصیب ہوئی تھی، اور اہل کتاب کے نزدیک ”ایلیاء“، یعنی بیت المقدس کا بڑا مقدس تھا اور اسے خاص مذہبی حیثیت حاصل تھی، لہذا اس عظیم فتح کے موقع پر بطورِ شکر عبادت کی غرض سے قیصر ان دنوں اپنے دار الحکومت ”قسطنطنیہ“ سے ”ایلیاء“، یعنی بیت المقدس آیا ہوا تھا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے قاصد کو جب یہ خبر ملی تو وہ بھی قسطنطنیہ کی بجائے ایلیاء پہنچ گئے اور نامہ مبارک قیصر کے حوالے کیا۔

قیصر نے رسول اللہ ﷺ کا نامہ مبارک پڑھا، اور پھر غور و فکر کے بعد اس نے اس بارے

میں کسی بھی طرح مزید معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔

اُس زمانے میں مشرکین مکہ کے تجارتی قافلوں کی بکثرت ملکِ شام آمد و رفت رہا کرتی تھی چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا نامہ مبارک موصول ہونے پر قیصرِ روم نے حکم دیا کہ مکہ کا کوئی باشندہ اگر نظر آئے تو اسے فوراً اُس کے سامنے پیش کیا جائے۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں تلاش کا سلسلہ شروع کیا گیا تو جلد ہی مشرکین مکہ کا ایک قافلہ وہاں مل گیا، جسے بغیر کسی تاخیر کے قیصر کے روبرو پیش کیا گیا۔ قیصر نے اس وفد میں موجود افراد سے دریافت کیا کہ تمہارے شہر مکہ میں نبوت کا دعویٰ کرنے والے اس شخص کا تم میں سے قریبی رشتے دار کون ہے؟ اس پر ابوسفیان (جو کہ اُس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) نے جواب دیا کہ ”میں ہوں۔“ اس کے بعد قیصر اور ابوسفیان کے درمیان کچھ اس طرح سوال و جواب کا سلسلہ ہوا:

☆..... قیصر: محمد کا خاندان کیسا ہے؟

ابوسفیان: شریف ہے

☆..... قیصر: کیا اس خاندان میں کسی اور نے بھی کبھی نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟

ابوسفیان: نہیں

☆..... قیصر: اس خاندان میں کبھی کوئی بادشاہ گذرا ہے؟

ابوسفیان: کبھی نہیں

☆..... قیصر: جن لوگوں نے ان کا دین قبول کیا وہ امیر ہیں یا غریب؟

ابوسفیان: غریب لوگ ہیں

☆..... قیصر: ان کے ماننے والے لگھڑ رہے ہیں یا بڑھ رہے ہیں؟

ابوسفیان: بڑھ رہے ہیں

☆.....قیصر: کیا اس کے ماننے والوں میں سے کبھی کوئی اس سے منحرف بھی ہوا ہے؟

ابوسفیان: کبھی نہیں

☆.....قیصر: کبھی تم لوگوں سے اس نے جھوٹ بھی بولا ہے؟

ابوسفیان: نہیں، بلکہ ہمارے علاقے میں وہ ”صادق“ اور ”امین“ کے لقب سے مشہور ہے

☆.....قیصر: وہ کبھی اپنے وعدے یا اقرار سے پھر ہے؟

ابوسفیان: نہیں، ایسا کبھی نہیں ہوا، حال ہی میں اس سے ہمارا معاہدہ صلح (۱) ہوا ہے،

دیکھیں اس پر وہ قائم رہتا ہے یا نہیں

☆.....قیصر: تم لوگوں نے کبھی اس سے جنگ بھی کی ہے؟

ابوسفیان: ہاں

☆.....قیصر: نتیجہ کیا رہا؟

ابوسفیان: کبھی ہم غالب آئے اور کبھی وہ (۲)

☆.....قیصر: اس کی تعلیمات کیا ہیں؟

ابوسفیان: کہتا ہے کہ ”ایک اللہ کی عبادت کرو، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ، نماز پڑھو، سچ

بولو، پاکیزہ اور باحیاء زندگی اختیار کرو، رشتے داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرو، اور نیکی کے

(۱) یعنی صلح حدیبیہ (۲) یعنی اُس وقت تک مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے مابین تین بڑی جنگوں کی نوبت

آئی تھی، بدر، اُحد، اور خندق (جسے احزاب کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے) بدر کے موقع پر مسلمانوں کو غلبہ نصیب

ہوا، اُحد کے موقع پر ابتداء میں مسلمان غالب رہے، لیکن بعد میں اپنی ہی ایک غلطی کی وجہ سے جیتتی ہوئی جنگ

ہار گئے، جبکہ خندق کے موقع پر تو باقاعدہ جنگ کی نوبت ہی نہیں آئی..... ابوسفیان کے اس جواب سے اسی بات کی

طرف اشارہ مقصود تھا کہ ”کبھی ہم غالب آئے اور کبھی وہ“۔

راستے پر چلو۔“

رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ابوسفیان کی زبانی یہ گفتگو سن کر قیصر بولا:

☆..... ”تم کہتے ہو کہ وہ شریف خاندان میں سے ہیں..... نبی ہمیشہ شریف خاندان میں ہی پیدا ہوتے ہیں۔

☆..... تم کہتے ہو کہ ان کے خاندان میں پہلے کبھی کسی نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ ہی

ان میں کوئی بادشاہ گذرا ہے..... اگر ایسا ہوتا تو ہم سمجھتے کہ یہ خاندانی وقار کا اثر ہے (۱)

☆..... تم نے کہا کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے..... جو شخص انسانوں کے سامنے جھوٹ نہیں

بولتا وہ اللہ کے بارے میں کس طرح جھوٹ بول سکتا ہے؟ (۲)

☆..... تم نے بتایا کہ ان کے ماننے والوں میں غریب زیادہ ہیں..... پیغمبروں پر سب سے

پہلے غریب ہی ایمان لایا کرتے ہیں۔

☆..... تم مانتے ہو کہ ان کے پیروکار بڑھتے جا رہے ہیں..... سچے دین کا یہی حال

ہوتا ہے۔

☆..... تم نے بتایا کہ ان کے پیروکاروں میں سے کبھی کوئی ان سے منحرف نہیں ہوا..... سچے

دین کی یہی شان ہوتی ہے کہ ایک بار جب دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو جاتا ہے تو

پھر اس سے انحراف ممکن نہیں ہوتا۔

☆..... تم قبول کرتے ہو کہ وہ کبھی اپنے وعدے یا اقرار سے نہیں پھرتے..... سچا نبی ایسا ہی

(۱) یعنی ہم یہ سمجھتے کہ اس شخص نے اس لالچ کی وجہ سے نبوت کا یہ جھوٹا دعویٰ کیا ہے کہ اس طرح شاید اسے بھی وہی

عزت و عظمت اور مقام و مرتبہ نصیب ہو جائے.....

(۲) یعنی جب وہ انسانوں کے بارے میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا تو اللہ کے بارے میں وہ کس طرح یہ جھوٹا دعویٰ

کر سکتا ہے کہ اس نے مجھے نبی بنا کر بھیجا ہے.....؟

ہوتا ہے۔

☆.....تم نے اقرار کیا کہ وہ نماز اور نیکی کی تاکید و تلقین کرتے ہیں..... سچے نبیوں کی تعلیمات ایسی ہی پاکیزہ ہوا کرتی ہیں۔

اور پھر قیصر کچھ دیکسی سوچ میں میں گم رہا..... پھر..... قدرے توقف کے بعد یوں کہنے لگا..... فَإِنْ كَانَ مَا تَقُولُ حَقًّا..... فَسَيَمْلِكُ مَوْضِعَ قَدَمَيَّ هَاتَيْنِ..... یعنی نبوت کا دعویٰ کرنے والے اس شخص کے بارے میں جو کچھ تم بتا رہے ہو..... اگر یہ سب درست ہے..... تو بہت جلد میرے پایہ تخت تک ان کا قبضہ ہو جائے گا (۱)

اور پھر مزید کہنے لگا ”وَقَدْ كُنْتُ أَعْلَمُ أَنَّهُ خَارِجٌ، وَلَمْ أَكُنْ أَظُنُّهُ مِنْكُمْ“، یعنی مجھے اس بات کا علم تھا کہ وہ عنقریب ظاہر ہونے والے ہیں، لیکن مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ تم میں ظاہر ہو جائیں گے (۲)

اور پھر مزید کہنے لگا ”فَلَوْ أَنِّي أَعْلَمُ أَنِّي أَخْلَصُ إِلَيْهِ لَتَجَشَّمْتُ لِقَاءَهُ، وَلَوْ كُنْتُ عِنْدَهُ لَعَسَلْتُ عَنْ قَدَمَيْهِ“ (۳) یعنی ”اگر میں یہ جان سکوں کہ میرے لئے کسی طرح ان تک رسائی ممکن ہے تو میں ضرور بڑی بیتابی کے ساتھ ان کی خدمت میں

(۱) یعنی جب وہ سچے نبی ہیں تو پھر یقیناً ان کے ساتھ اللہ کی طرف سے تائید و نصرت بھی ہوگی، لہذا ان کے دین کو پھلنے پھولنے سے کوئی نہیں روک سکتا، اور نتیجہ یہ ہوگا کہ عنقریب بہت جلد یہاں ہمارے ملک اور پایہ تخت تک ان کا قبضہ ہو جائے گا۔

(۲) یعنی چونکہ گذشتہ آسمانی کتابوں میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں تذکرہ اور بشارتیں موجود تھیں، نیز آپ کے ظہور کی علامات بھی بیان کی گئی تھیں، اہل کتاب یہ سب کچھ اپنی کتابوں میں پڑھا کرتے تھے، لہذا انہیں اس بارے میں خوب علم تھا، البتہ انہیں یہ امید نہیں تھی کہ وہ آخری نبی ان اہل کتاب کی بجائے مکہ میں عربوں میں ظاہر ہو جائیں گے۔

(۳) صحیح بخاری [۷] باب بدء الوحی۔

حاضر ہوتا..... اور اگر میں ان تک پہنچ سکتا تو ضرور میں خود ان کے پاؤں دھوتا۔“

یعنی اتنی بڑی سلطنت کا اس قدر عظیم بادشاہ..... رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ الفاظ کہنے لگا..... کہ..... اگر میرے بس میں ہوتا تو میں بڑی بیتابی اور شوق کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضری دیتا..... اور میں خود ان کے پاؤں دھوتا۔

شاہی دربار میں موجود تمام بڑی بڑی شخصیات..... مشیروں، وزیروں، ودیگر درباریوں نے جب اپنے بادشاہ کی زبانی یہ باتیں سنیں تو وہ حیران و پریشان اور انگشت بندناں رہ گئے..... اور اس سوچ میں پڑ گئے کہ ہمارے بادشاہ کو کیا ہو گیا.....؟ اور تب وہاں آوازیں بلند ہونے لگیں، ایک شور و غل پر پا ہو گیا، افراتفری کا ماحول پیدا ہو گیا، اتنے بڑے بادشاہ کا وہ دربار کہ جہاں شاہی جاہ و جلال اور رعب و دبدبے کی وجہ سے ہمہ وقت بڑی ہیبت طاری رہتی تھی، اور پُر وقار فضاء بنی رہتی تھی..... اب وہاں یہ شور و غل..... یہ بد نظمی اور یہ افراتفری..... یہ منظر دیکھ کر قیصر پریشان ہو گیا، اور معاملے کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اس نے کسی بھی طرح اس معاملے کو ٹالنے کی کوشش کی، اور دین اسلام نیز پیغمبر اسلام کی صداقت و حقانیت کو خوب جان لینے اور سمجھ لینے کے باوجود محض اپنی حکومت اور تاج و تخت بچانے کی خاطر اس نے دین اسلام قبول نہیں کیا..... اور یوں اس نے آخرت کی ابدی ودائمی سعادت مندی و کامیابی کے مقابلے میں دینا کی عارضی وفانی شان و شوکت کو ترجیح دی اور دین برحق قبول کرنے کی ابدی سعادت سے محروم رہ گیا۔

☆..... کسریٰ:

دعوتِ اسلام کے سلسلے میں دوسرا خط روئے زمین کی دوسری بڑی سلطنت اور عظیم قوت ”فارس“ کے بادشاہ کے نام لکھا گیا، اُس دور میں سلطنتِ فارس کا جو بھی بادشاہ ہوتا اُسے

”کسری“ کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، اُس زمانے میں ”خسر پرویز“ نامی شخص کسری تھا، یعنی فارس کا بادشاہ تھا۔

سلطنتِ فارس کا اگرچہ بڑا جاہ و جلال تھا، نیز یہ کہ خسر پرویز ہی کا (ساسانی) خاندان ایک ہزار سال سے مسلسل نسل در نسل وہاں حکمرانی کر رہا تھا، لیکن بالخصوص خسر پرویز کے دورِ حکومت میں سلطنتِ فارس کو جو جاہ و جلال اور عروج حاصل ہوا، نیز وہاں کے شاہی دربار کو جوشان و شوکت اور رعب و دبدبہ نصیب ہوا..... یہ چیز اس سے قبل کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی غرضیکہ خسر پرویز انتہائی شان و شوکت اور جاہ و جلال والا بادشاہ تھا۔

رسول اللہ ﷺ کے قاصد کی حیثیت سے مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ (۱) نے ایک روز اپنے اہل و عیال کو الوداع کہا..... اور آپ کا نام مبارک کسریٰ تک

(۱) عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ کسی بھی عام انسان کی طرح مکہ کے گلی کوچوں میں کھیلتے کودتے ہوئے جوان ہوئے تھے..... لیکن دین اسلام قبول کرنے کے بعد ان کے ساتھ ”قیصر کسریٰ“ کے حوالے سے ایسے حالات و واقعات پیش آئے کہ جن کی وجہ سے ان کا تذکرہ ہمیشہ کیلئے تاریخ کے صفحات میں بلکہ کتب حدیث میں محفوظ ہو گیا، اُس وقت روئے زمین کی دونوں عظیم ترین قوتوں کے بادشاہوں کے ساتھ ان کی ملاقات ہوئی، اور عجیب و غریب حالات و واقعات پیش آئے، کسریٰ خسر پرویز کے ساتھ تو ان کی ملاقات اسی موقع پر یعنی سن ۶ ہجری میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے مختلف فرمانرواؤں کے نام دعوتی خطوط ارسال کئے جانے کے موقع پر ہوئی، جبکہ سنہ ۱۹ ہجری میں خلیفہ دوم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جب مشرق و مغرب میں ہر طرف اسلامی فتوحات کا ایک سیلاب جاری تھا..... تب یہ ملکِ شام میں سلطنتِ روم کے خلاف برسرِ پیکار اسلامی لشکر میں شامل تھے، وہاں ایک بار عجیب و غریب قسم کے حالات میں ایک ”قیدی“ کی حیثیت سے انہیں قیصرِ روم کے سامنے پیش کیا گیا..... اور تب کس کس طرح اس نے ان کی دینی استقامت کا امتحان لیا..... اور کیا کیا واقعات پیش آئے..... اور کس طرح یہ سرخ رو ہو کر وہاں سے واپس مدینہ پہنچے..... ان واقعات کی وجہ سے تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ روشن رہے گا..... اگر اللہ کی طرف سے توفیق شامل حال رہی..... اور زندگی نے وفاء کی..... تو ان شاء اللہ کبھی ان کے حالات مفصل تحریر کروں گا، و ما توفیقی الا باللہ، علیہ توکلت والیہ اُنیب۔

پہنچانے کی غرض سے یکہ دتہا..... اپنے اللہ پر بھروسہ کئے ہوئے، مدینہ سے ہزاروں میل کی مسافت پر واقع سلطنتِ فارس کے دارالحکومت ”مدائن“ کی جانب محو سفر ہو گئے..... اور وہاں پہنچنے کے بعد شاہی دربار میں جا کر نامہ مبارک خسرو پرویز کے حوالے کیا، جسے پڑھنے کیلئے خسرو نے اپنے مترجم کو طلب کیا۔

اُس دور میں فارس کے شاہی دربار میں یہ دستور تھا کہ خسرو پرویز کے نام جو بھی خط تحریر کیا جاتا اُس میں سب سے اوپر خسرو کا نام لکھا جاتا، جبکہ رسول اللہ ﷺ کے نامہ مبارک میں جب خسرو کو سب سے اوپر اللہ عز و جل کا نام نظر آیا..... تو وہ انتہائی غضبناک اور آگ بگولہ ہو گیا..... اور خط پڑھے بغیر ہی اسے چاک کر ڈالا..... اور پھر رسول اللہ ﷺ کے قاصد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے اپنے درباریوں کو حکم دیا کہ اسے دھکے دے کر یہاں سے نکال دیا جائے..... نیز اس بد بخت نے اپنے کچھ کارندوں کو مدینہ بھی بھیجا تا کہ نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ کو گرفتار کر کے اس کے سامنے پیش کیا جائے (۱)

رسول اللہ ﷺ کے قاصد عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ سلطنتِ فارس سے واپس سفر کرتے ہوئے مدینہ پہنچے، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تمام صورتِ حال بیان کی، نیز یہ بھی بتایا کہ بد بخت خسرو پرویز نے آپ کا نامہ مبارک پرزے پرزے کر ڈالا..... محض اس لئے کہ اُس میں سب سے اوپر اللہ عز و جل کا نام لکھا ہوا تھا..... یہ سن کر آپ ﷺ نے فقط اتنا فرمایا ”مَرَّقَ اللّٰهُ مُلْكَهُ“، یعنی ”اللہ کرے اس کا ملک بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے“، یعنی جس طرح اس نے اس خط کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا.....

(۱) ان کارندوں کی مدینہ آمد اور پھر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گفتگو..... اور پھر اس کا نتیجہ..... یہ الگ موضوع ہے، جو کہ تفصیل طلب ہے۔

اللہ کرے اسی طرح اس کی بادشاہت اور اس کے ملک کے بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں.....
 اللہ کی قدرت ملاحظہ ہو کہ اس واقعے کے بعد ابھی چند روز ہی گزرے تھے کہ اس قدر جاہ
 و جلال اور رعب و دبدبے والا بادشاہ جو کہ خود کو ”شہنشاہ“ یعنی بادشاہوں کا بادشاہ کہلاتا تھا
 مارا گیا..... اور اس سے بھی بڑی بدبختی یہ ہو گئی کہ خود اپنے ہی بیٹے ”شیرویہ“ کے ہاتھوں
 مارا گیا، اس کا اپنا ہی بیٹا اسے قتل کر کے اس کے ملک اور تخت و تاج کا مالک بن بیٹھا۔

☆..... نجاشی شاہ حبشہ:

دعوتِ اسلام کے سلسلے میں ایک خطِ ملکِ حبشہ کے بادشاہ کے نام تحریر کیا گیا، اُس زمانے
 میں حبشہ کے بادشاہ کو ”نجاشی“ کے لقب سے پکارا جاتا تھا، اور جس دور میں یہ خط ارسال
 کیا گیا اُن دنوں ”اصحٰمہ“ نامی شخص نجاشی تھا، یعنی ملکِ حبشہ کا بادشاہ تھا، رسول اللہ ﷺ
 کے قاصد کی حیثیت سے یہ نامہ مبارک حضرت عمرو بن اُمیہ الضمری رضی اللہ عنہ لے
 کر گئے۔

نجاشی تو دراصل بہت پہلے سے ہی دینِ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی حقانیت و صداقت
 کا معترف تھا، دینِ اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں جب نبوت کا پانچواں سال چل
 رہا تھا، مشرکین مکہ کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ ظلم و زیادتی اور ایذا رسانیوں کا سلسلہ
 اپنے عروج پر تھا..... تب رسول اللہ ﷺ کے مشورے پر بہت سے مسلمان مکہ سے ملکِ
 حبشہ کی جانب ہجرت کر گئے تھے، اور تب مشرکین مکہ کا ایک وفد بھی ان کے تعاقب میں
 حبشہ پہنچا تھا، اور نجاشی کے سامنے ان مسلمانوں پر اپنے آباؤ اجداد کے دین سے غداری
 اور فتنہ و فساد پھیلانے کا الزام عائد کرتے ہوئے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا، نجاشی نے
 اس موقع پر ان مسلمانوں کا موقف بھی سنا تھا اور دینِ اسلام کے بارے میں ان سے بہت

کچھ معلومات حاصل کی تھیں اور بہت متاثر ہوا تھا، اور پھر اس نے مشرکین مکہ کے وفد کو وہاں سے واپس لوٹ جانے کا حکم دیا تھا، جبکہ مسلمانوں کیلئے یہ فیصلہ سنایا تھا کہ یہ جب تک چاہیں یہاں ہمارے ملک میں راحت و سکون اور امن و امان کے ساتھ بے خوف و خطر زندگی بسر کر سکتے ہیں (۱)

لہذا نجاشی تو تبھی سے رسول اللہ ﷺ نیز دین اسلام کی حقانیت سے واقف تھا اور اس چیز کا معترف بھی تھا، البتہ اب رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اسے باقاعدہ دعوتِ اسلام کے سلسلے میں نامہ مبارک موصول ہوا تو اب اس نے باقاعدہ اپنے قبولِ اسلام کا اعلان کیا، اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جوابی خط تحریر کر کے اس چیز کی باقاعدہ اطلاع بھی دی، جس پر آپؐ نے نہایت مسرت کا اظہار فرمایا اور اس کیلئے دعائے خیر بھی فرمائی۔

☆..... مقوقس شاہ مصر:

ایک خط مقوقس شاہ مصر کو لکھا گیا، رسول اللہ ﷺ کے قاصد کی حیثیت سے مقوقس کو یہ خط حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے پہنچایا، مقوقس نے رسول اللہ ﷺ کے قاصد کا بہت زیادہ احترام کیا اور خوب مہمان نوازی کی، نیز دین اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں بہت سے سوالات کئے اور بہت سی معلومات حاصل کیں، جس پر وہ انتہائی متاثر ہوا، رسول اللہ ﷺ کی اور دین اسلام کی بہت زیادہ تعریفیں کرتا رہا اور اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کرتا رہا..... البتہ اصل مقصد جس کی خاطر یہ نامہ مبارک تحریر کیا گیا تھا..... یعنی اسے قبولِ اسلام کی دعوت دی گئی تھی، اس بارے میں وہ کچھ نہیں بولا..... مکمل خاموشی اختیار کئے رکھی..... اور آخر چند روز بعد رسول اللہ ﷺ کیلئے بہت سے قیمتی ہدایا و تحائف اور نیک تمناؤں کے

(۱) اس بارے میں تفصیل ”ہجرت حبشہ“ کے بیان میں گزر چکی ہے، صفحہ: ۱۷۱۔

اظہار کے ساتھ اس نے آپؐ کے قاصد کو واپس روانہ کر دیا۔

☆..... ان بڑی بڑی سلطنتوں کے علاوہ متعدد چھوٹی بڑی ریاستوں کے حکمرانوں اور فرمانرواؤں کو بھی دعوتی خطوط تحریر کئے گئے، مثلاً بحرین اور عُمان وغیرہ..... جس کے نتیجے میں ان میں سے کسی نے دینِ اسلام قبول کیا، کسی نے انکار کیا، اور کسی نے محض نیک تمناؤں کے اظہار پر اکتفاء کیا۔

غرضیکہ ان مختلف فرمانرواؤں کے نام ان دعوتی خطوط کے ذریعے ارشادِ ربانی: ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَ الْأَرْضِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ﴾ (۱) یعنی ”آپؐ کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا ہوں جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے“ کی تعمیل بھی ہو گئی۔

نیز یہ کہ اس طرح دینِ اسلام کی نشر و اشاعت کا سلسلہ اب جزیرۃ العرب کی حدود سے نکل کر بیرونی دنیا تک وسعت اختیار کر گیا، اور اب وہاں بھی دینِ اسلام کے بارے میں چرچے ہونے لگے..... یوں مجموعی طور پر مسلمانوں کے حق میں یہ چیز بہت ہی مفید ثابت ہوئی اور اس کے خوشگوار نتائج برآمد ہوئے۔

(۱) الاعراف [۱۵۸]

الحمد للہ آج بتاریخ ۲/ ذوالحجہ ۱۴۳۲ھ، مطابق ۷/ اکتوبر ۲۰۱۳ء بروز پیر یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ، وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

غزوہ خیبر:

ہجرت کے چھٹے سال جب صلح حدیبیہ کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ اپنے جاں نثار ساتھیوں کے ہمراہ عمرہ کئے بغیر مکہ سے واپس مدینہ پہنچے، تو وہاں کچھ اس قسم کی خبریں موصول ہوئیں کہ خیبر کے یہودی بڑے لشکر کے ساتھ اور پوری تیاری کے ساتھ مدینہ پر حملے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔

اس سے قبل آپؐ یہودیوں کو ان کی مسلسل ریشہ دوانیوں اور مسلمانوں کے خلاف مسلسل سازشوں کی وجہ سے مدینہ سے نکال چکے تھے (۱) خیبر میں ان کی بڑی تعداد آباد تھی اور وہ ان کی قوت کا مرکز تھا، مزید یہ کہ مدینہ سے نکالے گئے ان کے بعض مشہور اور طاقتور قبیلے خصوصاً ”بنو نضیر“ اور ”بنو قریظ“ بھی اب خیبر میں ان سے آملے تھے۔

صلح حدیبیہ کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے جاں نثار ساتھیوں کو مشرکین مکہ کی طرف سے جب قدرے بے فکری نصیب ہوئی تو اب اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپؐ نے یہودی سرکوبی کی غرض سے مناسب کارروائی کا فیصلہ فرمایا، چنانچہ اسی سلسلے میں طے یہ پایا کہ بجائے اس کے کہ یہیں مدینہ میں بیٹھ کر یہودی فوج کی یہاں آمد کا انتظار کیا جائے..... بہتر یہ ہے کہ خود ان کی طرف کوچ کیا جائے اور انہیں مزید مہلت نہ دی جائے۔

(۱) مدینہ سے یہود کے اخراج یا جلا وطنی کیلئے قرآن کریم میں ”حشر“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور ان کے اس حشر کا مفصل تذکرہ ”سورۃ الحشر“ میں موجود ہے۔

چنانچہ سن سات ہجری میں رسول اللہ ﷺ اپنے چودہ سو جاں نثاروں کے ہمراہ مدینہ سے سفر کرتے ہوئے تقریباً ایک سو پچاس کلومیٹر کی مسافت پر واقع شہر ”خیبر“ پہنچے، مسلمانوں کی وہاں آمد پر وہ لوگ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے، جس پر مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کر لیا، مروز وقت کے ساتھ متعدد چھوٹے بڑے قلعے فتح ہوتے چلے گئے، کہیں معمولی مزاحمت ہوئی، کہیں بڑی جنگ کی نوبت بھی آئی، البتہ ایک بہت بڑا قلعہ تھا جہاں کارروائی آگے نہیں بڑھ رہی تھی، محاصرہ کافی طول پکڑ چکا تھا اور یہ چیز خود مسلمانوں کیلئے بھی کافی تشویش کا باعث بنی ہوئی تھی..... آخر ایک روز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”لَا عَظِیْنَ السَّيِّئَةِ غَدَاً رَجُلًا يُحِبُّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيُحِبُّهُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ“ یعنی ”کل میں جھنڈا ایسے شخص کو دوں گا جو اللہ اور رسول سے محبت کرتا ہے، اور اللہ اور رسول بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔“

ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے یہ بہت بڑی خوشخبری تھی..... اور بہت بڑی گواہی تھی..... اُس شخص کے بارے میں کہ جسے کل علم سونپا جانا تھا اور سپہ سالاری و قیادت کی ذمہ داری جس کے حوالے کی جانی تھی..... اس کے حق میں یہ بہت بڑی گواہی تھی کہ وہ اللہ اور رسول سے محبت کرتا ہے، نیز اللہ اور رسول بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔

چنانچہ لشکر میں موجود بڑے بڑے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے وہ رات اسی آرزو میں گزاری کہ کاش کل صبح رسول اللہ ﷺ میرا نام پکاریں..... اور جب صبح کا سورج طلوع ہوا تو رسول اللہ ﷺ کی آواز گونجی ”أَيُّنَ عَلِيٍّ“ یعنی ”علی کہاں ہیں؟“ تب حضرت علی رضی اللہ عنہ حاضر خدمت ہوئے، رسول اللہ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے انہیں علم عطا فرمایا، نیز فتح اور خیر و برکت کی دعائیں دیتے ہوئے انہیں رخصت فرمایا۔

رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اسلامی لشکر کی قیادت کرتے ہوئے دشمن کی جانب پیش قدمی کرنے لگے، آمناسا منا ہوا، کافی سنسنی خیز اور اعصاب شکن قسم کی جنگ لڑی گئی۔

اس موقع پر یہودی فوج کی قیادت ”مرحب“ نامی شخص کر رہا تھا، جس کا بڑا رعب اور دبدبہ تھا..... جس کی بہادری کے بڑے چرچے تھے..... مزید یہ کہ وہ اُس دور کا بڑا نامی گرامی پہلوان بھی تھا..... چنانچہ اس نے انتہائی غرور و تکبر کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لاکارا، جواب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس پر ایسا بھرپور وار کیا کہ غرور و تکبر کا وہ پتلا..... پلک جھپکتے میں ہی زمیں بوس ہو گیا..... اور پھر آخر تمام شہر ”خیبر“ مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہو گیا، اور رسول اللہ ﷺ اپنے لشکر سمیت کامیاب و کامران واپس مدینہ تشریف لے آئے۔



الحمد للہ آج بتاریخ ۳/ ذوالحجہ ۱۴۳۳ھ، مطابق ۸/ اکتوبر ۲۰۱۳ء بروز منگل یہ باب مکمل ہوا۔
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ، وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

فتح مکہ:

مدنی زندگی کے تیسرے دور کا آغاز:

”صلح حدیبیہ“ کے بعد تقریباً دو سال امن سے گزرے، لیکن قریش مکہ کو یہ امن پسند نہ آیا..... اور انہوں نے عہد شکنی کی، ان کے ایک حلیف قبیلے ”بنو بکر“ نے مسلمانوں کے حلیف قبیلے ”بنو خزاعہ“ پر ایک رات اچانک حملہ کر دیا، بہت سے لوگوں کو قتل کر ڈالا، بے حد نقصان پہنچایا، اور بڑی تعداد میں مویثی (۱) بھی ہنکا لے گئے..... صلح حدیبیہ کی رو سے قریش کو چاہئے تھا کہ وہ اپنے حلیف قبیلے کو اس خونریزی اور شرانگیزی سے روکتے، لیکن ایسا کرنے کی بجائے خود انہوں نے بھی اپنی فطری شریعت پرستی کا ثبوت دیتے ہوئے جان و مال سے انہیں پوری طرح مدد فراہم کی، جو کہ اس معاہدہ صلح کی صریح خلاف ورزی تھی اور بہت بڑی عہد شکنی تھی۔

مسلمانوں کے حلیف قبیلے کا ایک وفد مکہ سے سفر کرتا ہوا مدینہ پہنچا، رسول اللہ ﷺ کے سامنے اس بارے میں فریاد کی، اور مدد کا طلبگار ہوا۔

اس پر رسول اللہ ﷺ نے فوری اقدام کے طور پر اپنا ایک قاصد قریش مکہ کی جانب روانہ فرمایا، تاکہ وہ انہیں یاد دہانی کرائے کہ ان کی یہ حرکت معاہدہ صلح کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ نیز اس موقع پر اس قاصد نے ان کے سامنے وہ تین تجاویز پیش کیں جو کہ رسول اللہ ﷺ

(۱) یہاں یہ وضاحت ہو جائے کہ اصل میں یہ لفظ ”مواثی“ ہے، لیکن چونکہ اردو میں بڑے پیمانے پر ”مویثی“ مشہور چکا ہے..... لہذا میں نے بھی مویثی ہی لکھنا مناسب سمجھا۔

نے اس قاصد کے ذریعے ان کیلئے بھجوائی تھیں:

☆ پہلی تجویز یہ کہ قریش مکہ اپنے حلیف قبیلہ کو اس بات پر مجبور کریں کہ وہ مسلمانوں کے حلیف قبیلہ کو پہنچنے والے نقصان کی مکمل تلافی کرے اور ”خون بہا“ وغیرہ ادا کرے۔

☆ دوسری تجویز یہ کہ اگر وہ اپنے اس حلیف قبیلہ کو نقصان کی تلافی پر مجبور نہیں کر سکتے تو پھر ان سے لافعلی اور مکمل براءت و بیزاری کا اعلان و اظہار کریں۔

☆ اگر وہ ان مذکورہ دونوں تجویزوں میں سے کسی پر بھی عمل نہیں کرتے تو پھر تیسری اور آخری تجویز یہ کہ اس معاہدہ صلح کو ختم کر دیا جائے..... کیونکہ جس صلح کی نہ تو کوئی پابندی ہو، اور نہ ہی اس کا کوئی فائدہ ہو..... تو پھر ایسی صلح کا کیا فائدہ.....؟ کہ جس کی پابندی ہی نہیں کرنی۔

قریش مکہ نے اس قاصد کی زبانی رسول اللہ ﷺ کی طرف سے پیش فرمودہ یہ تینوں تجاویز سنیں، اور تب انہوں نے گھنڈ میں آ کر تیسری تجویز قبول کی، یعنی معاہدہ صلح کے خاتمے کا اعلان کر دیا، اور قاصد کو یہ کہتے ہوئے واپس چلے جانے کو کہا کہ ”آج کے بعد ہماری تمہاری صلح ختم.....“ اس کا صریح مطلب یہ تھا کہ اب مشرکین مکہ کی طرف سے مسلمانوں کیلئے دوبارہ یہ ”اعلان جنگ“ تھا۔ (۱)

رسول اللہ ﷺ کا قاصد واپس مدینہ پہنچا، اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر تمام صورت حال سے مطلع کیا..... اس پر آپؐ نے بھی اپنے جان نثار صحابہ کرام کو جنگ کیلئے تیاری کا حکم دیا، اور پھر سن آٹھ ہجری میں جب رمضان کا مبارک مہینہ چل رہا تھا..... تب

(۱) اوریوں مدنی زندگی کا دوسرا دور جس کی ابتداء ”صلح حدیبیہ“ سے ہوئی تھی، دو سال جاری رہنے کے بعد اپنے اختتام کو پہنچا، اور اب تیسرے اور آخری دور کا آغاز ہوا۔

رسول اللہ ﷺ دس ہزار جاں نثاروں پر مشتمل لشکر کی قیادت کرتے ہوئے مدینہ سے مکہ کی جانب محو سفر ہو گئے۔

اور جب یہ لشکر سینکڑوں میلوں کی طویل مسافت طے کرنے کے بعد مکہ کے مضافات میں پہنچا، تب مشرکین مکہ نے اس خدائی فوج کا جوش و جذبہ اور جاہ و جلال دیکھا..... تو وہ حیران و پریشان اور دم بخود رہ گئے، انہیں اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا..... اور تب انہیں اس لشکر کا مقابلہ کرنے کی یا آگے بڑھ کر کسی قسم کی مزاحمت یا مقابلہ کرنے کی جرأت ہی نہ ہو سکی..... اور یہ خدائی فوج اندرون مکہ کی جانب مسلسل پیش قدمی کرتی چلی گئی۔

رسول اللہ ﷺ آج مکہ میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہو رہے تھے، آٹھ سال قبل آپ جہاں سے خفیہ طور پر انتہائی کسمپرسی و بے بسی کے عالم میں نکلے تھے..... آج وہاں عظیم فاتح و غالب کی حیثیت سے داخل ہوتے وقت کوئی جشنِ فتح نہیں تھا..... کوئی جوشِ انتقام نہیں تھا..... کوئی دھوم دھڑکانہیں تھا..... کوئی شادیانے نہیں بج رہے تھے..... کوئی فخر نہیں تھا..... کوئی غور نہیں تھا..... اور کوئی لوٹ مار نہیں تھی..... وہاں تو بس یہ کیفیت تھی کہ..... آپ اپنے رب کے سامنے انتہائی خشوع و خضوع کا مظاہرہ کرتے ہوئے..... اور اپنے رب کی تسبیح اور حمد و ثناء بیان کرتے ہوئے..... آگے بڑھ رہے تھے، اور اس قدر عجز و انکسار تھا کہ بار بار آپ کی پیشانی مبارک آپ کی اوٹنی کی گردن سے ٹکرانے لگتی تھی..... (۱)

(۱) اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے اس عظیم نعمت اور اتنی بڑی فتح کے موقع پر کہ جسے قرآن کریم میں ”فتحِ مبین“ کے نام سے یاد کیا گیا..... اس موقع پر آپ کا اپنے رب کے سامنے اس قدر عجز و انکسار اور خشوع و خضوع..... یقیناً اس میں امت کیلئے بھی یہ اہم ترین سبق ہے کہ جس قدر اللہ کی طرف سے نعمتوں کا سلسلہ بڑھتا جائے اسی قدر بندہ مؤمن کی گردن بھی اپنے خالق و مالک کے سامنے جھکتی چلی جائے..... اور اسی قدر اس منعم و محسن کی عبادت اور اطاعت و فرمانبرداری کا جذبہ بڑھتا چلا جائے.....

اس کیفیت میں آپ اپنے جاں نثار ساتھیوں کی معیت میں مکہ شہر میں داخل ہوئے..... اور اس موقع پر مکہ شہر کے گلی کوچوں سے گذرتے وقت آپ نے اعلان فرمایا ”جو کوئی اپنے گھر کا دروازہ بند رکھے گا، اُس کیلئے امان ہے، جو کوئی بغیر ہتھیار کے خالی ہاتھ نظر آئے گا اس کیلئے بھی امان ہے، جو کوئی کعبۃ اللہ میں داخل ہو جائے، اس کیلئے بھی امان ہے۔“

اس موقع پر سردارانِ قریش میں سے مشہور شخصیت ابوسفیان نے دینِ اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا، تب رسول اللہ ﷺ نے شہر مکہ میں ان کے مقام و مرتبہ کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی دلجوئی کی خاطر یہ اعلان بھی فرمایا کہ ”جو کوئی ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے، اس کیلئے بھی امان ہے۔“

قابلِ غور ہے یہ بات کہ فتح مکہ کے اس تاریخی موقع پر کہ جب رسول اللہ ﷺ مکمل باختیار اور غالب و فاتح تھے..... جبکہ قریش مکہ مغلوب و لاچار تھے..... لیکن اس کے باوجود آپ نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کوئی ایسا اعلان نہیں کیا کہ ”آج جو کوئی مسلمان ہو جائے، فقط اسی کیلئے امان ہے.....“ ایسی کوئی دھمکی نہیں دی کہ ”آج جان بچانے کا بس ایک ہی طریقہ ہے کہ سب مسلمان ہو جاؤ.....“ بلکہ بس یہ فرمایا کہ جو کوئی اپنے گھر کا دروازہ بند رکھے..... یا بغیر ہتھیار کے نظر آئے..... اس کیلئے امان ہے..... یعنی جو ہمیں تنگ نہیں کرے گا..... ہم بھی اسے تنگ نہیں کریں گے.....!!

☆..... اس موقع پر رسول اللہ ﷺ کے جاں نثار ساتھیوں میں سے جو مہاجرین تھے کہ جن کا اصل وطن یہی شہر مکہ ہی تھا، آج وہ آٹھ سال بعد اپنے وطن اپنے شہر اور اپنے آباؤ اجداد کے گھروں کو دیکھ رہے تھے..... جہاں وہ پیدا ہوئے..... جہاں کھیلے کودے..... جہاں بچپن گزارا..... اور پھر آج سے آٹھ سال قبل انتہائی بے سروسامانی اور کسمپرسی کی کیفیت میں

مجبور و لاچار..... سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر..... بس خالی ہاتھ..... چل دیئے تھے..... یوں پرانی یادیں تازہ ہو گئیں..... اور ان کے دل بھر آئے..... مگر اس موقع پر ان سب نے مکمل نظم و ضبط کا مظاہرہ کیا..... جذبات کی شدت کے باوجود ان میں سے کسی نے آگے بڑھ کر یہ تقاضا نہیں کیا کہ یہ میرا اپنا گھر..... اب میرے حوالے کر دیا جائے..... کسی نے اپنے آبائی گھر..... زمین جائیداد..... یا مال و اسباب کی واپسی کا کوئی مطالبہ نہیں کیا..... اب ان کیلئے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت اور اطاعت و فرمانبرداری ہی سب سے بڑی دولت تھی.....!

☆..... اسی طرح شہر مکہ کے ان گلی کوچوں سے گذرتے ہوئے انہیں ہجرت سے پہلے کا وہ دور بھی یاد آیا..... مشرکین مکہ کی طرف سے وہ بدسلوکیاں..... وہ اذیت رسانیاں..... کس طرح ان ظالموں اور وحشیوں نے انہیں تیرہ سال مسلسل اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنائے رکھا..... ان کے ظلم و ستم کی ایک ایک داستان..... اور ایک ایک نقش ابھر کر..... آج ان کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا..... مگر اس کے باوجود..... آج تمام قدرت کے باوجود..... انہوں نے کسی سے کوئی انتقام نہیں لیا..... کوئی قتل و غارتگری نہیں مچائی..... کوئی لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم نہیں کیا.....

☆..... رسول اللہ ﷺ اپنے جاں نثار ساتھیوں کے ہمراہ اسی طرح مسلسل پیش قدمی کرتے رہے..... حتیٰ کہ آخری منزل یعنی ”بیت اللہ“ تک جا پہنچے..... وہاں پہنچنے کے بعد آپؐ نے رُک کر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی..... تب کیا منظر نظر آیا.....؟ ہر طرف وہی پرانے چہرے..... بڑے بڑے مجرم..... خونی اور قاتل..... وہی پرانے دشمن..... آج بے بس..... شرمندہ..... سر جھکائے ہوئے اور نگاہیں نیچی کئے ہوئے نظر آئے..... یہ وہی لوگ جو آپ ﷺ

کے خون کے پیاسے تھے..... جانی دشمن تھے..... جنہوں نے مکہ میں آپ کے قتل کی سازش کی..... آپ کے ساتھیوں کے ساتھ ہر قسم کا ظلم روا رکھا..... ہر قسم کی بدسلوکی کیلئے انہیں تحیۃ مشق بنائے رکھا..... اور پھر جب آپ نیز آپ کے ساتھی اپنے آبائی شہر مکہ کو..... نیز اپنے آبائی گھروں کو چھوڑ کر پناہ کی تلاش میں ان مشرکین مکہ سے بہت دور چلے گئے..... ایک نئی جگہ..... اجنبی اور نامانوس جگہ..... تب وہاں سینکڑوں میل دور مدینہ میں بھی ان مشرکین مکہ نے ان مسلمانوں کے خلاف اپنی شرارتوں..... اپنی سازشوں..... اور ایذا رسانیوں کا سلسلہ جاری رکھا..... وہاں مدینہ جا کر ان پر جنگیں مسلط کرتے رہے، انہیں نیست و نابود کر ڈالنے کے منصوبے بناتے رہے، وہاں اندرونی چھپے ہوئے دشمنوں اور منافقوں کے ساتھ مل کر یہ بیرونی دشمن ہمیشہ ریشہ دوانیوں میں مشغول و منہمک رہے.....

اور اس سے بھی قبل جب نبوت کے پانچویں سال ان کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر پناہ کی تلاش میں بہت سے مسلمان مکہ سے بہت دور ملک حبشہ میں جا بسے تھے..... تب بھی یہ مشرکین مکہ وہاں اپنے وفود بھیجتے رہے..... وہاں کے بادشاہ کو مسلمانوں کے خلاف مسلسل بھڑکاتے اور ورغلا تے رہے..... تاکہ وہ دوبارہ ان مسلمانوں کو ان ظالموں کے حوالے کر دے.....

☆..... رسول اللہ ﷺ ہجرت سے قبل مکہ میں قیام کے دوران کس قدر محبت، نرمی اور پیار کے ساتھ تیرہ سال مسلسل انہیں اللہ کے دین کی طرف بلاتے رہے..... تیرہ سال مسلسل ان پر ”اخلاق کے پھول“ برساتے رہے..... جبکہ جواب میں یہ مشرکین مکہ تو بس ہمیشہ پتھر ہی برساتے رہے تھے.....

لیکن اس کے باوجود اب فتح مکہ کے اس یادگار اور تاریخی موقع پر رسول اللہ ﷺ نے تمام تر قدرت اور اختیار کے باوجود..... ان بدترین دشمنوں اور مجرموں سے کوئی انتقام یا کوئی سزا

تو درکنار..... انہیں کوئی ملامت تک نہیں کی.....

”عفو و درگذر“ کی تعلیم دینا بہت آسان ہے، لیکن عملی زندگی میں ان تعلیمات کو اپنانا..... اپنے قاتلوں، بدخواہوں، اور ستانے والوں کو مکمل قدرت و استطاعت کے باوجود یوں کسی ملامت کے بغیر معاف کر دینا..... یقیناً یہ تو بس ”نعمی رحمت“ ہی کی شان تھی.....

”عفو و درگذر“ کے باب میں ایسی روشن مثال دنیا کی تاریخ میں کہیں اور نہیں مل سکے گی.....!

فتح مکہ کے اس تاریخی موقع پر رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ اس ”حسن سلوک“ سے یہ حقیقت بھی واضح و ثابت ہوتی ہے کہ دین اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا..... رسول اللہ ﷺ نے تلوار چلا چلا کر..... اور تلوار کی نوک سے ڈرا ڈرا کر کسی کو مسلمان نہیں بنایا..... یہ دین تو آپؐ کی شب و روز اور صبح و شام دعوتی و اصلاحی کوششوں سے..... نیز آپؐ کے ”حسن اخلاق“ سے..... مشرق و مغرب میں اور دنیا کے کونے کونے میں پھیلا ہے.....

ہاں البتہ دشمنوں نے ہمیشہ تلوار کے ذریعے دین اسلام کا راستہ روکنے کی مذموم کوششیں کیں..... مگر..... دین اسلام تلوار کے مقابلے میں ہمیشہ پھلتا پھولتا ہی رہا..... اگر دین اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہوتا..... تو فتح مکہ کے موقع پر ان تمام بدترین دشمنوں کو تہ تیغ کرنے کیلئے..... اور..... ان کے سر قلم کرنے کیلئے..... رسول اللہ ﷺ کی طرف سے فقط ایک اشارہ ہی بہت کافی تھا..... لیکن ایسا نہیں ہوا..... اس کے برعکس آپؐ نے اس موقع پر اپنے عمل سے ہمیشہ کیلئے دنیا کو بتا دیا کہ دین اسلام ”دین رحمت“ ہے۔

☆.....انصارِ مدینہ کی تشویش.....اور پھر مسرت.....:

فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ متعدد دنوں تک مکہ میں ہی مقیم رہے، ایک روز آپ بیت اللہ کے قریب اپنے دونوں ہاتھ بلند کئے ہوئے..... انتہائی خشوع و خضوع اور انہماک کے ساتھ اپنے رب کے ساتھ دعاء و مناجات میں مشغول تھے، اس موقع پر وہاں موجود صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے کچھ انصارِ مدینہ بھی تھے، جو بڑی ہی عقیدت و محبت کے ساتھ انتہائی والہانہ انداز میں آپ کی جانب دیکھ رہے تھے..... دنیا و مافیہا سے بے خبر..... بس اسی نظارے میں محو تھے..... انہیں یہ منظر بہت ہی اچھا لگ رہا تھا..... اور وہ دل ہی دل میں رسول اللہ ﷺ کی اس کیفیت پر..... اور اس ادا پر..... فدا ہوئے جا رہے تھے..... کہ اچانک اسی لمحے ان میں سے کسی کے دل میں یہ خیال آیا کہ مکہ تو رسول اللہ ﷺ کا آبائی شہر ہے، جو کہ اب فتح ہو چکا ہے، اپنے آبائی شہر اور آبائی وطن سے محبت اور اس کے ساتھ جذباتی تعلق تو ہر انسان کیلئے فطری چیز ہے..... کہیں اب ایسا نہ ہو کہ رسول اللہ ﷺ سوچیں کہ ”میرا اپنا شہر تو اب فتح ہو چکا، لہذا اب واپس مدینہ جانے کی بجائے یہیں مستقل قیام کر لیا جائے.....“ اور تب ہمارا کیا بنے گا.....؟ ہمارا کیا حال ہوگا.....؟ رسول اللہ ﷺ کی جدائی کا دکھ ہم کس طرح سہہ سکیں گے.....؟

دل میں یہ خیال آتے ہی وہ شخص پریشان ہو گیا..... کچھ تردد کے بعد اس نے اپنے برابر والے کے ساتھ سرگوشی کے انداز میں اپنی اس پریشانی کا اظہار کیا..... تب وہ بھی پریشان اور اداس ہو گیا..... اس نے کسی اور کے ساتھ سرگوشی کی..... اور یوں حضرات انصار جو تھوڑی دیر قبل تک رسول اللہ ﷺ کی اس ادا پر فریفتہ ہوئے جا رہے تھے..... اور بہت زیادہ مسرور نظر آ رہے تھے..... اب یک بیک وہ سب اداس ہو گئے..... اور یہی بات سوچ کر

اب ان کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں.....

رسول اللہ ﷺ جواب تک اپنی اسی کیفیت کے ساتھ دعاء و مناجات میں مشغول تھے جب حضرات انصار کی سرگوشیاں کچھ بڑھ گئیں..... تو آپؐ نے مڑ کر پیچھے کی جانب دیکھا، اور ان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے دریافت فرمایا کہ کیا بات ہے.....؟ اس پر وہ سب گھبرا گئے اور یوں کہنے لگے کہ اے اللہ کے رسول! کوئی بات نہیں ہے..... ہم تو بس یوں ہی آپس میں کچھ بات چیت کر رہے تھے..... لیکن رسول اللہ ﷺ ان کے چہروں پر پھیلی ہوئی اداسی..... اور ان کی آنکھوں سے چھلکتے ہوئے آنسو..... دیکھ چکے تھے..... لہذا آپؐ نے بار بار اصرار فرمایا کہ مجھے بتاؤ..... کیا معاملہ ہے.....؟ آخر ڈرتے ڈرتے ان انصارِ مدینہ نے اپنے اس خدشے کا اظہار کیا..... تب رسول اللہ ﷺ نے ان کی جانب دیکھتے ہوئے تبسم فرمایا..... اور پھر انہیں مخاطب کرتے ہوئے یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا: ”اے جماعتِ انصار! میرا جینا مرنا..... تمہارے ہی ساتھ ہے.....“ رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ جملہ سننے کے بعد وہ انصاری حضرات خوشی سے سرشار ہو گئے..... گویا ان کے دل جھوم جھوم اٹھے ہوں..... اور تھوڑی ہی دیر قبل تک غم اور پریشانی کی وجہ سے ان کی جو آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں..... اب انہی آنکھوں میں ”خوشی کے آنسو“ چھلکنے لگے.....!!

الحمد للہ آج بتاریخ ۷/ ذوالحجہ ۱۴۳۲ھ، مطابق ۱۲/ اکتوبر ۲۰۱۳ء بروز ہفتہ یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ، وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

غزوہ حنین:

ماہ رمضان المبارک سن آٹھ ہجری میں ”فتح مکہ“ کا اہم ترین تاریخی واقعہ پیش آیا، اس کے فوری بعد جب رسول اللہ ﷺ اپنے جاں نثار ساتھیوں سمیت ابھی مکہ میں ہی مقیم تھے کہ ماہ شوال میں ”غزوہ حنین“ کی نوبت آئی۔

اس غزوے کے موقع پر چونکہ بہت سے عجیب و غریب اور بالکل غیر متوقع قسم کے حالات و واقعات پیش آئے، اس لئے مفسرین و محدثین، نیز مؤرخین نے اس واقعے کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، اس تمام تر تفصیل کا خلاصہ یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

☆..... مکہ سے تقریباً ساٹھ میل (سولو میٹر) کے فاصلے پر مشہور تاریخی شہر ”طائف“ آباد ہے، اُس دور میں طائف نیز اس کے مضافات میں چھوٹے بڑے بہت سے مشرک قبائل آباد تھے، جن میں سے بالخصوص ”ہوازن“ اور ”ثقیف“ نامی دو قبیلے بہت معروف تھے اور انتہائی طاقتور بھی تھے، فتح مکہ کے فوری بعد ان قبائل کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ فتح مکہ کے بعد اب مسلمان ان کی طرف متوجہ ہو جائیں اور ان پر حملہ آور ہو جائیں.....

لہذا اس اندیشے کی وجہ سے ان کے ذمے دار اور بااثر قسم کے لوگ باہم مشاورت میں مشغول ہو گئے، اور اس بارے میں خوب غور و فکر کے بعد آخر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ بجائے اس کے کہ مسلمان خوب بے فکر اور بے غم ہو کر ہم پر حملے کے منصوبے بناتے رہیں اور پھر اپنی پسند اور مرضی کے مطابق جب مناسب سمجھیں ہمارے سروں پر آدھمکیں..... قبل اس کے کہ ایسی نوبت آئے، ہمیں چاہئے کہ ہم خود آگے بڑھ کر مسلمانوں پر بھرپور طریقے

سے حملہ آور ہو جائیں..... اور پھر بڑے زور و شور کے ساتھ ہنگامی طور پر انہوں نے اس حملے کی تیاری شروع کر دی۔

☆..... اُن دنوں ”مالک بن عوف“ نامی ایک شخص ان کا سپہ سالار تھا، جو کہ بہت جوشیلا اور طاقتور قسم کا انسان تھا، اُس وقت وہ جوان تھا، تیس سال عمر تھی، لہذا ”ہوازن“ و ”ثقیف“ و دیگر متعدد چھوٹے بڑے قبائل کی طرف سے مشترکہ طور پر مسلمانوں کے خلاف اس حملے کے سلسلے میں وہی سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر گرجوئی اور بیتابی کا مظاہرہ کر رہا تھا، البتہ یہ کہ اس میں جوش تو بہت زیادہ تھا، لیکن ہوش اور تجربے کی کمی تھی..... بہت سے تجربہ کار افراد نے اسے اس بارے میں سمجھانے کی بہت کوشش کی، لیکن اس جوشیلا انسان نے کسی کی ایک نہ سنی، ان میں دُرید بن الصُمہ نامی ایک شخص جو کہ کافی عمر رسیدہ تھا اور بہت زیادہ تجربہ کار بھی تھا اور اس سے قبل مختلف جنگوں کے مواقع پر وہ ان قبائل کے سپہ سالار کی حیثیت سے بھی فرائض انجام دے چکا تھا..... آخر اس نے مالک بن عوف سے ملاقات کی، اور اسے مسلمانوں کے خلاف جنگ چھیڑنے سے باز رہنے کی تلقین کی، کیونکہ بقول اس کے مسلمان اب بہت زیادہ طاقتور ہو چکے تھے، لہذا اب ان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور دشمنی مول لینا کسی صورت مناسب نہیں تھا، مزید اس نے یہ اصرار بھی کیا کہ جب تک ہمیں مسلمانوں کی طرف سے جارحیت کے ٹھوس قرائن و شواہد نظر نہ آئیں اُس وقت تک یہ بات ہر گز ہمارے حق میں نہیں ہے کہ ہم خود ان پر حملہ آور ہو کر اپنے لئے بہت بڑا خطرہ مول لیں.....

لیکن مالک نے نہ تو اس کی بزرگی اور تجربہ کاری کا کوئی لحاظ کیا..... اور نہ ہی اس کی نصیحت کو قابلِ توجہ سمجھا..... آخر اُس شخص نے مالک کی اس بے اعتنائی پر خفگی کا اظہار کرتے ہوئے

کہا کہ ”مالک! میری یہ بات یاد رکھنا..... کہ مسلمانوں کے خلاف تم یہ جنگ کبھی نہیں جیت سکتے.....“ اس پر مالک اور زیادہ بگڑ گیا، اس نے اس عمر رسیدہ شخص کا..... اور اس کے ہمنواؤں کا مذاق اڑایا اور انہیں بزدلی کا طعنہ بھی دیا..... اور اپنے جنگ کے اس فیصلے پر قائم رہا۔

نیز اس موقع پر مالک نے یہ بھی کہا کہ ”ان مسلمانوں کو کیا خبر کہ جنگ کس طرح لڑی جاتی ہے.....؟ انہوں نے تو اب تک کوئی جنگ لڑی ہی نہیں ہے..... کیونکہ اب تک جو ہوا وہ محض دکھاوا اور کھیل تماشا تھا..... یہ مسلمان دراصل مکہ ہی کے باشندے تھے..... اور ان کے مقابلے میں مشرکین بھی مکہ ہی کے باشندے تھے..... دونوں کا تعلق قبیلہ ”قریش“ سے تھا، آپس میں رشتے دار یاں تھیں اور ہمدردیاں تھیں..... اس لئے بس دکھاوے کیلئے یہ آپس میں جھوٹ موٹ کی جنگیں لڑتے رہے..... اب ہم سے جب ٹکر ہوگی..... تب انہیں پتہ چلے گا کہ جنگ کیا چیز ہوتی ہے.....؟“

اور پھر مزید یوں بھی کہنے لگا کہ ”یہ مسلمان تو مکہ سے ہی گئے تھے..... اور اب اپنے ہی شہر مکہ واپس آ گئے ہیں..... بھلا یہ بھی کوئی جنگ ہوئی.....؟ اپنے ہی شہر سے گئے تھے..... اور اپنے ہی شہر واپس آ گئے.....؟“

اور پھر شب و روز کی تیاری کے بعد چوبیس ہزار جنگجوؤں پر مشتمل لشکرِ جرار تیار کیا گیا، اس موقع پر ان کے سپہ سالار مالک بن عوف نے یہ حکم جاری کیا کہ محاذِ جنگ پر روانگی کے وقت ہر شخص اپنے اہل و عیال، سونے چاندی کے زیورات، اموال و اسباب، نیز اپنے تمام موسیشیوں سمیت جنگ کیلئے روانہ ہوگا، تاکہ دورانِ جنگ ہر کوئی مکمل استقامت و بہادری کے ساتھ اور خوب ڈٹ کر..... جان توڑ طریقے سے لڑے..... صورت حال کتنی ہی نازک

کیوں نہ ہو جائے..... مگر یہ سوچ کر کسی کو میدانِ جنگ سے بھاگنے کی جرأت نہ ہو کہ ”آج اگر میں بھاگ کھڑا ہوا تو میرے بعد میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا.....؟“ یہ تو دشمن کے ہاتھ لگ جائیں گے..... پھر نہ جانے ان کے ساتھ کیا سلوک ہوگا.....؟“ اور یوں اس کے اپنے ہی بیوی بچے اور اموال و اسباب اس کیلئے قدموں کی زنجیر بن جائیں۔

اس موقع پر دُرید بن الصُمہ نامی اُس تجربہ کار اور عمر رسیدہ جنگجو نے دوبارہ اپنے جوان اور جو شیلے سپہ سالار مالک بن عوف سے ملاقات کر کے اسے یہ سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ میدانِ جنگ میں اگر صورتِ حال نازک شکل اختیار کر گئی تو ایسے میں بھاگتے ہوئے اور شکست خوردہ سپاہی کو شنایتلوار اور نیزے سے تو کچھ فائدہ پہنچ سکے..... لیکن بیوی بچوں سے اسے کیا فائدہ پہنچ سکے گا.....؟ بلکہ ایسے نازک موقع پر تو وہ مزید در دِ سر بن جائیں گے..... ایسے میں بے چارہ سپاہی اپنی فکر کرے گا..... یا بیوی بچوں کی.....؟

لیکن جوان اور جو شیلے سپہ سالار حسبِ معمول اس بار بھی اس تجربہ کار اور سمجھدار بوڑھے جنگجو کی بات کو لمحہ بھر کیلئے بھی خاطر میں نہ لایا..... اور یوں مسلمانوں کو ہمیشہ کیلئے نیست و نابود کر ڈالنے کا عزم لئے ہوئے اپنے لشکرِ جرار کی قیادت کرتا ہوا طائف سے مکہ کی جانب رواں دواں ہو گیا۔

اُدھر مکہ میں جب رسول اللہ ﷺ کو ہوازن اور ثقیف کے ان خطرناک عزائم کے بارے میں علم ہوا تو آپؐ نے بھی یہ فیصلہ فرمایا کہ یہاں مکہ میں بیٹھ کر دشمن کا انتظار کرنے کی بجائے ہمیں بھی دشمن کی جانب کوچ کرنا چاہئے تاکہ یہاں تک پہنچنے سے قبل ہی اس کا راستہ روکا جاسکے۔

چنانچہ سن آٹھ ہجری میں بتاریخ ۶/ شوال رسول اللہ ﷺ اپنے لشکر کی قیادت کرتے ہوئے

مکہ سے طائف کی جانب رواں دواں ہو گئے، یہ لشکر آپ ﷺ کے اُن دس ہزار جاں نثار ساتھیوں پر مشتمل تھا جو مدینہ سے ہی فتح مکہ کے موقع پر آپ کے ہمراہ آئے تھے، جن میں مہاجرین و انصار دونوں شامل تھے، مزید یہ کہ فتح مکہ کے موقع پر بڑی تعداد میں مکہ کے باشندوں نے دین اسلام قبول کیا تھا، اب ان میں سے بھی دو ہزار افراد اس لشکر میں شامل ہو گئے تھے، یوں اب یہ اسلامی لشکر کل بارہ ہزار افراد پر مشتمل تھا۔

مکہ سے رواں لگی کے بعد ”حنین“ نامی مقام پر دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہو گیا، اس موقع پر باقاعدہ اور بھرپور جنگ کے آغاز سے قبل یہ صورتِ حال پیش آئی کہ یہاں پہاڑی دروں اور تنگ و تاریک پہاڑی راستوں میں بہت بڑی تعداد میں دشمن کے تیر انداز چھپے بیٹھے تھے، وہ اسی موقع کے انتظار میں یہاں چھپے بیٹھے تھے کہ مسلمانوں کا لشکر جب یہاں پہنچے گا تو اس پر ان تنگ و تاریک راستوں میں اچانک تیروں کی برسات کر دی جائے گی..... چنانچہ مسلمان جب ان تنگ و تاریک اور انتہائی دشوار گزار اور خطرناک قسم کے پہاڑی راستوں سے گزر رہے تھے..... تب وہاں چھپے ہوئے دشمنوں نے منصوبے کے عین مطابق اچانک ان پر بہت بڑے پیمانے پر تیر اندازی شروع کر دی..... جس کی وجہ سے مسلمان فوری طور پر سنبھل نہ سکے، پریشان اور منتشر ہو کر ادھر ادھر بھاگنے لگے..... اتنا بڑا لشکر..... بارہ ہزار اس طرف..... چوبیس ہزار اُس طرف..... اور پھر لاتعداد اور بے شمار اونٹ گھوڑے اور دیگر مویشی جو کہ وہ طائف والے اپنے سپہ سالار کے حکم پر اپنے ہمراہ لائے تھے..... اب یہ سب سرپٹ ادھر ادھر دوڑتے ہوئے تباہی پھیلانے لگے..... اس تمام تر بد نظمی، افراتفری، انتشار اور بھاگ دوڑ کے نتیجے میں اس قدر گرد و غبار اُڑا..... کہ دن کے وقت رات کا گمان ہونے لگا..... اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا..... جو کہ مسلمانوں کیلئے مزید

پریشانی و سراسیمگی کا سبب بنا..... آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ بھی برقرار نہ رہ سکا..... اوریوں وہ سب ایک دوسرے سے بے خبر..... ان انجان اور گمنام راستوں میں ادھر ادھر بکھر گئے.....

اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے بار بار آواز بلند اپنے پرانے ساتھیوں کو پکارا کہ ”یہاں چلے آؤ..... میں یہاں ہوں“

مزید یہ کہ اس نازک ترین صورتِ حال میں کہ جب رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں میں سے محض اکا دکا چند افراد آپ کے ہمراہ تھے..... اور اس نادر موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ تک رسائی دشمن کیلئے بہت آسان تھی..... ایسے میں آپ دشمن سے خوفزدہ ہونے اور چھپنے کی بجائے..... بار بار آواز بلند یہ اعلان فرماتے رہے ”اَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبَ“، یعنی ”میں سچا نبی ہوں..... اور اس بات میں کوئی جھوٹ نہیں ہے۔“

اس پراسرار اور وحشتناک ماحول میں رسول اللہ ﷺ کی یہ صدا جب بار بار فضا میں بلند ہوئی اور آپ کی مبارک آواز جب آپ کے جاں نثار ساتھیوں کی سماعت سے ٹکرائی تو ان کے شعور و وجدان پر عجب کیفیت طاری ہو گئی، ان کے دلوں میں ایک نیا دلولہ اور نیا جذبہ پیدا ہوا، جو لوگ سراسیمہ، بدحواس، اور منتشر ہو چکے تھے اب وہ ”لبیک..... لبیک“ کی صدائیں بلند کرتے ہوئے دیوانہ وار اس جانب بڑھنے لگے کہ جہاں سے یہ آواز آرہی تھی.....

نیز اس موقع پر آپ کے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ بھی آپ کے ہمراہ تھے، جن کی آواز قدرتی طور پر کافی بلند تھی، آپ کے ساتھ اب وہ بھی بار بار مسلمانوں کو آواز بلند پکار پکار کر آگاہ کرنے لگے کہ ”ادھر آؤ..... رسول اللہ ﷺ یہاں ہیں۔“

آخر ان حضرات نے رسول اللہ ﷺ کے ارد گرد جمع ہو کر اپنی صفوں کو دوبارہ منظم کیا، اور پھر

ایسا زوردار حملہ کیا کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے، اور وہ اپنی تمام تر قوت اور عددی برتری کے باوجود ہزیمت کے داغ دل پر لئے ہوئے..... میدان چھوڑ کر یوں بھاگا..... کہ پھر پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا.....!

☆..... اس جنگ کے موقع پر دشمن فوج کا وہ انتہائی جوشیلا اور جذباتی قسم کا سپہ سالار ”مالک بن عوف“ جو کہ دراصل اس جنگ کا سرغنہ تھا، اور اس تمام تر مصیبت اور لشکر کشی کا اصل سبب اور اصل محرک تھا..... اب جنگ کے اختتام پر رسول اللہ ﷺ نے اس کے بارے میں دریافت فرمایا کہ اُس کا کیا بنا؟ کیا وہ مارا گیا؟ یا کہیں زندہ سلامت موجود ہے.....؟ چنانچہ اس کے انجام کے بارے میں معلومات حاصل کی گئیں، اور تحقیق و جستجو کے بعد یہ بات معلوم ہوئی کہ جب اسے اپنی شکست یقینی نظر آنے لگی تھی تب وہ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا تھا، اور یہ کہ اب وہ طائف میں کسی جگہ روپوش ہے۔

یہ اطلاع ملنے پر رسول اللہ ﷺ نے اس کی تلاش کا اور اس تک یہ پیغام پہنچانے کا حکم دیا کہ ”اگر وہ مسلمان ہو جائے تو اسے معاف بھی کر دیا جائے گا، نیز یہ کہ بڑی مقدار میں اس کا جو مال و اسباب مسلمانوں کے ہاتھ لگا ہے، وہ بھی اسے لوٹا دیا جائے گا“۔ چنانچہ اسے تلاش کیا گیا، اور پھر آپ کی طرف سے یہ پیغام بھی اس کے گوش گزار کر دیا گیا، جس پر وہ مکہ کے قریب ”جعرانہ“ کے مقام پر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور قبول اسلام کا اعلان کیا، تب آپ نے نہ صرف یہ کہ حسب وعدہ اسے معاف فرمایا..... اس کا تمام مال و اسباب اسے لوٹا دیا..... بلکہ اس کے علاوہ یہ کہ اسے مزید سواونٹ بھی عطاء فرمائے..... آپ کی اس خوش اخلاقی و فیاضی سے مالک بن عوف انتہائی متاثر ہوا اور وقتاً فوقتاً آپ کی مدح میں قصیدے کہتا رہا..... اس سلسلے میں اس کے متعدد قصائد مشہور نیز

کتبِ تاریخ میں مذکور ہیں (مثلاً: اُسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابہ، حرف المیم - ۴۶۲۶) اور یوں وہ جوشیلا سپہ سالار جو کہ اب تک محض مالک بن عوف تھا..... اب وہ رسول اللہ ﷺ کے جاں نثار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں شامل ہو گیا اور محض ”مالک بن عوف“ کی بجائے اب وہ حضرت مالک بن عوف رضی اللہ عنہ بن گئے۔ (۲)

☆..... قرآن کریم میں غزوہ حنین کے موقع پر پیش آنے والی صورتِ حال کا یوں تذکرہ کیا گیا ہے: ﴿لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ وَ يَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثَرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ ثُمَّ أَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنْزَلَ جُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَذَلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ثُمَّ يَتُوبُ اللَّهُ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ عَلَى مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ (۳)

ترجمہ: (یقیناً اللہ نے بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کی ہے اور حنین کے دن بھی کہ جب تمہیں اپنی کثرتِ تعداد پر ناز ہونے لگا تھا، لیکن یہ چیز تمہارے کسی کام نہ آئی، اور زمین اپنی کشادگی کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی، پھر تم پیٹھ پھیر کر مڑ گئے، پھر اللہ نے اپنی طرف سے تسکین نازل کی اپنے رسول پر اور مؤمنین پر، اور ایسے لشکر بھیجے جنہیں تم دیکھ نہیں رہے تھے (۴) اور کافروں کو پوری سزا دی، ان کافروں کا یہی بدلہ تھا، پھر اس کے بعد بھی اللہ جس پر

(۱) خلیفہ دوم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں رومیوں اور فارسیوں کے خلاف لڑی جانے والی بڑی جنگوں کے موقع پر یہی حضرت مالک بن عوف رضی اللہ عنہ ہمیشہ پیش پیش رہے، خصوصاً ”جنگ قادسیہ“ کے یادگار موقع پر انہوں نے بڑی خدمات انجام دیں اور اسلامی لشکر کے سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی مشاورت و معاونت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے (اُسد الغابہ [۴۶۲۶] وغیرہ)۔

(۳) یعنی فرشتوں کا لشکر۔

(۲) التوبہ [۲۵-۲۷]

چاہے اپنی رحمت کی توجہ فرمائے گا، اور اللہ تو بخشنے والا مہربان ہے)

در اصل اس جنگ کے موقع پر ایک قابل ذکر صورت حال یہ پیش آئی کہ اُس روز مسلمان اپنی کثرت تعداد کی وجہ سے بہت خوش تھے، اور ہنسی خوشی نہایت بے فکری کے ساتھ مکہ سے میدان جنگ کی طرف رواں دواں تھے، اگرچہ انہیں اس بات کا خوب علم تھا کہ دشمن کی تعداد چوبیس ہزار ہے..... جبکہ یہ خود بارہ ہزار تھے..... لیکن اس کے باوجود بہت ہی مسرور و مطمئن تھے، کیونکہ اتنی بڑی تعداد پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی، پہلے تو ہمیشہ مسلمانوں کی تعداد اس سے بھی کم ہی رہی تھی، مثلاً غزوہ بدر کے موقع پر مسلمان صرف تین سو تیرہ تھے اور مشرکین ایک ہزار تھے..... یعنی دشمن کے مقابلے میں مسلمان آدھے سے بھی کم تھے..... لیکن اس کے باوجود ہمیشہ مسلمانوں کو ہی غلبہ نصیب ہوا تھا..... جبکہ آج تو مسلمان پہلی بار دشمن کے مقابلے میں آدھے تو تھے..... دشمن کی تعداد ہے چوبیس ہزار..... اور مسلمان ہیں بارہ ہزار..... لہذا اپنی اس کثرت تعداد کی وجہ سے اس روز مسلمان بہت خوش اور بے فکر تھے، اور یوں ہنسی خوشی میدان جنگ کی طرف رواں دواں تھے..... حالانکہ مؤمن کی شان یہ ہونی چاہئے کہ ظاہری اسباب کی بجائے اس کی نظر ہمیشہ صرف اللہ پر ہو، تمام تر اعتماد صرف اللہ کی طرف سے مدد و نصرت پر ہو، اسی کے ساتھ ہمیشہ لو لگائی جائے، اور اسی سے فریاد کی جائے، اسباب کو اختیار تو ضرور کیا جائے، لیکن نظر مسبب الاسباب پر ہو.....

اللہ عز و جل کی طرف سے مسلمانوں کیلئے فوری تنبیہ کا اور ہمیشہ کیلئے ایمانی تربیت کا یوں انتظام کیا گیا کہ اُس روز ان کی یہ کثرت تعداد ان کے کسی کام نہ آئی..... کثرت تعداد کے باوجود وہ دشمن کی طرف سے تیروں کی اس اچانک بوچھاڑ کے موقع پر ثابت قدم نہیں رہ

سکے..... اور بھاگ کھڑے ہوئے.....

اور پھر اس فوری سبق اور عملی و واقعاتی تنبیہ اور تربیت کے بعد اللہ کی طرف سے رحمت اور مدد و نصرت کا انتظام بھی فرما دیا گیا کہ مسلمانوں کے دلوں میں ”سکون و اطمینان“ کی نعمت ڈال دی گئی، ان کے دلوں سے دشمن کا خوف جاتا رہا، اور وہ دوبارہ منظم ہوئے اور خوب شجاعت و ثابت قدمی کے ساتھ لڑے، اور پھر اللہ کی طرف سے ان کیلئے مزید مدد کے طور پر فرشتوں کا لشکر بھی بھیجا گیا..... تاکہ کافروں کو خوب اچھی طرح سزا دی جاسکے.....

☆ گذشتہ سطور میں بیان کردہ اس تفصیل سے اس غزوے کی ایک خاص بات تو یہ واضح ہو گئی کہ اس موقع پر مسلمانوں کی طرف سے اپنی کثرت تعداد پر نظر کی وجہ سے جو بے فکری کا اظہار تھا..... یہ بات اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو پسند نہیں آئی، جس کی وجہ سے فوری اور نقد سبق سکھا دیا گیا کہ ظاہری اسباب کو اختیار تو ضرور کیا جائے، لیکن بھروسہ صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ پر ہی کیا جائے جو کہ مسبب الاسباب ہے، اور اسی سے مدد و نصرت طلب کی جائے۔

اس کے علاوہ مزید یہ کہ اس غزوے کے موقع پر کچھ اور ایسے مخصوص حالات و واقعات پیش آئے کہ جن کی وجہ سے حضرات مفسرین و محدثین، نیز مؤرخین نے بڑی اہمیت کے ساتھ اس غزوے کا تذکرہ کیا ہے، اس بارے میں خلاصہ درج ذیل ہے:

☆..... یہ غزوہ فتح مکہ کے بعد بالکل ہی اچانک اور غیر متوقع پیش آ گیا..... کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اس غزوے کی نوبت آئے گی۔

☆..... اسلامی لشکر اصل میں تو ان دس ہزار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر مشتمل تھا جو رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ فتح مکہ کے موقع پر مدینہ سے آئے تھے، لیکن چونکہ فتح مکہ کے

موقع پر بہت بڑی تعداد میں مکہ کے باشندے مسلمان ہو گئے تھے (حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے کسی کو قبولِ اسلام پر مجبور نہیں کیا تھا) اب یہ لشکر جب غزوہ حنین کیلئے مکہ سے روانہ ہوا تو اس میں ان نو مسلموں میں سے بھی دو ہزار افراد شامل ہو گئے، یوں کل تعداد بارہ ہزار ہو گئی۔

☆..... یہ نو مسلم اگرچہ جسمانی طور پر تو یقیناً صحت مند، بہترین جنگجو اور فنونِ سپہ گری سے بخوبی واقف اور آزمودہ کار سپاہی ہوں گے..... لیکن ان کی ایمانی و اخلاقی تربیت ابھی نہیں ہوئی تھی، کیونکہ یہ بالکل نو مسلم تھے، ان میں سے کوئی اسی دن مسلمان ہوا تھا..... کوئی ایک دو روز قبل..... کوئی ہفتہ یا دس روز قبل..... لہذا ذہنی و فکری تربیت اور ایمانی و اخلاقی کیفیت کے لحاظ سے ان میں اور اصل لشکر والوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا..... کہاں یہ لوگ جو محض ایک دو روز قبل ہی مسلمان ہوئے..... اور کہاں وہ ”السابقین الاولین“..... وہ ابتدائی دور کے مسلمان..... وہ مہاجرین و انصار..... وہ ”بدری“ حضرات..... وہ ”بیعت رضوان“ والے..... اور ”بیعت عقبہ“ والے.....

جبکہ کسی بھی لشکر کی کامیابی اور عمدہ کارکردگی کیلئے یہ بات انتہائی ضروری ہوا کرتی ہے اس لشکر میں شامل تمام افراد کی جسمانی صلاحیت اور تربیت کے ساتھ ساتھ..... ان کی اخلاقی، فکری اور ذہنی تربیت اور کیفیت بھی ایک ہی جیسی ہو..... ان کے ذہنی و فکری معیار میں یکسانیت و مماثلت ہو..... جبکہ فتح مکہ کے بعد یہ لشکر جب حنین کی جانب روانہ ہوا..... تب یہ یگانگت اور مماثلت کافی حد تک مفقود و مجروح ہو چکی تھی..... ذہنی و فکری توازن بگڑ چکا تھا.....

☆..... اس کے علاوہ مکہ کے باشندوں میں سے بہت بڑی تعداد میں ایسے لوگ بھی لشکر

کے ہمراہ ہو لئے تھے جو محض ”تماشائی“ بنے ہوئے تھے، جن کی دینی کیفیت کے بارے میں کسی کو کچھ اندازہ ہی نہیں تھا کہ ان میں سے کون دین اسلام قبول کر چکا ہے.....؟ اور کون ابھی تک کفر و شرک پر ہی قائم ہے.....؟ متعدد مفسرین و محدثین، اور اسی طرح مؤرخین نے ان تماش بینوں کیلئے ”طلقاء“ کا لفظ استعمال کیا ہے، جس کے لفظی معنی ہیں ”آزاد..... بے لگام..... جو خود کو کسی ضابطے یا کسی قاعدہ و قانون کے پابند نہ سمجھتے ہوں۔“ (۱)

چنانچہ ان ”طلقاء“ کی ذہنی کیفیت اور سوچ یہی تھی کہ انہیں حق و باطل کے مابین معرکے سے کوئی غرض نہیں تھی، بلکہ ان کا اصل مقصود یہی تھا کہ دونوں فریقوں میں سے جس کسی کی بھی جیت ہو جائے گی بس اسی کے ساتھ مل جائیں گے..... جہاں فائدہ نظر آئے گا اسی طرف لڑھک جائیں گے..... اور جہاں کوئی خطرہ نظر آئے گا تو وہاں سے بھاگ کھڑے ہوں گے.....

بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان ”طلقاء“ میں بہت سے ایسے افراد بھی شامل تھے کہ جن کے متعدد رشتے دار گذشتہ جنگوں کے موقع پر مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے، اور انہیں یہ علم بھی تھا کہ ہمارے ”فلاں“ رشتے دار کو ”فلاں“ جنگ کے موقع پر ”فلاں“ مسلمان نے قتل کیا تھا، اور یہ کہ وہ ”فلاں“ مسلمان اس وقت رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ اسلامی لشکر میں موجود ہے..... لہذا ان کے دلوں میں ”انتقام“ کی آگ بھڑک رہی تھی، فتح مکہ سے قبل کوئی

(۱) بہت سے مؤرخین کے بقول یہ لفظ ”طلقاء“ دراصل رسول اللہ ﷺ کے اس جملے سے مأخوذ ہے جو آپؐ نے فتح مکہ کے موقع پر مکہ والوں کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا: ”انذهبوا انتم الطلقاء“، یعنی ”جاؤ، آج تم سب آزاد ہو“ لہذا ”غزوہ حنین“ کے موقع پر یہ تمام تر نامناسب رویہ و سلوک دکھانے والے یہ لوگ دراصل وہی تھے..... واللہ اعلم۔

ایسی صورت ممکن نہیں تھی کہ مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے مابین یوں آزادانہ میل جول ہو سکے..... لیکن اب فتح مکہ کے فوری بعد صورتِ حال ایسی بن گئی تھی کہ حالات نے اب ان سب کو یکجا کر دیا تھا، لہذا ان کینہ پرور مشرکین کیلئے انتقام کی آگ بجھانے کا یہ نادر موقع تھا..... اور اپنے اسی ناپاک مقصد کی تکمیل کے ارادے سے یہ لوگ ہمراہ ہو لئے تھے کہ جب جنگ عروج پر ہوگی..... ہر طرف افراتفری ہوگی..... کسی کو کسی کا ہوش نہیں ہوگا..... ایسے میں موقع پا کر ہم اس ”فلاں“ کو ٹھکانے لگا دیں گے.....!

☆..... اور پھر جب تنگ و تاریک پہاڑی راستوں میں چھپے ہوئے ان انتہائی ماہر اور نشانے باز تیراندازوں کی طرف سے تیروں کی زبردست بوچھاڑ کا سلسلہ شروع ہوا..... تو ایسے میں سب سے پہلے یہی ”طلاقاً“ پیٹھ پھیر کر بھاگے..... اور اس طرح غیر منظم طریقے سے بھاگے کہ باقی صفوں کو بھی خراب کیا..... جو راستے میں آیا اُسے روند ڈالا..... یوں یہ لوگ انتہائی بد نظمی اور افراتفری کا سبب بنے، تمام لشکر میں گر بڑا نہی کی وجہ سے پھیلی اور بھگدڑ انہوں نے ہی مچائی.....

اور پھر جب رسول اللہ ﷺ نے، باوازِ بلند بار بار پکارا..... نیز حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی بار بار پکارتے رہے..... تب مخلص لوگ تو اس پکار پر ”لبیک..... لبیک“ کی صدائیں بلند کرتے ہوئے دیوانہ وار وہاں حاضر ہو گئے..... جبکہ یہ ”طلاقاً“ یہ پکار سن کر بھی نہیں پلٹے..... اور مستقل میدان چھوڑ کر ہی بھاگ گئے..... حتیٰ کہ رُکے بغیر سیدھے واپس مکہ جا پہنچے اور اپنے گھروں میں آرام سے بیٹھ گئے.....

☆..... چنانچہ ان ”طلاقاً“ کے بغیر ہی جنگ کے باقی تمام مراحل طے ہوئے حتیٰ کہ یہ ”غزوہ حنین“ اپنے اختتام کو پہنچا، اور اس اختتام کے موقع پر کیفیت یہ تھی کہ مسلمانوں کے

ہاتھوں ان طائف والوں کو انتہائی بدترین اور رسوا کن شکست و ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا، ان کے بڑے بڑے اور نامور قسم کے سرداروں میں سے ستر مارے گئے، بہت سے قیدی بنائے گئے، جبکہ عام سپاہیوں میں سے چھ ہزار کو قیدی بنایا لیا گیا، نیز چونکہ اس جنگ کے موقع پر اپنے جو شیلے سپہ سالار کے حکم کی تعمیل میں یہ لوگ اپنے بیوی بچے اور مولیٰ وغیرہ سبھی کچھ بہت بڑی مقدار میں ہمراہ لائے تھے، اس لئے بڑی مقدار میں مختلف قسم کا مال و متاع، سونا چاندی، نیز چوبیس ہزار اونٹ اور چالیس ہزار بکریاں بطور ”مالِ غنیمت“ مسلمانوں کے ہاتھ لگیں۔

☆.....جنگ ختم ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مالِ غنیمت کی تقسیم فوری شروع نہیں کی، بلکہ چند دن انتظار فرمایا کہ شاید یہ ”طلاق“ واپس آجائیں اور اپنے بھاگ کھڑے ہونے پر معذرت کریں..... لیکن وہ نہ آئے..... اور پھر جب آپؐ نے تقسیم کا کام شروع فرمایا..... تب یہ لوگ فوراً ہی موقع پر پہنچ گئے..... اور خوب زور و شور کے ساتھ مانگنے لگے..... اور ان کے اس نامناسب رویے کے باوجود آپؐ ان کے مطالبات کے جواب میں انہیں بہت کچھ عطا فرماتے رہے.....

در اصل آپؐ کی مثال کسی ماہر ترین معالج اور نبض شناس کی مانند تھی کہ جو پہلے خوب مہارت کے ساتھ مرض کی تشخیص کرتا ہے، اور پھر خوب کارگر اور مؤثر قسم کا علاج تجویز کرتا ہے..... آپؐ گوان کے مرض کے بارے میں خوب علم تھا..... آپؐ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ انہوں نے اب تک اپنی تمام عمر دنیا کے حقیر مال و دولت پر لپکنے اور چھٹنے میں گزاری ہے..... بس یہی ان کا سب سے بڑا روگ ہے..... لہذا آپؐ ان کیلئے کارگر اور مؤثر ترین علاج سے بھی بخوبی واقف تھے..... اور وہ علاج یہ تھا کہ فی الحال ان کی تالیفِ قلب کیلئے

جو کچھ مال و دولت یہ مانگتے ہیں، انہیں دے دیا جائے، تاکہ اس ”دلجوئی“ کے ذریعے ابتدائی طور پر ان کے دلوں میں کسی نہ کسی درجے میں دین اسلام کے ساتھ تعلق اور ”وابستگی“ پیدا کی جاسکے.....!

چنانچہ وقت نے ثابت کیا کہ آپ کی طرف سے تجویز فرمودہ یہ علاج انتہائی کارگر ثابت ہوا، یہ لوگ آپ ﷺ کے اس حسن سلوک اور فیاضی سے انتہائی متاثر ہوئے..... جس کے نتیجے میں باہمی میل جول کے سلسلے بڑھے تو رفتہ رفتہ ان کے دلوں میں ایمان بھی راسخ ہونے لگا..... اور آخر آئندہ چل کر یہ لوگ اچھے اور سچے مسلمان ثابت ہوئے۔

☆..... ”طلاق“ میں مال غنیمت کی بڑے پیمانے پر تقسیم کے علاوہ اسی موقع پر ایک اور بڑی عجیب و غریب اور غیر متوقع قسم کی صورت حال یہ پیش آگئی کہ یہ ہوازن اور ثقیف والے جنگجو جن کے چھوٹے بڑے قبائل بڑی تعداد میں طائف اور مکہ کے مابین پھیلے ہوئے تھے..... اور جو کہ اس جنگ اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تمام تر مشکلات و مصائب کے اصل ذمہ دار تھے..... مال غنیمت کی تقسیم کے موقع پر جب رسول اللہ ﷺ نے مخصوص مصلحت کی بناء پر ”طلاق“ کو بہت کچھ عطاء فرمایا..... تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب انہی قبائل ”ہوازن“ اور ”ثقیف“ کے (یعنی طائف والوں کے) بڑے بڑے سردار بھی بڑی تعداد میں آپہنچے، انہی سرداروں میں رسول اللہ ﷺ کا رضاعی چچا ”ابو برقان“ بھی موجود تھا (۱)

ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے بڑے زور و شور کے ساتھ..... اور انتہائی درد انگیز (۱) رسول اللہ ﷺ کی رضاعی والدہ حلیمہ سعدیہ کا تعلق قبیلہ ”بنو سعد“ سے تھا اور اسی نسبت کی وجہ سے انہیں ”سعدیہ“ کہا جاتا تھا، اور یہ قبیلہ بنو سعد دراصل اسی بڑے قبیلے ”ہوازن“ ہی کا ذیلی قبیلہ تھا، لہذا ”بنو سعد“ والے بھی ”ہوازن“ ہی کے ایک جزء کے طور پر مسلمانوں کے خلاف لڑی جانے والی اس جنگ میں شامل تھے۔

طریقے سے فریاد کا سلسلہ شروع کیا، اور یوں کہنے لگے کہ ہمارے گھربار، ہمارے جانور اور مویشی، ہمارے اموال و اسباب..... سبھی کچھ لٹ گیا..... اب ہمارا کیا بنے گا.....؟ ہم پر رحم کیا جائے..... اگر قیصر یا کسریٰ کے سامنے ہم اس طرح گڑ گڑاتے اور وہ لوگ ہماری یہ حالت زار دیکھتے..... تو وہ بھی ہمیں ہرگز خالی ہاتھ نہ لوٹاتے..... تو پھر آپ کو تو اللہ نے اخلاقِ فاضلہ میں سب سے ممتاز فرمایا ہے..... لہذا ہمیں خالی ہاتھ نہ لوٹائیے گا.....“ ان کی یہ فریاد اور یہ گریہ وزاری دیکھ کر رسول اللہ ﷺ کیلئے انہیں خالی ہاتھ لوٹنا بہت مشکل ہو گیا..... چنانچہ آپؐ نے انہیں بھی بہت کچھ عطا فرمادیا.....!

اور پھر وقت نے یہ ثابت کیا کہ آپؐ نے اس بصیرت اور فراست کی بناء پر انہیں خالی ہاتھ نہ لوٹانے کا جو مدبرانہ فیصلہ فرمایا تھا، وہ بہت ہی مفید ثابت ہوا اور اس کے مثبت نتائج فوری طور پر ہی ظاہر ہونے لگے..... چنانچہ آپؐ کی اس سخاوت و فیاضی اور خوش اخلاقی سے متاثر ہو کر یہ بڑے بڑے سردار اور رؤساء قسم کے لوگ بڑی تعداد میں مسلمان ہو گئے، اور چونکہ اپنی اپنی قوم میں اور اپنے علاقے میں ان کا بہت زیادہ اثر و رسوخ تھا..... لہذا ان کے قبولِ اسلام کے بعد اب ان کی قوم کے افراد بھی فوج در فوج مسلمان ہونے لگے اور یوں بڑی سرعت کے ساتھ وہاں دینِ برحق کی نشر و اشاعت ہونے لگی۔

اور یہ بھی اس بات کا واضح اور قطعی ثبوت تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ان لوگوں کے اصل مرض کی تشخیص بالکل درست تھی..... اور پھر آپؐ کی طرف سے ان کیلئے جو ”علاج“ تجویز کیا گیا وہ بھی انتہائی مفید و مؤثر اور تیر بہدف ثابت ہوا.....!

☆..... لیکن اس بہت بڑی کامیابی کے ساتھ ساتھ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ کیلئے ایک بہت بڑی آزمائش بھی پیش آئی جو کہ بڑی نفسیاتی کشش کا سبب بھی بنی، شاید اس انتہائی

مہلک اور خونریز قسم کی جنگ کے موقع پر عین میدان جنگ میں بھی صورت حال اس قدر نازک اور مشکل نہیں ہوئی ہوگی کہ جس قدر معاملہ اب جنگ کے خاتمے کے بعد اس مالِ غنیمت کی تقسیم کے موقع پر نازک ہو گیا.....!

ہوایہ کہ ”مالِ غنیمت“ کی تقسیم کے موقع پر جب ”طلاق“ خوب بڑھ چڑھ کر مانگ رہے تھے..... تو آپؐ نے اپنی بصیرت کی بناء پر انہیں بہت کچھ عطاء فرمادیا تھا، یہ چیز دیکھ کر ہوازن و ثقیف کے سردار بھی آپہنچے تھے..... تب آپ ﷺ نے ان کی ”تألیفِ قلب“ کیلئے انہیں بھی بہت کچھ عطاء فرمادیا تھا..... جو کہ دین اسلام کی نشر و اشاعت کی راہ ہموار کرنے کیلئے یقیناً بالکل درست اور بجا اقدام تھا.....!

لیکن اس موقع پر ایک بہت بڑا اشکال یہ پیدا ہو گیا کہ یہ تمام تر مالِ غنیمت تو دراصل خالصۃً رسول اللہ ﷺ کے اپنے ساتھیوں کا جائز اور شرعی حق تھا..... جنہوں نے اس سے قبل بھی ہمیشہ نیز اس جنگ کے موقع پر بھی بڑی تکلیفیں اور صعوبتیں برداشت کی تھیں..... بڑی قربانیاں دی تھیں..... لیکن ”طلاق“ کو اور پھر ”ہوازن اور ثقیف“ والوں کو جب بہت کچھ دے دیا گیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ پرانے ساتھی جو کہ اصل حقدار تھے، محروم رہ گئے..... اب سوال یہ تھا کہ انہیں کس طرح راضی اور مطمئن کیا جائے.....؟

رسول اللہ ﷺ کے ان اصلی ساتھیوں میں حضرات مہاجرین بھی شامل تھے اور حضرات انصار بھی، حضرات مہاجرین کا تعلق تو چونکہ مکہ شہر سے اور قبیلہ قریش سے تھا، جبکہ خود رسول اللہ ﷺ کا تعلق بھی مکہ شہر سے اور قبیلہ قریش سے ہی تھا، لہذا ان میں سے ہر ایک کے ساتھ آپؐ کی کسی نہ کسی شکل میں ”قربت داری“ تھی، اور جہاں ”قربت داری“ ہوا کرتی ہے..... وہاں بہت کچھ کہنے سننے کی نوبت نہیں آتی..... بلکہ بہت سے نازک اور حساس

مواقع پر ”خاموشی“ اور ”بے زبانی“ ہی بہترین زبان ہوا کرتی ہے..... لہذا رسول اللہ ﷺ نے ان مہاجرین حضرات کے ساتھ اس بارے میں کسی بات چیت کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی۔

جبکہ حضرات انصار کا تعلق مدینہ سے تھا، یقیناً ان کے ساتھ بھی رسول اللہ ﷺ کی بہت زیادہ ”قربتیں“ تھیں، لیکن ان تمام تر ”قربتوں“ کے باوجود باقاعدہ ”قربت داری“ نہیں تھی، اگرچہ آپ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ پرانے مہاجرین کی طرح ان انصار کا مقام و مرتبہ بھی یقیناً بہت بلند ہے..... انصار کا مقام و مرتبہ بھی دنیا کے اس حقیر مال و متاع سے بہت بڑھ کر ہے..... ان کے نزدیک دنیاوی مال و اسباب کی کوئی حیثیت نہیں، ان کی اصل پونجی تو بس اللہ اور رسول کی محبت ہے..... مزید یہ کہ یہ انصار مدینہ اس سے قبل متعدد مواقع پر اپنی اسی ایمانی و اخلاقی کیفیت، اپنے اسی جذبے اور اپنے اسی بے مثال ”ایثار“ کا عملی طور پر اظہار بھی کر چکے تھے..... لیکن اس تمام تر مقام و مرتبے کے باوجود..... اور ان تمام تر حقائق کے باوجود..... آخر وہ بھی گوشت پوست کے انسان ہی تھے..... کوئی فرشتے نہیں تھے..... کوئی آسمانی مخلوق نہیں تھے..... ان کے دلوں میں بھی انسانی جذبات تھے..... ان کی بھی ”مالی ضروریات“ تھیں..... لہذا عین ممکن تھا کہ شاید ان میں سے کسی کے دل میں اس ”تقسیم“ کے بارے میں کوئی ”وسوسہ“ پیدا ہونے لگے.....!

لہذا آپ نے مناسب سمجھا کہ اس بارے میں ان کے ساتھ مناسب ”گفتگو“ کر لی جائے..... چنانچہ آپ کی فرمائش پر تمام انصار مدینہ ”ہجرانہ“ (۱) نامی بستی میں ایک جگہ

(۱) اسی ”ہجرانہ“ میں ہی تمام مال غنیمت کی تقسیم کا کام انجام دیا گیا تھا، یہ بستی مکہ شہر سے کچھ فاصلے پر (طائف کے راستے میں) واقع ہے۔

جمع ہوئے، اور تب رسول اللہ ﷺ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے اپنی گفتگو کا آغاز فرمایا:
 ”اے جماعتِ انصار! یہ نو مسلم لوگ ہیں، ان کے دل ابھی تک دنیاوی مال و دولت کے
 ساتھ ہی لٹکے ہوئے ہیں، جبکہ تمہارے دل اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کی دولت سے
 منور ہیں“

اور پھر آپؐ نے مزید فرمایا: ”اللہ کی قسم! تمہارے دلوں میں جو ایمان کی دولت ہے، وہ بہت
 بہتر ہے دنیا کی اس حقیر دولت سے کہ جو وہ اپنے ہمراہ لے گئے ہیں.....“
 رسول اللہ ﷺ کی یہ گفتگو سن کر انصارِ مدینہ خاموش رہے، تب آپؐ نے انہیں مخاطب
 کرتے ہوئے فرمایا: ”اے جماعتِ انصار! کیا تم میری بات کا کوئی جواب نہیں دو گے؟“
 تب انصار نے عرض کیا: ”بِمَاذَا نُحِبُّكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ لِلَّهِ وَلِرَسُولِهِ الْمَنْ وَ
 الْفَضْلُ“، یعنی ”اے اللہ کے رسول! ہم کیا جواب دیں.....؟ ہم پر اللہ اور اس کے رسولؐ
 کے جو احسانات ہیں..... ہم تو ان کا اقرار و اعتراف کرتے ہیں“

اور تب قدرے توقف کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا: ”اے جماعتِ انصار!
 کیا تمہیں یہ بات پسند نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر اپنے گھروں کو جائیں، اور تم
 ”محمدؐ“ کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاؤ.....“

کس قدر سادگی تھی رسول اللہ ﷺ کی اس بات میں..... کتنی معصومیت تھی..... اور کتنا اثر تھا
 یہ بات انصار کے دل میں پیوست ہو گئی..... اور تب وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ
 سکے..... ضبط کے سبھی بندھن ٹوٹ گئے..... اور بے اختیار وہ سب رونے لگے..... یہاں
 تک کہ روتے روتے ان کی داڑھیاں آنسوؤں سے بھیگ گئیں (۱)

(۱) جیسا کہ مسند امام احمد (۴۰۲) وغیرہ میں تذکرہ ہے ”حَتَّىٰ أَخْضَلُوا إِلَاحَهُمْ“ راوی: ابوسعید خدریؓ۔

اور وہ سب بیک زبان بولے ”رَضِينَا بِاللّٰهِ رَبًّا، وَبِرَسُولِهِ قِسْمًا وَحَقًّا“، یعنی ”ہم نے اللہ کو اپنا رب پسند کر لیا، اور اس کے رسول کی طرف سے ہمیں جو کچھ بھی ملا، اس پر ہم راضی ہو گئے“۔

یہ تھا انصارِ مدینہ کا ”ایثار“ اور یہ تھا اُن کا مقام و مرتبہ..... جیسا کہ خود قرآن کریم میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ان کے ”ایثار“ کی تعریف بیان فرمائی ہے، ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ.....﴾ (۱) یعنی ”وہ خود اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں دوسروں کو، خواہ وہ خود کتنے ہی محتاج ہوں.....“

نیز حضرات انصار کی منقبت و فضیلت اور مقام و مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے بھی خوب واضح ہوتا ہے کہ ”لَوْ أَنَّ النَّاسَ سَلَكَوا شِعْبًا وَسَلَكَتِ الْأَنْصَارُ شِعْبًا لَسَلَكْتُ شِعْبَ الْأَنْصَارِ“، یعنی ”اگر تمام لوگ کسی راستے پر چل رہے ہوں، اور انصار کسی دوسرے راستے پر چل رہے ہوں..... تو میں ضرور اسی راستے پر ہی چلوں گا جس پر انصار چل رہے ہوں گے“۔

نیز آپؐ نے حضرات انصارِ مدینہ کیلئے ان الفاظ میں دعاء فرمائی ”اللَّهُمَّ ارْحَمْ الْأَنْصَارَ، وَأَبْنَاءَ الْأَنْصَارِ، وَأَبْنَاءَ أَبْنَاءِ الْأَنْصَارِ“، یعنی ”اے اللہ! تو انصار پر رحم فرما، اور انصار کے بچوں پر بھی رحم فرما، اور انصار کے بچوں کے بچوں پر بھی رحم فرما“ (۲)

انصارِ مدینہ کیلئے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اس والہانہ انداز کا اظہار..... اور اس قدر جذباتی انداز میں ان کیلئے، نیز ان کی نسلوں کیلئے یہ دعاء..... یقیناً اس سے حضرات انصار کی شان اور منقبت و فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔

☆..... شیماء بنت حارث السعدیہ:

رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیات طیبہ کے ابتدائی پانچ سال مکہ شہر سے باہر بادیہ بنی سعد میں گزارے تھے، اُس دور میں یہ رواج تھا کہ ”شرفاء“ اور صاحب حیثیت قسم کے لوگ اپنے شیر خوار بچوں کو تربیت کیلئے بادیہ بھجوا کر تے تھے، تاکہ شہر کے مصنوعی ماحول سے دور بادیہ میں قدرتی آب و ہوا میں، نیز فطری ماحول میں بچے کی بہتر نشوونما ہو سکے۔

اسی دستور کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی والدہ ماجدہ آمنہ بنت وہب نے بھی اپنے اس نومولود نو نظر کو ”حلیمہ“ نامی بادیہ نشین خاتون کے حوالے کر دیا تھا جس کا تعلق ”بنو سعد“ سے تھا، اور اسی نسبت کی وجہ سے وہ ”حلیمہ سعدیہ“ کہلاتی تھیں۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ پانچ سال تک وہیں بادیہ بنی سعد میں مقیم رہے، اس دوران وقتاً فوقتاً حلیمہ سعدیہ اس نونہال کو اس کی ماں سے ملانے کی خاطر مکہ لاتی رہتی تھیں۔

اُس زمانے میں ہر بڑے قبیلے میں بہت سے ذیلی قسم کے چھوٹے چھوٹے قبائل اور خاندان ہوا کرتے تھے، مثلاً شہر مکہ میں ”قریش“، بڑا مشہور اور طاقتور قبیلہ تھا، جس کے بہت سے ذیلی قبائل تھے، مثلاً بنو ہاشم، بنو زہرہ، بنو عدی..... وغیرہ..... اسی طرح طائف اور اس کے مضافات میں آباد بڑے مشہور اور طاقتور قبیلے ”ہوازن“ کے بھی متعدد ذیلی قبائل تھے، جو کہ طائف اور مکہ کے درمیان پھیلے ہوئے تھے، انہی میں ایک ذیلی قبیلہ ”بنو سعد“ بھی تھا، ”ہوازن“ نے مسلمانوں کے خلاف جس جارحیت کا آغاز کیا تھا، جس کے نتیجے میں ”غزوہ حنین“ کا تاریخی واقعہ پیش آیا تھا، اس جارحیت میں ”ہوازن“ کے دیگر ذیلی قبائل کی طرح ”قبیلہ بنو سعد“ بھی شامل تھا۔

غزوہ حنین سے فراغت کے بعد اسی غزوے سے متعلق چھوٹے بڑے بہت سے انتظامی قسم

کے معاملات نمٹانے کی غرض سے رسول اللہ ﷺ اپنے لشکر سمیت چند دن اسی جگہ مقیم رہے۔

اس موقع پر یہ بات آپؐ کے ذہن میں تھی کہ آپؐ نے اپنے بچپن میں جو پانچ سال کا عرصہ اپنی رضاعی والدہ ”حلیمہ سعدیہ“ کے گھر میں گزارا تھا..... وہ یہی علاقہ تھا..... حلیمہ سعدیہ کا گھر یہیں کہیں آس پاس ہی تھا..... نیز آپؐ کو یہ بات بھی یاد تھی کہ حلیمہ سعدیہ کی ایک بیٹی ہوا کرتی تھی جس کا نام تھا ”شیماء“ اور جو کہ عمر میں آپؐ سے کچھ بڑی تھی..... اور دن بھر اپنے اس چھوٹے بھائی..... اس معصوم نونہال..... یعنی ”محمدؐ“ کو گود میں لئے ہوئے اپنے محلے کے دیگر بچوں کے ہمراہ گلی کوچوں میں کھیلتی رہتی تھی.....

اس غزوہ حنین کے موقع پر چونکہ ”ہوازن“ والوں کی کیفیت یہ تھی کہ ہر کوئی اپنے اس جوشیلے سپہ سالار مالک بن عوف کے حکم پر اپنے بیوی بچوں کو بھی ”میدان جنگ“ میں ہمراہ لایا تھا..... لہذا ”ہوازن“ کی شکست و پسپائی کے نتیجے میں مسلمانوں کے ہاتھ جو چھ ہزار قیدی لگے تھے، ان میں بڑی تعداد میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔

ایک روز رسول اللہ ﷺ جب اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ وہیں کسی جگہ تشریف فرما تھے کہ اس دوران ”بنو سعد“ سے تعلق رکھنے والی چند عورتوں کا اس جگہ سے گذر ہوا..... اس موقع پر ان میں سے ایک عورت کی جب رسول اللہ ﷺ پر نگاہ پڑی تو وہ ٹھٹک کر رہ گئی، اس کے بڑھتے ہوئے قدم وہیں رک گئے..... اور تب وہ آپؐ سے مخاطب ہو کر یوں کہنے لگی: ”میں شیماء ہوں..... مجھے دیکھئے..... میں آپؐ کی بہن شیماء..... حلیمہ سعدیہ کی بیٹی.....“

یہ آوازن کر..... اور اس عورت کی زبانی یہ بات سن کر..... رسول اللہ ﷺ چونک اٹھے..... آپؐ کے رخِ انور پر خوشی کے آثار نمایاں ہونے لگے..... لیکن فوراً ہی آپؐ نے اس عورت

کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ”اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ..... تم واقعی شیماء ہی ہو.....؟“ تب اس عورت نے بہت سی باتیں یاد دلائیں، بہت سی نشانیاں بتائیں..... جن کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ نے اسے پہچان لیا کہ واقعی یہ میری رضاعی بہن ”شیماء“ ہی ہے..... اور تب آپؐ نے نہایت گرمجوشی کے ساتھ اس کا استقبال کیا، خوب عزت افزائی فرمائی..... اور بہت زیادہ احترام کیا..... حتیٰ کہ آپؐ نے اپنے کندھے پر رکھی ہوئی اپنی چادر اتار کر زمین پر بچھائی اور شیماء کو اس پر بٹھایا (۱) نیز عرصہ دراز کے بعد ہونے والی اس اچانک ملاقات پر آپؐ نے انتہائی مسرت کا اظہار فرمایا۔ (۲)

جس طرح رسول اللہ ﷺ اپنی رضاعی بہن کے ساتھ اس ملاقات پر بہت زیادہ مسرور تھے، اسی طرح ”شیماء“ بھی بہت خوش تھی..... خصوصاً اس نے جب اپنے بھائی کی یہ اتنی بڑی قدر و منزلت..... اور اتنا عظیم مقام و مرتبہ دیکھا..... تو وہ بے حد خوش ہوئی اور انتہائی مسرت کا اظہار کیا..... اپنے بھائی کو اس قدر باعزت دیکھ کر وہ مسلمانوں کے ہاتھوں اپنی قوم کی اس بدترین شکست اور اتنے بڑے نقصان کا غم بھی بھول گئی..... نیز یہ کہ اس موقع پر وہ مسلمان بھی ہو گئی..... اور پھر جب وہ وہاں سے رخصت ہونے لگی تو رسول اللہ ﷺ نے

(۱) اُس دور میں معزز اور شرفاء قسم کے لوگ اپنے کندھے پر کوئی چادر یا رومال رکھا کرتے تھے، جس کسی کا بہت زیادہ احترام مقصود ہوتا..... اسے اپنی اس چادر پر بٹھایا کرتے تھے۔

(۲) رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ کے ابتدائی پانچ سال حلیمہ سعدیہ کے یہاں گزارے تھے، جبکہ غزوہ حنین سنہ آٹھ ہجری میں پیش آیا تھا، جبکہ اس کے تقریباً دو سال بعد سنہ گیارہ ہجری کے آغاز (ماہ ربیع الاول) میں آپؐ کا تریسٹھ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا تھا..... اس کا مطلب یہ ہوا کہ غزوہ حنین کے موقع پر آپؐ کی عمر مبارک تقریباً ساٹھ یا اسیٹھ برس ہو گئی..... جبکہ پانچ سال کی عمر میں آپؐ بادیہ بنی سعد سے واپس مکہ چلے آئے تھے..... اور اب اس قدر طویل کے عرصے کے بعد ”شیماء“ سے یہ ملاقات ہوئی تھی۔

اسے یہ پیشکش فرمائی کہ اگر وہ چاہے تو عزت و احترام کے ساتھ اب مسلمانوں میں ہی رہے..... اور اگر واپس اپنے علاقے کی طرف جانا چاہے تب بھی اسے روکا نہیں جائے گا، اس پر اس نے اپنے علاقے کی طرف واپس جانے کی خواہش ظاہر کی..... تب رسول اللہ ﷺ نے اسے انتہائی عزت و احترام کے ساتھ..... نیز بہت سے ہدایا و تحائف کے ساتھ..... وہاں سے رخصت فرمایا۔

☆..... طائف کی جانب پیش قدمی:

غزوہ حنین کے موقع پر مسلمانوں کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہونے کے بعد مشرکین بڑی تعداد میں طائف کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے تھے، جس پر رسول اللہ ﷺ نے ان کے تعاقب کی غرض سے طائف کی جانب پیش قدمی فرمائی، لیکن اس موقع پر وہ طائف والے بڑے مضبوط قلعوں کے اندر قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے لشکر کے ہمراہ ان کا محاصرہ کیا، پندرہ روز اسی کیفیت میں گذر گئے..... آخر رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ ”ان طائف والوں کے ساتھ اب سختی برتنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی..... لہذا اب ہمیں یہ محاصرہ ختم کر کے واپس لوٹنا چاہئے۔“

چنانچہ یہ محاصرہ ختم کر دیا گیا، رسول اللہ ﷺ کا یہ فیصلہ، نیز طائف والوں کے بارے میں آپ کا یہ اندازہ بالکل درست تھا، کیونکہ غزوہ حنین کے بعد اب ان میں کوئی دم ختم باقی نہیں رہا تھا..... اور پھر آپ کے اس فیصلے کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ رفتہ رفتہ وہ سبھی خود ہی دین اسلام قبول کرتے چلے گئے..... اور آئندہ چل کر دین کے علمبردار ثابت ہوئے۔

☆.....واپسی کا سفر:

طائف کا محاصرہ ختم کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اب واپسی کا فیصلہ فرمایا، واپسی کے اس سفر کے دوران جب آپؐ اپنے لشکر سمیت مکہ کے قریب ”جحرانہ“ نامی مقام پر پہنچے تو عمرے کی نیت سے وہاں احرام باندھا، اور مکہ مکرمہ پہنچ کر آپؐ نے اپنے جاں نثار ساتھیوں کے ہمراہ ”عمرہ“ ادا کیا، اور پھر وہاں سے مدینہ کی جانب واپسی کے سفر کا آغاز فرمایا، اس موقع پر آپؐ نے ”عتاب بن اُسید“ نامی ایک نوجوان کو ”امیر مکہ“ مقرر فرمایا، نیز اس موقع پر آپؐ نے سرکاری بیت المال سے ان کیلئے یومیہ ایک درہم وظیفہ بھی مقرر فرمایا، تاکہ وہ کسی کے دست نگر اور محتاج نہ رہیں..... اور یوں ذہنی سکون اور خوب دلجمعی کے ساتھ اپنے فرائض منصبی ادا کر سکیں۔ (۱)

جبکہ اسی موقع پر آپؐ نے فتح مکہ کے نتیجے میں اب وہاں نو مسلموں کی بڑی تعداد کے پیش نظر ان کی دینی تعلیم و تربیت کی غرض سے اپنے جلیل القدر انصاری صحابی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو وہاں بطور ”معلم“ مقرر فرمایا۔

☆ اور پھر رسول اللہ ﷺ اپنے جاں نثار ساتھیوں کے ہمراہ مکہ سے واپس مدینہ کی جانب روانہ ہو گئے، آپؐ کا یہ سفر کافی طویل ثابت ہوا تھا، فتح مکہ کے موقع پر آپؐ ماہ رمضان میں مدینہ سے مکہ کی جانب روانہ ہوئے تھے، اس کے بعد شوال کا پورا مہینہ گزر گیا تھا، اور اب ماہ ذوالقعدہ کے بالکل آخری دن چل رہے تھے، جب آپؐ مدینہ کیلئے واپس روانہ ہوئے۔

(۱) عتاب بن اُسید رضی اللہ عنہ کی عمر اس وقت محض بیس سال تھی، یہ مکہ کے ہی باشندے تھے اور قبیلہ قریش کے مشہور خاندان ”بنو امیہ“ سے ان کا تعلق تھا، بالکل نو مسلم تھے، فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے تھے، رسول اللہ ﷺ ان کی شرافت و نجابت سے متاثر ہوئے تھے اور انہیں ”امیر مکہ“ یعنی مکہ کا گورنر مقرر فرمایا تھا، البتہ رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے بعد انہوں نے خود ہی اس منصب سے کنارہ کشی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔

☆ اس موقع پر یقیناً رسول اللہ ﷺ کے قلبِ مبارک میں کتنی ہی یادیں گردش کر رہی ہوں گی..... تقریباً ڈھائی ماہ قبل جب مکہ آمد ہوئی تھی..... اُس وقت کے مناظر..... فتح مکہ کے یادگار اور تاریخی موقع پر پیش آنے والے حالات و واقعات کے مناظر..... اور پھر ”حنین“ میں کیا ہوا.....؟ ”حِجْرانہ“ کے مقام پر تقسیمِ غنائم کے وقت خلاف توقع کیسے کیسے معاملات پیش آئے..... ”ہوازن“ اور ”ثقیف“ کے ساتھ معاملات اور تعلقات میں کیسے کیسے موڑ آئے..... شہداء سے کس طرح عجیب و غریب قسم کے حالات میں اچانک ملاقات ہوئی..... اور پھر طائف کا محاصرہ کس طرح طول پکڑتا چلا گیا..... وغیرہ وغیرہ..... اسی کیفیت میں آپ ﷺ اپنے جاں نثار ساتھیوں کے ہمراہ اب مکہ سے مدینہ کی جانب رواں دواں تھے.....

☆ آج سے تقریباً آٹھ سال قبل بھی آپ ﷺ اسی طرح مکہ سے مدینہ کی جانب محو سفر تھے..... اور آج بھی..... لیکن آٹھ سال قبل آپ مکہ سے خفیہ طور پر روانہ ہوئے تھے..... دشمنوں اور تعاقب کرنے والوں کی عتابی نگاہوں سے بچتے بچاتے اور چھپتے چھپاتے..... اُس وقت آپ مدینہ کی جانب رواں دواں تھے پناہ کی تلاش میں..... لیکن اب آٹھ سال بعد صورتِ حال یکسر مختلف تھی..... اب آپ ﷺ کا یہ سفر خفیہ نہیں تھا..... اب آپ گسی پناہ کی تلاش میں نہیں جارہے تھے..... بلکہ آج تو آپ اپنے ہزاروں جاں نثاروں کی معیت میں..... بلکہ ان کی قیادت کرتے ہوئے ان راستوں پر گامزن تھے..... اور پھر یہ طویل سفر طے کرنے کے بعد آپ جب مدینہ پہنچے تو آج آپ وہاں اجنبی نہیں تھے..... مکہ سے خفیہ طور پر نہیں آئے تھے..... بلکہ آج تو آپ ”فاتح مکہ“ کی حیثیت سے وہاں تشریف لائے تھے..... اپنے شہر مدینہ میں..... کہ جو اولین اسلامی ریاست کا دار الحکومت تھا، اور آپ خود

ہی اس شہر مدینہ کے اور اس وسیع و عریض اسلامی ریاست کے فرمانروا تھے۔
مزید یہ کہ ”فتح مکہ“ کے بعد اب اگر آپ ﷺ چاہتے تو وہیں مکہ میں ہی مستقل طور پر مقیم
ہو جاتے..... لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا تھا..... بلکہ آپؐ تو مدینہ کی محبت میں..... نیز اہل
مدینہ کی محبت میں واپس چلے آئے تھے..... یقیناً یہ بھی آپؐ کی ”وفاء“ کی ایک اعلیٰ مثال
تھی.....!!



الحمد للہ آج بتاریخ ۲۷ / ذوالحجہ ۱۴۳۲ھ، مطابق یکم نومبر ۲۰۱۳ء، بروز جمعہ

یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ، وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

جزیرۃ العرب میں مختلف شورشیں..... اور ان کی سرکوبی:

فتح مکہ اور پھر غزوہ حنین و طائف کے بعد جب رسول اللہ ﷺ اپنے جاں نثار ساتھیوں کے ہمراہ واپس مدینہ منورہ تشریف لائے تو اب بظاہر اگرچہ جزیرۃ العرب میں عمومی کیفیت یہ تھی کہ مشرکین کی قوت ٹوٹ چکی تھی، اور ان میں اب کوئی دم خم باقی نہیں رہا تھا..... لیکن اس کے باوجود بعض اوقات دوزخ دراز کے علاقوں میں شر پسند اب بھی وقفاً فوقاً کوئی نہ کوئی شورش اور فتنہ برپا کئے رکھتے تھے..... کوئی نہ کوئی قبیلہ سرکشی دکھاتا رہتا تھا..... اور پھر خصوصاً یہ کہ اسلامی ریاست اب بہت زیادہ وسعت بھی اختیار کر چکی تھی..... لہذا اس قدر وسیع رقبہ پر پھیلی ہوئی اس ریاست کے اطراف و اکناف میں نظم و ضبط اور امن و امان قائم رکھنا بہت ضروری تھا، اور یہ کوئی آسان کام نہیں تھا..... لہذا فتح مکہ کے بعد سر اٹھانے والی ایسی مختلف شورشوں کی بیخ کنی اور سرکوبی کی غرض سے رسول اللہ ﷺ جزیرۃ العرب کے طول و عرض میں مختلف مقامات پر اور مختلف قبائل کی جانب فوجی مہمات (۱) ارسال فرماتے رہے..... فتح مکہ کا تاریخی واقعہ ہجرت کے آٹھویں سال پیش آیا تھا، اس کے اگلے ہی سال یعنی ہجرت کے نویں سال رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ سے ایسی جو فوجی مہمات ارسال فرمائیں ان کی تعداد سولہ تھی۔

ایسی ہی ایک فوجی مہم اُن دنوں رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت قبیلہ ”طی“ کی جانب روانہ فرمائی تاکہ اس قبیلہ کی طرف سے برپا کردہ شورش کا خاتمہ کیا جاسکے، یہ وہی قبیلہ تھا کہ جس کا سردار کسی زمانے میں ”حاتم طائی“ نامی شخص ہوا

(۱) یعنی مسلح فوجی دستے۔

کرتا تھا (۱) جس کی سخاوت و فیاضی، انسان دوستی، ہمدردی، مہمان نوازی اور غریب پروری کی داستانیں ملک عرب کے طول و عرض میں ضرب المثل بنی ہوئی تھیں (۲) حاتم طائی خود تو رسول اللہ ﷺ کی بعثت اور دین اسلام کا سورج طلوع ہونے سے قبل ہی اس جہان فانی سے کوچ کر چکا تھا..... البتہ اب اُس کا لائق و فائق بیٹا ”عدی بن حاتم“ اپنے اس قبیلے ”طی“ کا سردار تھا۔

ظہور اسلام سے قبل جب حاتم طائی اس قبیلے کا سردار تھا تب اس نے شرک اور بت پرستی سے تائب ہو کر دین نصرانیت اختیار کر لیا تھا (۳) اور یہی وجہ تھی کہ اس کا بیٹا ”عدی“ بھی نصرانی مذہب ہی کا پیروکار تھا۔

اس قبیلہ ”طی“ کی جانب سے جب ”شورش“ کا آغاز ہوا تو اس کی سرکوبی کی غرض سے رسول اللہ ﷺ کے حکم پر حضرت علی رضی اللہ عنہ اسلامی دستے کی قیادت کرتے ہوئے مدینہ سے اس علاقے کی جانب رواں دواں ہو گئے کہ جو اس قبیلے کا مسکن تھا (۴) وہاں پہنچنے کے بعد اسلامی لشکر اور قبیلہ ”طی“ والوں میں جنگ کی نوبت آئی، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو غلبہ نصیب ہوا، جبکہ قبیلہ ”طی“ والے شکست کھا گئے، بڑی تعداد میں وہ ادھر ادھر بھاگ کھڑے ہوئے، نیز ان کی بہت بڑی تعداد مسلمانوں کے ہاتھوں قیدی بنی،

(۱) قبیلہ ”طی“ کی طرف نسبت کی وجہ سے ”طائی“ کہلاتا تھا۔

(۲) بلکہ آج بھی مہمان نوازی اور سخاوت و فیاضی میں ”حاتم طائی“ کی مثالیں دی جاتی ہیں..... اور یہ کیفیت صرف ملک عرب تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ عرب و عجم میں ہر جگہ یہی صورت حال موجود ہے۔

(۳) ظہور اسلام سے قبل دین نصرانیت ہی آسمانی اور الہامی دین تھا۔

(۴) یہ علاقہ آج کل سعودی عرب میں ”حائل“ کے نام سے مشہور ہے، جو کہ مدینہ منورہ سے تقریباً چار سو کلومیٹر کی مسافت پر واقع ہے۔

جبکہ ان کا سردار ”عدی بن حاتم الطائی“ اپنے علاقے سے بچ نکلنے میں کامیاب رہا، اور وہاں سے فرار ہونے کے بعد وہ مسلسل سفر کرتا ہوا ملکِ شام جا پہنچا، جہاں اس نے اپنے ہم مذہب لوگوں یعنی ”رومیوں“ کی پناہ حاصل کر لی (۱)

دوسری جانب مسلمان جب کامیاب و کامران وہاں سے واپس مدینہ کی جانب عازم سفر ہوئے تو اب ان کے ہمراہ اس شکست خوردہ قبیلہ ”طی“ سے تعلق رکھنے والے قیدی بھی بڑی تعداد میں موجود تھے، اور اسی کیفیت میں مسلسل سفر کرتے ہوئے یہ اسلامی لشکر آخر واپس مدینہ منورہ آ پہنچا۔

☆.....سَفَّانہ بنت حاتم الطائی:

ایک روز رسول اللہ ﷺ جب مسجد نبوی کے قریب سے گزر رہے تھے تب وہاں ان قیدیوں میں سے کچھ لوگ موجود تھے، انہی میں سے ایک عورت نے آگے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ سے رُکنے کی درخواست کی، اور اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے یوں کہنے لگی: ”مجھے دیکھئے..... میں اپنے قبیلہ ”طی“ کے سابق سردار ”حاتم طائی“ کی بیٹی ہوں..... اور قبیلے کے موجودہ سردار ”عدی بن حاتم“ کی بہن ہوں..... میرا باپ ملکِ عرب کا انتہائی سخی، مہمان نواز اور مہربان ترین انسان تھا..... جس کی سخاوت و فیاضی اور انسان دوستی و ہمدردی ضرب المثل تھی..... لیکن وہ تو اب اس دنیا میں نہیں رہا..... اور میرا بھائی بھی اس وقت بہت دور ہے..... وقت بدل چکا..... حالات بدل گئے..... سبھی کچھ بدل گیا..... اے اللہ کے رسول!

(۱) ملکِ شام اس زمانے میں ”سلطنتِ روم“ کا حصہ تھا، اور ”رومی“ نصرانی مذہب کے پیروکار تھے، جبکہ عدی بن حاتم بھی اپنے باپ حاتم طائی کی طرح دینِ نصرانیت اختیار کر چکا تھا، لہذا مسلمانوں کے ہاتھوں شکست و پستی کے بعد اب وہ پناہ کی تلاش میں اپنے ان ہم مذہب لوگوں کے پاس آ پہنچا اور وہیں رہائش اختیار کر لی۔

مجھے دیکھئے..... میں آپ کے سامنے کھڑی ہوں..... سقانہ..... حاتم طائی کی بیٹی..... میرا باپ جو ہمیشہ مجبور و لاچار لوگوں کی مدد کیا کرتا تھا..... بے آسرا اور بے ٹھکانہ لوگوں کو ٹھکانہ فراہم کیا کرتا تھا..... آج میں اس کی بیٹی خود مجبور ہوں..... لاچار ہوں..... اور بے ٹھکانہ ہوں.....!

رسول اللہ ﷺ اس کی اس گفتگو سے بہت زیادہ متاثر ہوئے، اور چونکہ اس کا باپ انتہائی سخی انسان تھا..... اور ظاہر ہے کہ سخاوت و مہربانی، مہمان نوازی اور انسان دوستی..... یہ سب کچھ تو یقیناً اعلیٰ ترین اخلاق میں سے ہے..... لہذا آپؐ نے اس کی اس خوش اخلاقی کا لحاظ کیا..... اور جب اس کی خوش اخلاقی کا لحاظ کیا تو پھر مزید یہ کہ آپؐ نے اس کی اس بیٹی کا بھی لحاظ کیا..... کہ..... عظیم باپ کی عظیم بیٹی ہے..... اور پھر آپؐ نے اس کے ساتھ خوب اکرام کا معاملہ فرماتے ہوئے اسے بہت سے ہدایا و تحائف عنایت فرمائے، نیز اس کیلئے آزادی اور اس قید سے رہائی کا اعلان بھی فرمایا۔

رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اس انعام و اکرام اور حسن سلوک اور پھر اپنی رہائی کی یہ خوشخبری سننے کے بعد اس نے نہایت گرمجوشی کے ساتھ آپؐ کا شکریہ ادا کیا..... البتہ اس موقع پر اس نے اس بات کا عملی ثبوت پیش کیا کہ واقعی وہ عظیم باپ کی عظیم بیٹی تھی..... چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے وہ یوں کہنے لگی کہ ”اے اللہ کے رسول! میں اکیلی آزاد ہو جاؤں..... اور یہاں سے اپنے علاقے کی طرف چلتی بنوں..... جبکہ یہ میرے قبیلے والے سبھی لوگ یہاں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہیں..... میں ایسا نہیں کر سکتی..... لہذا..... یا تو میں بھی انہی کے ساتھ یہاں مسلسل قید میں ہی رہوں گی، اور یا یہ سب میرے ہمراہ جائیں گے۔“

اپنے قبیلہ والوں کیلئے اس کا یہ جذبہ اور ان کیلئے یہ اس قدر خلوص اور وفادیکھ کر رسول اللہ ﷺ مزید متاثر ہوئے..... اور تب آپؐ نے ان سبھی کی رہائی کا حکم صادر فرمایا..... جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ”سُقّانہ“ سمیت قبیلہ ”طی“ سے تعلق رکھنے والے یہ تمام افراد مسلمان ہو گئے..... اور یوں نبی رحمت ﷺ کی خوش اخلاقی، انسان دوستی اور بے مثال حسن سلوک کی بدولت یہ لوگ اب دینِ برحق کی نعمت سے مالا مال ہونے کے بعد مدینہ منورہ سے اپنے علاقے کی جانب روانہ ہو گئے۔

سُقّانہ نے اپنے گھر پہنچنے کے بعد بہت جلد وہاں سے ملکِ شام کی طرف رحلتِ سفر باندھا..... اور وہاں پہنچنے کے بعد اس نے اپنے بھائی عدی بن حاتم سے ملاقات کی، اور اسے رسول اللہ ﷺ کے اعلیٰ اخلاق اور بے مثال حسن سلوک کے بارے میں، نیز اپنے قبولِ اسلام کے بارے میں مطلع کیا، نیز اس موقع پر اس نے نہایت اصرار اور گرمجوشی کے ساتھ اسے بھی دینِ برحق قبول کر لینے کا مشورہ دیا، چنانچہ بہن کے اس مخلصانہ مشورے پر عمل کرتے ہوئے وہ ملکِ شام سے سفر کرتا ہوا مدینہ پہنچا، جہاں اسے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری اور دینِ اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا موقع ملا، جس کے نتیجے میں وہ مسلمان ہو گیا..... اور یوں وہ محض عدی بن حاتم سے اب رسول اللہ ﷺ کے صحابی حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ بن گئے..... اب ان کے شب و روز رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں گزرنے لگے جہاں وہ نہایت ذوق و شوق کے ساتھ ہمہ وقت آپؐ سے کسبِ فیض اور تحصیلِ علم دین میں مشغول و منہمک رہنے لگے..... رسول اللہ ﷺ سے روایت کردہ ان کی متعدد احادیث صحاح ستہ میں موجود ہیں۔

الحمد للہ آج بتاریخ ۷/محرم ۱۴۳۵ھ، مطابق ۱۰/نومبر ۲۰۱۳ء بروز اتوار یہ باب مکمل ہوا۔

غزوہ تبوک

رسول اللہ ﷺ اور آپ کے جاں نثار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو سا لہا سال سے مشرکین مکہ کی جانب سے جارحیت اور مخالفت کا سامنا تھا، وقتاً فوقتاً مختلف جنگوں کے بعد بالآخر سن آٹھ ہجری میں فتح مکہ کا یادگار اور تاریخی واقعہ پیش آیا، جو کہ حق و باطل کے درمیان فیصلہ کن مرحلہ ثابت ہوا، جس کے نتیجے میں مشرکین مکہ کی تمام تر شان و شوکت و استان ماضی بن کر رہ گئی..... اس فتح مبین کے بعد مشرکین مکہ کی طرف سے چند معمولی جھڑپوں کے سوا باقاعدہ کوئی بڑی مشکل پیش نہیں آئی۔

لیکن مشرکین مکہ کی طرف سے اب اس بے فکری اور یکسوئی حاصل ہونے کے بعد جلد ہی، یعنی اگلے ہی سال سن ۹ ہجری میں ایک اور بڑی آزمائش سامنے آکھڑی ہوئی، وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کو اور مسلمانوں کو مسلسل اس قسم کی خبریں موصول ہونے لگیں کہ روئے زمین کی سب سے بڑی قوت یعنی ”سلطنتِ روم“ نے مسلمانوں پر یلغار کرنے اور انہیں ہمیشہ کیلئے نیست و نابود کر دینے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے..... اور اس مقصد کیلئے ملکِ شام کی سرحدوں پر ”تبوک“ نامی مقام پر ان کا بہت بڑا لشکر جمع ہو چکا ہے.....!

یہ خبر مسلمانوں کیلئے انتہائی تشویش کا باعث بنی، رسول اللہ ﷺ نے اپنے جاں نثار ساتھیوں کو تیاری کا حکم دیا۔

غزوہ تبوک (جو کہ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں آخری غزوہ ثابت ہوا تھا) کے موقع پر کچھ ایسے حالات و واقعات پیش آئے جو اس سے قبل کبھی کسی غزوے کے موقع پر پیش نہیں آئے

تھے، اور اسی وجہ سے یہ غزوہ بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گیا تھا..... مثلاً یہ کہ:

☆..... یہ جنگ اُس دور میں تمام روئے زمین کی سب سے بڑی اور نہایت خطرناک قوت یعنی ”سلطنتِ روم“ کے خلاف لڑی جانے والی تھی۔

☆..... اس سے قبل جتنے غزوات پیش آئے تھے وہ سب مشرکینِ عرب کے خلاف لڑے گئے تھے، اگرچہ چند غزوات یہود کے خلاف بھی لڑے گئے تھے، لیکن وہ یہود صدیوں سے جزیرۃ العرب میں ہی آباد تھے، لہذا زبانِ لب و لہجہ رہن سہن، نیز فنونِ حرب وغیرہ کے لحاظ سے وہ کافی حد تک مقامی عرب باشندوں جیسے ہی تھے۔

مقصد یہ کہ گذشتہ تمام جنگوں کے موقع پر اگرچہ عقیدہ و ایمان کے لحاظ سے تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں میں اور ان کے مد مقابل دشمنوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا..... البتہ زبانِ لب و لہجہ، فنونِ حرب، اور سامانِ جنگ وغیرہ کے لحاظ سے دونوں میں مکمل مماثلت تھی..... جو اسلحہ مسلمانوں کے پاس تھا، وہی دشمن کے پاس بھی تھا، جنگ لڑنے کے جو طور طریقے مسلمانوں کے تھے وہی دشمن کے بھی تھے..... جو زبانِ مسلمان بولتے تھے وہی زبانِ دشمن بھی بولتے تھے..... البتہ فرق صرف تعداد کا تھا..... یعنی سامانِ جنگ کی نوعیت میں تو اگرچہ مماثلت تھی لیکن تعداد میں بہت فرق تھا..... مسلمانوں کی تعداد ہمیشہ کم رہی جبکہ دشمن ہمیشہ بڑے لشکرِ جرار کے ہمراہ یلغار کرتا رہا..... مسلمانوں کو ہمیشہ سامانِ جنگ کی قلت درپیش رہی، جبکہ دشمن کے پاس ہمیشہ سامانِ جنگ نیز ہر قسم کے اسباب و وسائل کی خوب فراوانی رہی.....!

اب غزوہ تبوک جب درپیش آیا تو یہ پہلا موقع تھا کہ دشمن بالکل نیا اور نامانوس تھا..... ایک بالکل نئے اور اجنبی دشمن کے ساتھ مقابلے کی نوبت آ رہی تھی کہ جس کی زبان بھی مختلف تھی،

جس کے جنگ لڑنے کے انداز اور طریقے بھی یقیناً مختلف ہوں گے..... شاید سامانِ جنگ اور فنونِ حرب بھی جدا ہوں گے (۱) رسول اللہ ﷺ کے جاں نثار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ایمانی کیفیت کے لحاظ سے جن بندوقوں پر تھے یقیناً اس میں کسی شک و شبہ کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے..... لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ وہ کوئی آسمانی مخلوق نہیں تھے..... وہ بھی گوشت پوست کے انسان ہی تھے..... لہذا یہ تمام باتیں ان کیلئے بھی یقیناً پریشانی کا باعث تھیں (۲)

☆..... یہ سفر بہت زیادہ طویل تھا، مدینہ سے تبوک تک مسافت بہت زیادہ تھی اور راستہ کافی دشوار گزار بھی تھا، سفری سہولتوں کا فقدان تھا، اس سے قبل کبھی کسی غزوے کے موقع پر اس قدر طویل سفر کی نوبت نہیں آئی تھی۔

☆..... یہ غزوہ ایسے موسم میں پیش آیا کہ جب قحط سالی چل رہی تھی، غلہ و اناج کی کمی تھی، (۱) اگرچہ اس سے صرف ایک سال قبل ہی یعنی سن آٹھ ہجری میں سلطنتِ روم کے خلاف مشہور و معروف ”غزوہ مؤتہ“ کی نوبت آئی تھی، اس موقع پر اگرچہ جنگ شروع ہونے کے بعد صورتِ حال یقیناً نازک اور خطرناک ہو گئی تھی..... لیکن ابتداء میں وہ معاملہ دراصل اس قدر نازک نہیں تھا، کیونکہ وہ تورومیوں کے ایک ظالم و جابر گورنر کے ہاتھوں رسول اللہ ﷺ کے ایک قاصد کو ناحق قتل کئے جانے کے بعد جوابی اور تادیبی کارروائی کی غرض سے ایک مہم ملکِ شام کی جانب روانہ کی گئی تھی..... مزید یہ کہ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے بھی شرکت نہیں فرمائی تھی..... جبکہ باقاعدہ علی الاعلان سلطنتِ روم کے خلاف ایک بڑی جنگ کی حیثیت سے یہی ”غزوہ تبوک“ ہی پہلا موقع تھا۔

(۲) بلکہ یہ تو ان کی مزید رفعتِ شان کا واضح ثبوت ہے کہ اس قدر نازک اور خطرناک ترین صورتِ حال اور اتنی زیادہ مشکلات کے باوجود ان کے قدم ڈگمگائے نہیں..... اور نہ ہی ان کی استقامت میں کوئی لغزش آسکی..... اور کسی طرح اللہ پر توکل کئے ہوئے وہ حضرات بغیر کسی ٹال مٹول اور بغیر کسی تردد کے..... جان ہتھیلی پر لئے ہوئے..... رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تبوک کی جانب رواں دواں ہو گئے.....!!

نیز وسائل کی شدید قلت کا سامنا تھا حتیٰ کہ جب یہ لشکر تبوک کی جانب روانہ ہوا تو کیفیت یہ تھی کہ اٹھارہ افراد باری باری ایک اونٹ پر سفر کر رہے تھے..... یوں یہ طویل فاصلہ طے کیا گیا۔

☆..... سخت گرمی کا موسم تھا، گرمی کی شدت کی وجہ سے منافقین ایک دوسرے کو یوں کہتے پھر رہے تھے کہ ”اس قدر شدید گرمی میں مت سفر کرنا“ قرآن کریم میں منافقین کی اسی بات کا یوں تذکرہ کیا گیا ہے: ﴿وَقَالُوا لَا تَنْفِرُوا فِي الْحَرِّ﴾ یعنی یہ منافقین یوں کہتے ہیں کہ ”گرمی میں مت نکلو“ اس پر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی جانب سے ان کیلئے یہ شدید وعید نازل ہوئی ﴿قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا، لَوْ كَانُوا يَفْقَهُونَ﴾ (۱) یعنی ”اے نبی! آپ کہہ دیجئے کہ جہنم کی آگ تو بہت زیادہ گرم ہے، کاش وہ سمجھتے“

مطلب یہ کہ کاش وہ اس بات کو سمجھتے کہ دنیا کی جس گرمی سے بچنے کی خاطر وہ اللہ اور رسولؐ کے حکم کی خلاف ورزی کے مرتکب ہو رہے ہیں اور یوں اپنے لئے جہنم کا سامان کر رہے ہیں، کاش وہ اس بات کو سمجھتے کہ جہنم کی وہ گرمی تو دنیا کی اس گرمی کے مقابلے میں بہت زیادہ شدید ہوگی..... تب وہاں وہ کیا کریں گے.....؟

الغرض منافقین کی طرف سے اس قسم کی باتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ گرمی کے ساتھ ساتھ منافقین کی یہ باتیں بھی اس موقع پر پست ہمتی، حوصلہ شکنی اور بددلی پھیلانے کا سبب بن رہی تھیں۔

☆..... کھجوریں پکنے کا موسم تھا، اُن لوگوں کی زندگی میں کھجوروں کی بہت زیادہ اہمیت تھی، کھجور ہی ان کی خوراک تھی، کھجور ہی ان کا ذریعہ معاش تھی، کھجور کی تجارت بڑے پیمانے پر کی جاتی تھی، کھجور پر ہی ان کی گذر بسر کا بڑی حد تک دار و مدار تھا..... چنانچہ بڑی محنت

سے تیار کردہ کھجور کی یہ فصل جب تیار ہو رہی تھی اور سال بھر کی محنت کا جب پھل سامنے نظر آنے لگا تھا..... ایسے میں اپنی محنت کے اس پھل کو یوں چھوڑ کر چلتے بننا..... جبکہ یہ خبر بھی نہ ہو کہ واپسی کب ہوگی.....؟ یقیناً یہ بہت ہی مشکل کام تھا۔

غرضیکہ اس غزوے کے موقع پر یہ تمام مشکلات درپیش تھیں، اور یہی وجہ تھی کہ خود قرآن کریم میں اس موقع کو ”سَاعَةُ الْعُسْرَةِ“، یعنی ”مشکل کی گھڑی“ کے نام سے یاد کیا گیا ہے، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿لَقَدْ تَابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ.....﴾ (۱) یعنی ”بے شک اللہ نے نبی کے حال پر توجہ فرمائی، اور مہاجرین و انصار کے حال پر بھی، جنہوں نے ”مشکل کے وقت“ نبی کا ساتھ دیا.....“

☆..... اس غزوے کیلئے روانگی کے موقع پر اس قدر مشکلات کا سامنا تھا کہ اُس معاشرے میں اسی چیز کو ”مؤمن اور منافق“ میں پہچان اور تمیز کیلئے ”معیار“ سمجھا جانے لگا، یعنی جو اس غزوے میں شریک ہوا وہی ”مؤمن“ ہے، اور جو کوئی [بغیر کسی شرعی عذر کے] اس غزوے میں شریک نہیں ہوا وہ ہمیشہ کیلئے ”منافق“ کہلایا (۲) کیونکہ اس قدر تکالیف اور مشکلات نیز انتہائی صبر آزمائش کے حالات کے باوجود اللہ اور رسول ﷺ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے اس غزوے کے موقع پر نکل پڑنا..... یہ کام تو صرف اہل ایمان ہی انجام دے سکتے تھے..... منافقین کے بس کی یہ بات نہیں تھی.....!

☆..... اس غزوے کے موقع پر جتنی بڑی تعداد میں قرآن کریم کی آیات نازل ہوئیں،

(۱) سورۃ التوبہ [۱۱۷]

(۲) ماسوائے تین حضرات، یعنی کعب بن مالک، بلال بن امیہ اور مرارہ بن الربیع رضی اللہ عنہم.....

کسی اور غزوے کے موقع پر اتنی آیات نازل نہیں ہوئیں، اس سے بھی اس غزوے کی خاص اہمیت واضح ہوتی ہے۔ (۱)

☆..... رسول اللہ ﷺ کا معمول یہ تھا کہ اس سے قبل ہمیشہ احتیاطی تدبیر کے طور پر آپؐ ہر غزوے کے موقع پر رازداری سے کام لیا کرتے تھے، مثلاً یہ کہ لشکر کی روانگی کب ہوگی؟ کس راستے پر سفر کیا جائے گا.....؟ وغیرہ وغیرہ..... تاکہ دشمن کو آپؐ کے منصوبوں کے بارے میں کوئی پیشگی معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔

لیکن اس غزوے کے موقع پر چونکہ مذکورہ بالا تمام مشکلات کی وجہ سے صورتِ حال کافی نزاکت اختیار کر چکی تھی اور معاملہ بہت حساس ہو چکا تھا..... لہذا رسول اللہ ﷺ نے رازداری سے کام لینے اور معاملات کو خفیہ رکھنے کی بجائے تیاری کا عام اعلان فرمادیا، نیز دور دراز کے علاقوں مثلاً مکہ اور طائف وغیرہ تک آپؐ نے قاصد روانہ فرمائے تاکہ وہاں جا کر لوگوں کو اس غزوے میں شرکت سے متعلق آپؐ کی طرف سے پیغام پہنچائیں، جس پر دور دراز کے علاقوں سے بھی نہایت جوش و جذبے کے ساتھ بڑی تعداد میں دستے مدینہ پہنچنے لگے۔

آخر اپنی طرف سے مناسب تیاری کر لینے کے بعد رسول اللہ ﷺ تیس ہزار جاں نثاروں پر مشتمل اپنے لشکر کی قیادت کرتے ہوئے مدینہ سے تبوک کی جانب رواں دواں ہو گئے اور تقریباً ایک ہزار کلومیٹر کا یہ سفر پندرہ دن میں طے کیا گیا۔

منزل مقصود یعنی ”تبوک“ کے مقام پر پہنچنے کے بعد اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں

(۲) اس غزوے سے متعلق نازل شدہ آیت سورہ ”توبہ“ میں ہیں، بلکہ اس سورت کا نام ”توبہ“ جس واقعے کی طرف نسبت کی وجہ سے معروف ہو گیا توبہ کے اس واقعے کا تعلق بھی اسی غزوہ تبوک ہی سے ہے۔

کیلئے غیبی امداد اس شکل میں ظاہر ہوئی کہ وہاں رومیوں کے کسی بڑے لشکر کا کوئی وجود ہی نظر نہیں آیا..... جس کا مطلب یہ تھا کہ یا تو رومی فوج مدینہ سے اسلامی لشکر کی تبوک کی جانب روانگی کی اطلاع ملنے پر جنگ کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے اس سرحدی علاقے سے اب واپس جا چکی تھی..... یا پھر یہ کہ تبوک میں رومی فوج کے بڑے پیمانے اجتماع کے بارے میں مسلمانوں کو جو خبر دی گئی تھی، اس میں کوئی صداقت نہیں تھی اور وہ محض منافقین اور خفیہ بدخواہوں کی طرف سے اڑائی ہوئی افواہ تھی..... تاکہ اس طرح مسلمانوں کو خوفزدہ اور پریشان کیا جائے، ذہنی و نفسیاتی صدمے سے دوچار کیا جائے، نیز یہ کہ کسی طرح انہیں بڑی تعداد میں مدینہ سے باہر دروازے کے مقام پر بھیج دیا جائے تاکہ شاید وہاں خود بخود یہ کسی بڑی مصیبت میں پھنس کر رہ جائیں اور انہیں مدینہ کی جانب واپسی نصیب ہی نہ ہو سکے۔

بہر حال وجہ جو بھی ہو..... غلط خبر اڑائی گئی ہو..... یا یہ کہ رومی واقعی بڑی تعداد میں وہاں جمع ہوئے تھے اور پھر واپس لوٹ گئے تھے..... بہر صورت مسلمانوں کیلئے بہتری ہی بہتری تھی کہ جنگ کی کوئی نوبت ہی نہیں آئی۔

اسی کیفیت میں رسول اللہ ﷺ اپنے لشکر کے ہمراہ بیس روز مسلسل تبوک میں ہی مقیم رہے تاکہ صورتِ حال خوب اچھی طرح واضح ہو جائے..... تاہم اس طویل قیام کے باوجود وہاں رومی فوج کا کوئی بڑا دستہ نظر نہیں آیا اور نہ ہی ان کی جانب سے کوئی ایسی مشکوک نقل و حرکت مشاہدے میں آئی کہ جس سے مسلمانوں کے خلاف ان کے جنگی عزائم کا اظہار ہوتا ہو..... البتہ وقتاً فوقتاً ان کے چھوٹے اور معمولی قسم کے اکادکادستے نظر آتے رہے، لیکن ان کی طرف سے جب کسی شرارت یا جارحیت کے کوئی آثار نظر نہیں آئے تو آپ ﷺ نے بھی

ان کے ساتھ کسی چھیڑ چھاڑ اور تصادم سے گریز کیا، جس سے یقیناً آپ کی صلح پسندی ظاہر ہوتی ہے۔ آخر آپ نے واپسی کا فیصلہ فرمایا اور پھر تبوک سے مدینہ کی جانب سفر کرتے ہوئے آپ اپنے جاں نثار ساتھیوں سمیت بخیر و عافیت ماہِ رجب سن ۹ ہجری میں مدینہ منورہ واپس پہنچ گئے، یہ سفر کل پچاس دن کا تھا، جس میں سے بیس دن تبوک میں قیام رہا، جبکہ باقی تیس دن آمد و رفت میں صرف ہوئے۔

☆.....نتائج:

غزوہ تبوک کے موقع پر اگرچہ مسلمانوں کو بہت زیادہ مشکلات اور ظاہری و نفسیاتی ہر قسم کی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا، حتیٰ کہ انہی مشکلات کی وجہ سے یہ غزوہ مؤمنین اور منافقین کے مابین تمیز اور پہچان کا معیار بن گیا..... تاہم نتائج کے اعتبار سے یہ غزوہ مسلمانوں کے حق میں بہت ہی بہتر اور انتہائی مفید ثابت ہوا، مثلاً یہ کہ:

☆..... اس غزوے کے موقع پر اگرچہ مشکلات تو بہت زیادہ درپیش تھیں، لیکن منزل مقصود یعنی ”تبوک“ پہنچنے کے بعد نہ تو کوئی دشمن نظر آیا اور نہ ہی کسی جنگ کی نوبت آئی..... اس طرح اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کیلئے غیبی امداد کا انتظام اور بے فکری و مسرت کا سامان کیا گیا۔

☆..... وہاں جزیرۃ العرب اور سلطنتِ روم کے مابین اس سرحدی علاقے میں بڑی تعداد میں ایسے جنگجو قبائل آباد تھے کہ جو اگرچہ عرب تھے، لیکن وہ نصرانی تھے، نیز سیاسی طور پر وہ سلطنتِ روم کے زیر اثر بھی تھے، یعنی عرب ہونے کے باوجود وہ رومیوں کے ہم مذہب بھی تھے اور ان کے زیر اثر بھی تھے، اور اسی وجہ سے ان کی تمام تر وفاداریاں بھی رومیوں کے ساتھ ہی تھیں، غرضیکہ دینی، سیاسی، اقتصادی، ہر لحاظ سے وہ رومیوں کے ہی

ساتھی اور ہمنوا تھے۔

لیکن اب رسول اللہ ﷺ کی وہاں تشریف آوری اور بیس روزہ قیام کے موقع پر ان میں سے متعدد قبائل کے سرکردہ افراد اور رہنما آپ کی خدمت میں از خود حاضر ہوئے، اور اپنی طرف سے مسلمانوں کے خلاف ہر قسم کی جارحیت سے باز رہنے کا یقین دلاتے ہوئے صلح کی خواہش نیز جذبہ خیر سگالی کا اظہار کیا..... یہ بات مسلمانوں کیلئے یقیناً باعث مسرت تھی۔

☆..... مدینہ اور اس کے مضافات میں اب تک منافقین کی بڑی تعداد موجود تھی، جو کہ چھپے ہوئے دشمن اور آستین کے سانپ کی حیثیت رکھتے تھے، مسلمانوں کی ان بڑھتی ہوئی فتوحات سے وہ انتہائی نالاں اور رنجیدہ تھے، دین اسلام اور پیغمبر اسلام کو نقصان پہنچانے کیلئے ہمیشہ موقع کی تلاش میں رہتے تھے، پہلے وہ مشرکین مکہ کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف سازشوں کے تانے بانے بننے میں مصروف رہتے تھے، اب مزید یہ کہ انہوں نے مسلمانوں کے ایک اور بڑے دشمن اور روئے زمین کی بہت بڑی قوت یعنی ”سلطنت روم“ کے ساتھ بھی خفیہ تعلقات استوار کر لئے تھے، مسلمانوں کی خبریں وہ خفیہ طور پر رومیوں تک پہنچایا کرتے تھے، نیز مدینہ میں خفیہ مقامات پر وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور ان کے خلاف سازشیں تیار کرنے اور خفیہ منصوبے تیار کرنے کی غرض سے خفیہ اجتماعات منعقد کیا کرتے تھے، چنانچہ غزوہ تبوک کے موقع پر جو کچھ ہوا اس میں بھی انہی کی طرف سے پھیلائی گئی افواہوں کا بہت بڑا عمل دخل تھا، مسلمانوں میں تشویش اور افراتفری پھیلانے نیز انہیں خوفزدہ و پریشان کرنے کی غرض سے یہی منافقین، رومیوں کی طرف سے مدینہ پر بڑے تباہ کن حملے کیلئے تیاریوں کی چھوٹی خبریں پھیلاتے رہے، اور پھر جب رسول اللہ ﷺ اپنے لشکر کے ہمراہ تبوک کی جانب روانہ ہوئے تب یہ ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے

رہے اور بہت خوشیاں مناتے رہے..... کہ یہ مسلمان چلے ہیں اب اتنی بڑی قوت سے ٹکریلے کیلئے..... جب ان کا رویوں کے ساتھ آمناسا منا ہوگا اور جنگ کی نوبت آئے گی..... تو یقیناً یہ سب نیست و نابود ہو جائیں گے..... ان میں سے کسی ایک کو بھی اپنی جان بچا کر زندہ واپس آنا نصیب نہیں ہوگا..... یہ سب وہیں مارے جائیں گے..... لہذا ان مسلمانوں سے ہمیشہ کیلئے ہماری جان چھوٹ جائے گی.....!

لیکن رسول اللہ ﷺ اپنے جاں نثار ساتھیوں سمیت کامیاب و کامران..... اور ہنسی خوشی واپس مدینہ تشریف لائے..... وہاں تبوک میں کسی جنگ کی نوبت ہی نہیں آئی، لہذا کوئی جانی یا مالی نقصان بھی نہیں ہوا، مسلمانوں کی تمام قوت محفوظ رہی، بلکہ عزت و شوکت مزید بڑھ گئی..... مزید یہ کہ وہاں بہت سے سرحدی قبائل کے سرداروں نے آکر خود مسلمانوں کے ساتھ صلح کر لی، اپنی طرف سے وفاداری اور عدم جارحیت کا یقین دلایا، اور خیر سگالی کا اظہار کیا..... یوں مسلمانوں کیلئے یہ سفر تو بہت زیادہ کامیاب اور مفید ثابت ہوا..... یہ صورت حال ان منافقوں اور بدخواہوں کیلئے بڑے صدمے کا باعث بنی..... ان کے دل مرجھانے لگے..... یوں ان کے ناپاک عزائم خاک میں مل گئے..... ان کے حوصلے پست ہو گئے..... جبکہ مسلمانوں کے حوصلے مزید بلند ہو گئے.....!!

☆..... حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی وفات:

سن ۹ ہجری میں غزوہ تبوک سے کامیاب و کامران اور ہنسی خوشی واپسی کے فوری بعد رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا اس جہان فانی سے کوچ کر گئیں، تمام مسلمانوں کیلئے عموماً اور آپ کیلئے خصوصاً ایک باپ کی حیثیت سے فطری اور طبعی طور پر یہ سانحہ بہت زیادہ رنج اور صدمے کا باعث بنا، جبکہ اس سے محض ایک سال قبل ہی آپ کی

بڑی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا بھی انتقال ہو چکا تھا، اور اس سے بھی پہلے ماہ رمضان سن ۲ ہجری میں عین غزوہ بدر کے روز آپ ﷺ کی دوسرے نمبر کی صاحبزادی یعنی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بھی انتقال کر چکی تھیں.....

یوں رسول اللہ ﷺ کی چار صاحبزادیوں میں سے یہ تین صاحبزادیاں خود آپ کی حیاتِ طیبہ کے دوران، اور آپ کی آنکھوں کے سامنے..... اور عین جوانی کی عمر میں..... اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئیں..... اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ان کے درجات بلند فرمائیں..... اور ہمیں اللہ تعالیٰ اپنے خاص فضل و کرم سے وہاں جنت الفردوس میں اپنے حبیب ﷺ نیز آپ کی آل اور تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صحبت و معیت عطا فرمائیں۔

آمین برحمتک یا ارحم الراحمین۔



الحمد للہ آج بتاریخ ۱۹/ محرم ۱۴۳۵ھ، مطابق ۲۲/ نومبر ۲۰۱۳ء بروز جمعہ یہ باب مکمل ہوا۔
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ، وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

عام الوفود؛ یعنی وفود کی آمد کا سال:

ہجرت کے آٹھویں سال ماہ رمضان میں فتح مکہ کا یادگار اور عظیم ترین تاریخی واقعہ پیش آنے کے بعد دین اسلام کو اور مسلمانوں کو بڑی تقویت نصیب ہوئی، جبکہ مشرکین اور مخالفین کی قوت اور شان و شوکت بری طرح متاثر ہوئی، اور پھر محض اگلے ہی سال یعنی جب ہجرت کا نوواں سال چل رہا تھا، تب تک سے مسلمانوں کی یوں صحیح سالم اور بخیر و عافیت واپسی اسلام اور مسلمانوں کیلئے مزید عزت و نیک نامی اور شان و شوکت کا سبب بنی، جبکہ مشرکین و منافقین مزید کمزور پڑ گئے اور دل برداشتہ ہو گئے، اس تمام صورت حال کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ اب جزیرۃ العرب میں دین اسلام اجنبی یا نانا نوس نہیں رہا، بلکہ اب دور دور تک اسلام کا چرچا ہونے لگا اور بڑی سرعت کے ساتھ دین اسلام پھیلتا چلا گیا..... لوگ بڑی تعداد میں فوج در فوج مسلمان ہونے لگے..... حتیٰ کہ اطراف و اکناف اور در دراز کے علاقوں میں آباد قبائل کو بھی اب اس بدلی ہوئی صورت حال میں دین اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی جستجو ہونے لگی، اور اس مقصد کیلئے مختلف قبائل نے اپنے وفود مدینہ ارسال کئے، چنانچہ ان دو سالوں یعنی ہجرت کے نویں اور دسویں سال بڑی تعداد میں وفود کی مدینہ آمد ہوئی، بالخصوص نویں سال یہ سلسلہ کافی عروج پر رہا اور اس سال مدینہ آنے والے ان وفود کی تعداد ستر سے زائد تھی، جن میں سے بعض وفود پچاس یا ساٹھ سے زائد افراد پر مشتمل تھے۔

دور دراز کے علاقوں سے تعلق رکھنے والے افراد پر مشتمل ان وفود کی بڑی تعداد میں مدینہ

آمد کا مقصد یہی تھا کہ یہ لوگ دین اسلام اور پیغمبر اسلام کی تعلیمات اور طور طریقوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں، قریب رہ کر ان تعلیمات کو جان سکیں اور پھر جانچ سکیں.....

چنانچہ مدینہ میں قیام کے دوران یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی، نیز آپ کے جاں نثار ساتھیوں کی سادہ اور پاکیزہ زندگی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے، آپ کے اعلیٰ اخلاق و کردار کو دیکھتے، اور اس حقیقت کو دیکھتے کہ اب تو آپ کو ملک عرب کی وسیع سلطنت حاصل ہو چکی ہے، یعنی اب آپ محض اللہ کے نبی اور دینی رہنما ہی نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اب تو آپ اتنی بڑی سلطنت کے حکمران اور فرمانروا بھی بن چکے ہیں..... مگر اس کے باوجود کوئی فخر و غرور نہیں ہے..... کوئی زیب و زینت نہیں ہے..... کوئی عیش و عشرت نہیں ہے..... بس وہی سیدھی سادھی زندگی ہے..... مسجد کی وہی چٹائی آپ کا شاہی تخت ہے..... اور وہی پرانا عمامہ آج بھی آپ کے سر کا تاج ہے..... گھر میں ایک چارپائی ہے جو کہ بان کی رسیوں سے بچی ہوئی ہے، جب آپ آرام کی غرض سے اس پر لیٹتے ہیں تو جسم مبارک پر ان رسیوں کے نشان پڑ جاتے ہیں..... آپ کے جاں نثاروں اور فرمانبرداروں کی بہت بڑی فوج موجود ہے، جو ہر دم ہر لمحہ اور ہر آن آپ کی خدمت کیلئے بیتاب رہتے ہیں، اور آپ کے اشارے کے منتظر رہتے ہیں، مگر اس کے باوجود آپ اپنے سبھی کام کاج خود ہی کرتے ہیں..... اپنے کپڑوں میں پیوند خود ہی لگاتے ہیں..... جو تا پھٹ جاتا ہے تو خود ہی اس کی مرمت کر لیتے ہیں..... اپنے کسی کام کیلئے کسی کو تکلیف نہیں دیتے..... دوسروں کو بھی یہی تاکید و تلقین کیا کرتے ہیں کہ کوئی کسی پر بوجھ نہ بنے..... ہر کوئی اپنا کام کاج خود کیا کرے..... آپ ہر ایک کی عزت کرتے ہیں..... کبھی کسی کا دل نہیں دکھاتے..... کسی کو تکلیف نہیں دیتے..... اور دوسروں کو بھی یہی تعلیم دیتے ہیں کہ کوئی کسی کا دل نہ دکھائے،

کسی کو نقصان نہ پہنچائے..... کسی کا حق نہ دبائے..... کسی کو تکلیف نہ پہنچائے..... نہ تو اپنی زبان سے..... اور نہ ہی اپنی کسی حرکت سے.....

دور دراز کے علاقوں سے آئے ہوئے یہ لوگ یہ تمام مناظر دیکھتے..... اور متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے..... اور پھر واپس اپنے علاقوں میں جا کر اپنے قبائل اور خاندان والوں کو بھی اس بارے میں تفصیلات سے آگاہ کرتے، جس پر وہ سب بھی متاثر ہوتے..... اور یوں اُس دور میں لوگ بہت بڑی تعداد میں فوج در فوج مسلمان ہوتے چلے گئے..... چنانچہ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ محض ایک سال قبل یعنی ہجرت کے آٹھویں سال فتح مکہ کے تاریخی موقع پر رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ آپ کے جاں نثار ساتھیوں کی تعداد دس ہزار تھی، اور پھر محض اگلے ہی سال یعنی ہجرت کے نویں سال غزوہ تبوک کے موقع پر آپ جب اپنے لشکر کی قیادت کرتے ہوئے مدینہ سے تبوک کی جانب رواں دواں تھے تب یہ تعداد تیس ہزار تک جا پہنچی تھی..... اور پھر محض اگلے ہی سال یعنی ہجرت کے دسویں سال آپ کے ہمراہ حجۃ الوداع کے یادگار موقع پر جو صحابہ کرام شریک تھے ان کی تعداد ایک لاکھ سے تجاوز کر چکی تھی.....!!



الحمد للہ آج بتاریخ ۲۷/محرم ۱۴۳۵ھ، مطابق ۳۰/نومبر ۲۰۱۳ء بروز ہفتہ

یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ، وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

حجۃ الوداع:

بیت اللہ کے معمارِ اول اللہ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام تھے (۱) جنہوں نے اپنے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ مل کر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کے طور پر تعمیر کعبہ کا مقدس ترین اور تاریخی فریضہ انجام دیا، جب یہ دونوں حضرات تعمیر کعبہ کے مقدس کام سے فارغ ہوئے تو انہیں اللہ کی طرف سے یہ حکم دیا گیا کہ لوگوں کو حج بیت اللہ کا حکم سنائیں، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ﴾ (۲) ترجمہ: (لوگوں میں آپ حج کی منادی کر دیجئے، لوگ آپ کے پاس آئیں گے پیادہ بھی اور دروازے کے ہر راستے سے دبلے پتلے اونٹوں پر بھی)

یعنی دروازے کے علاقوں سے طویل سفر کی مشقت و صعوبت برداشت کرنے کی وجہ سے سواری کے یہ جانور کمزور و لاغر ہو چکے ہوں گے۔

چنانچہ اللہ کے اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے بیت اللہ کے قریب (صفا کی جانب) جبل ابی قیس پر چڑھ کر یہ اعلان فرمایا۔

چنانچہ اس ندائے خلیل کے جواب میں دروازے کے علاقوں اور تمام اطراف و اکنافِ عالم سے حج بیت اللہ کی غرض سے لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا، مکہ کے اس بلند و بالا پہاڑ کی چوٹی سے بلند ہونے والی اس نیچیف صدا کو اللہ عز و جل نے اپنی قدرت سے دنیا کے کونے کونے تک پہنچا دیا، جس کا عملی مشاہدہ آج بھی حج و عمرہ کے موقع پر بخوبی کیا جاسکتا ہے۔

(۱) یعنی طوفانِ نوح [علیہ السلام] کے نتیجے میں بیت اللہ کے آثار و نشانات مٹ جانے کے بعد از سر نو معمارِ اول حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے۔ (۲) الحج [۲۷]

ہزاروں سال گزر جانے کے باوجود جزیرۃ العرب کے مشرکین بھی حج بیت اللہ کا خوب اہتمام کیا کرتے تھے، خصوصاً مشرکین مکہ کے نزدیک اس چیز کی مزید اہمیت تھی۔ (۱)

البتہ دین اسلام کا سورج طلوع ہونے کے بعد باقاعدہ اسلامی عبادت کی حیثیت سے فرضیت حج کا حکم ہجرت کے نویں سال حج کے موقع پر نازل ہوا، اور اس عبادت کو دین اسلام کی اہم ترین عبادات، بلکہ ”ارکان اسلام“ میں شمار کیا گیا۔

چنانچہ اس حکم کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ”امیر الحج“ مقرر فرمایا اور انہیں مسلمان حجاج کی قیادت کرتے ہوئے مکہ مکرمہ کی جانب روانگی کا حکم دیا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی روانگی کے بعد سورۃ براءۃ کی ابتدائی چالیس آیات نازل ہوئیں، جن میں کفار و مشرکین کے ساتھ کئے گئے مختلف معاہدات کے خاتمے کا، نیز آئندہ کیلئے ان سے مکمل لاتعلقی و برائت (بیزاری) کا اعلان کیا گیا تھا، اسی ”اعلان برائت“ کی وجہ سے یہ سورت ”براءۃ“ کے نام سے مشہور ہو گئی (۲)

حج کے موقع پر چونکہ جزیرۃ العرب کے تمام اطراف اکناف سے آئے ہوئے حجاج بڑی تعداد میں مکہ میں موجود ہوا کرتے تھے، لہذا یہ بات ضروری تھی کہ کسی طرح اس مناسب ترین موقع پر یہ آیات وہاں مکہ میں تمام حجاج کے اجتماع میں پڑھ کر سنادی جائیں، نیز ان آیات کے مفہوم و مضمون اور ان میں موجود احکام سے انہیں آگاہ کر دیا جائے۔

(۱) یعنی دین ابراہیمی سے تو وہ یقیناً مکمل منحرف ہو چکے تھے، عقیدہ و ایمان کا فساد، نیز ہر قسم کا اخلاقی بگاڑ بھی ان میں عروج پر تھا..... البتہ اس کے باوجود بیت اللہ کا احترام اور حج کا سلسلہ بدستور جاری تھا۔

(۲) اس سورۃ کا نام ”توبہ“ بھی ہے کیونکہ اس میں ان تین حضرات (کعب بن مالک، بلال بن امیہ اور مرارہ بن الریح رضی اللہ عنہم) کی قبولیت توبہ کا تذکرہ ہے جو غزوہ تبوک کے موقع پر شریک نہیں ہوئے تھے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس مقصد کی خاطر اب حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو مکہ کی جانب روانہ فرمایا، تاکہ وہ ”امیر الحجاج حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ“ سے جا ملیں، اس حکم کی تعمیل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی مکہ کی جانب روانہ ہو گئے اور تیز رفتاری کے ساتھ سفر کرتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جا ملے۔

مکہ مکرمہ پہنچنے کے بعد یوم النحر یعنی دس ذوالحجہ کے روز عرفات میں حجاج کے اجتماع کے موقع پر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے تاکید کے مطابق وہ آیات تمام مشرکین کو پڑھ کر سنائیں، نیز اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ان احکام و ہدایات کے بارے میں انہیں مطلع کرتے ہوئے ان کے ساتھ کئے گئے تمام معاہدات کے خاتمے کا اعلان کیا۔ (۱)

چونکہ انہی آیات میں ایک حکم یہ بھی تھا کہ ”مشرکین چونکہ نجس ہیں، لہذا اس سال کے بعد اب آئندہ کوئی مشرک مسجد حرام کے قریب بھی نہیں جائے گا۔“

چنانچہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے وہاں موجود حجاج میں سے مشرکین کو یہ حکم بھی پڑھ کر سنایا اور انہیں اس بارے میں خبردار کیا..... اور یوں مشرکین کیلئے ”حج بیت اللہ“ کا یہ آخری سال ثابت ہوا..... جس کے بعد ان کیلئے ہمیشہ کیلئے ”حد و حریم“ میں داخلے کی ممانعت ہو گئی۔ (۲)

(۱) مشرکین کے مختلف قبائل کے ساتھ مسلمانوں کے معاہدات مختلف نوعیت کے تھے اور اسی مناسبت سے یہ ”اعلان براءت“ تمام مشرک قبائل کیلئے یکساں نہیں تھا، بلکہ اس میں کچھ تفصیل تھی، اس بارے میں مزید آگاہی کیلئے سورۃ براءۃ کی ابتدائی آیات کی تفسیر ملاحظہ کی جائے۔

(۲) ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَاهِهِمْ

هَذَا.....﴾ التوبة [۲۸]

سن ۹ ہجری میں فرضیت حج کے اس حکم کے نزول کے بعد کیا جانے والا یہ حج نہایت عجیب و غریب نوعیت کا تھا، اس میں ایسے مناظر تھے کہ جو نہ کبھی اس سے قبل دیکھے گئے تھے اور نہ ہی کبھی اس کے بعد دیکھے گئے..... کیونکہ تاریخِ عالم میں یہ واحد حج تھا کہ جس میں مسلمان اور مشرکین بیک وقت دونوں شریک تھے..... دونوں وہاں یکجا تھے..... اور ایک ساتھ مناسک حج کی ادائیگی میں مشغول تھے..... البتہ دونوں کے طریقے یقیناً جدا جدا تھے.....!

☆..... اور پھر جب اگلے سال یعنی سن ۱۰ ہجری میں حج کا مہینہ قریب آیا تو رسول اللہ ﷺ نے خود حج کا ارادہ فرمایا، فرضیت حج کا حکم نازل ہونے کے بعد یہی آپ کا پہلا حج تھا اور یہی آخری حج تھا جو کہ تاریخ میں ”حجۃ الوداع“ کے نام سے معروف ہے، مسلمانوں کو جب آپ کے اس ارادے کی اطلاع ہوئی تو قریب و دور ہر جگہ سے بڑی تعداد میں انہوں نے نہایت ذوق و شوق اور خوب جذبہ و لگن کے ساتھ حج کی تیاری شروع کر دی، کیونکہ اس سے قبل اسلامی عبادت کے طور پر کبھی حج ادا نہیں کیا گیا تھا، مزید یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی معیت و صحبت میں اس مبارک اور اہم ترین فریضے کی ادائیگی کی تو یقیناً نشان ہی کچھ نرالی تھی.....

اس کے علاوہ یہ کہ اسلامی فریضے کی حیثیت سے چونکہ حج کا یہ پہلا موقع تھا، لہذا ہر ایک کی خواہش تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی معیت میں اب اسلامی طریقے کے مطابق حج ادا کیا جائے اور اس نادر موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ سے براہِ راست ”مناسک حج“ کی بھی خوب اچھی طرح عملی تربیت حاصل کر لی جائے۔

چنانچہ دو دروازے کے علاقوں سے بھی بہت بڑی تعداد میں شمعِ توحید کے پروانے مکہ پہنچنے لگے، اور پھر رسول اللہ ﷺ کی صحبت و معیت میں حج کے دوران جب یہ خوش نصیب افراد میدانِ عرفات میں جمع تھے تب وہاں ان کی تعداد ایک لاکھ سے تجاوز کر چکی تھی، اس سے

قبل کبھی حج کے موقع پر چشمِ فلک نے اتنا بڑا جمعِ غفیر اور انسانوں کا بحرِ بیکراں نہیں دیکھا تھا..... اور تب وہاں میدانِ عرفات میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی اونٹنی ”قصواء“ پر سوار ہو کر حجۃ الوداع کا وہ مشہور اور یادگار ترین خطبہ دیا جو تمام دنیائے انسانیت کیلئے ”دستور العمل“ کی حیثیت رکھتا ہے، اور جسے بجا طور پر ”انسانی حقوق“ کا بہترین منشور کہا جاسکتا ہے..... چنانچہ اس موقع پر آپؐ نے اس عظیم الشان مجمع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: أَيُّهَا النَّاسُ! اِسْمَعُوا قَوْلِي ، فَإِنِّي لَا أُدْرِى ، لَعَلِّي لَا أَلْقَاكُمْ بَعْدَ عَامِي هَذَا الْمَوْقِفِ أَبَدًا ، یعنی ”لوگو! میری بات غور سے سنو، کیونکہ شاید آج کے بعد آئندہ کبھی اس موقع پر میری تم سے ملاقات نہیں ہو سکے گی.....“

اس کے بعد آپؐ نے اپنی امت کو ”توحید“ کا سبق ایک بار پھر یاد دلایا..... کہ جس پر دینِ اسلام کی اصل بنیاد ہے..... اور جو تمام انبیائے کرام علیہم السلام کا اصل مقصدِ بعثت ہے۔ اس کے علاوہ آپؐ نے مزید ارشاد فرمایا: إِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ حَرَامٌ عَلَيْكُمْ ، كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا ، فِي بَلَدِكُمْ هَذَا ، وَفِي شَهْرِكُمْ هَذَا ، یعنی ”بے شک تمہارا خون، تمہارا مال، تمہاری عزت و آبرو باہم ایک دوسرے کیلئے اسی طرح حرام ہیں کہ جس طرح آج کا یہ دن، اور یہ شہر، اور یہ مہینہ قابلِ احترام ہے“

یعنی یہ حج کا دن، یہ مہینہ، اور یہ مقام جہاں حج بیت اللہ کے مناسک ادا کئے جا رہے ہیں..... جس طرح یہ سب کچھ واجب الاحترام ہے..... اور تم ان تمام چیزوں کی انتہائی عزت و تعظیم کیا کرتے ہو..... بعینہ اسی طرح اے مسلمانو! آپس میں ایک دوسرے کیلئے تمہاری جان، تمہارا مال، اور تمہاری عزت و آبرو بھی واجب الاحترام ہے..... ایک دوسرے کے خلاف قتل و غارتگری، لوٹ مار، اور عزت و آبرو کی پامالی اسی طرح تم سب پر حرام ہے.....!

نیز آپ ﷺ نے اس موقع پر اخوت و مساوات، تحمل و برداشت، رواداری، اور بقائے باہمی کا سبق سکھاتے ہوئے ان سب کو یہ حقیقت بھی یاد دلائی کہ ”تمام انسان آدم کی اولاد ہیں“ اور آدم مٹی سے بنے تھے، لہذا عزت کا معیار صرف تقویٰ ہے۔“

اس طرح رسول اللہ ﷺ نے اس اہم ترین موقع پر اپنے اس یادگار خطبے میں انسانی جان و مال اور عزت و آبرو کی قدر و قیمت کو سمجھنے کا سبق سکھایا، اور اس کی حفاظت اور احترام کی تاکید و تلقین فرمائی۔

نیز اس موقع پر آپ ﷺ نے اپنی امت کو مزید بہت سی وصیتیں اور نصیحتیں فرمائیں، خصوصاً کمزوروں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے حقوق کی حفاظت و رعایت، نیز عورتوں کے ساتھ حسن معاشرت اور نرمی برتنے کی خاص تاکید فرمائی۔

مجموعی طور پر اس خطبے میں جہاں عقیدہ و ایمان کی حفاظت، کتاب و سنت کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھنے، اور ”حقوق اللہ“ کی ادائیگی کی خوب تاکید و تلقین کی گئی تھی..... وہیں ”حقوق العباد“ کی ادائیگی کا بھی بہت زیادہ تاکید و اصرار کے ساتھ حکم دیا گیا تھا..... یہی وجہ ہے کہ صرف مسلمان ہی نہیں، بلکہ اغیار میں سے بھی بڑے بڑے نامی گرامی مفکرین و مصلحین اور دانشوروں کی نظر میں یہ ”خطبہ حجۃ الوداع“، محض وعظ و نصیحت ہی نہیں، بلکہ بجا طور پر یہ ”انسانی حقوق“ کا بہترین ”منشور“ بھی ہے۔

اور پھر اس خطبے کے اختتام پر رسول اللہ ﷺ نے اس عظیم الشان مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے استفسار فرمایا ”أَلَا هَلْ بَلَغْتُ؟“، یعنی ”کیا میں نے تم تک اللہ کا دین پہنچا دیا؟“ اس پر وہ سب بیک زبان بولے: نَشْهَدُ بِأَنَّكَ بَلَغْتَ، وَأَدَيْتَ، وَنَصَحْتَ، یعنی ”ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے اللہ کا دین پہنچا دیا، اور آپ کے ذمے (تبلیغ دین کی) جو

امانت تھی، وہ آپ نے ادا کر دی، اور آپ نے خوب نصیحت فرمادی، تب رسول اللہ ﷺ نے آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے تین باریہ کلمات کہے: اَللّٰهُمَّ فَاشْهَدْ، اَللّٰهُمَّ فَاشْهَدْ، اَللّٰهُمَّ فَاشْهَدْ، یعنی ”اے اللہ! اب تو بھی گواہ رہنا.....“ (۱)

اس یادگار موقع پر رسول اللہ ﷺ جب اپنے اس تاریخی خطبے سے فارغ ہوئے تو وہیں اسی وقت اور اسی مقام پر میدانِ عرفات میں ہی قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی: ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتَمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾ (۲) ترجمہ: (آج میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنا انعام بھر پور کر دیا اور تمہارے اسلام کے دین ہونے پر رضا مند ہو گیا)

اس آیت میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے ”تکمیلِ دین“ کی خوشخبری دی گئی تھی، یعنی اللہ کے دین کے نزول کا سلسلہ، نیز نزولِ وحی اور نبوت کا سلسلہ، جس کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی تھی، مختلف اوقات، مختلف مقامات، اور مختلف انبیائے کرام علیہم السلام سے ہوتا ہوا یہ مبارک سلسلہ آج اپنے عروج اور مرحلہ تکمیل کو پہنچ گیا۔

(۱) اس تاریخی خطبے کی تفصیلات صحیح بخاری و صحیح مسلم و دیگر کتب حدیث میں موجود ہیں (باب حجۃ النبی ﷺ)

(۲) المائدہ [۶]

الحمد للہ آج بتاریخ ۱۰/ صفر ۱۴۳۵ھ، مطابق ۱۳/ دسمبر ۲۰۱۳ء بروز جمعہ یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ، وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ

اپنے رب کی طرف واپسی:

ہجرت کے دسویں سال حجۃ الوداع کے دوران میدانِ عرفات میں وقوف کے موقع پر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی آیت: ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ أَتَمَّمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي.....﴾ میں اگرچہ ”تکمیلِ دین“ کی عظیم خوشخبری تھی کہ جس پر اہل ایمان بہت زیادہ شاداں و فرحاں ہو گئے تھے..... لیکن اس آیت میں اس عظیم بشارت کے ساتھ ساتھ ایک پیغام اور ”اشارہ“ بھی پوشیدہ تھا..... جس کی طرف اُس وقت حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی توجہ نہیں گئی تھی..... البتہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اُس خفیہ ”اشارے“ کو سمجھ گئے تھے، اور تب وہ انتہائی رنجیدہ و افسردہ ہو گئے تھے۔

وہ خفیہ ”اشارہ“ دراصل یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو اس آیت میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے یہ خبر دی گئی تھی کہ اے ہمارے حبیب! آپ کا مقصد بعثت اب پورا ہو چکا ہے..... لہذا اب اس دنیائے فانی سے آپ کی واپسی کا وقت قریب ہے.....!

مزید یہ کہ اس حج کے موقع پر آپ ﷺ نے اپنے یادگار خطبے کے آغاز میں ہی یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے کہ ”لوگو! میری بات غور سے سنو، کیونکہ شاید آج کے بعد آئندہ کبھی اس موقع پر میری تم سے ملاقات نہیں ہو سکے گی“

نیز اس حج کے دوران ایام التشریق میں رمی جمرات کے موقع پر بھی آپؐ نے اپنے جاں نثار ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کلمات ارشاد فرمائے تھے: خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ

..... لَعَلِّي لَا أَلْقَاكُمْ بَعْدَ عَامِي هَذَا..... یعنی ”لوگو! یہ مناسک حج تم مجھ سے خوب اچھی طرح سیکھ لو..... کیونکہ شاید اب آئندہ کبھی اس مقام پر میری تم سے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔“

جبکہ اس سے کچھ عرصہ قبل ہی سورۃ ”النصر“ بھی (۱) نازل ہو چکی تھی، جس میں فتح مکہ جیسے اہم ترین اور تاریخی واقعہ کے نتیجے میں لوگوں کے فوج در فوج قبول اسلام کا تذکرہ تھا..... لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں ایک اشارہ بھی پوشیدہ تھا..... اور وہ یہ کہ ”مقصد بعثت اب پورا ہو چکا..... لہذا اے ہمارے نبی..... اب آپ کی واپسی کا وقت قریب ہے، اور اس چیز کا تقاضا یہ ہے کہ اب آپ زیادہ سے زیادہ اپنے رب کی تسبیح اور حمد و ثناء بیان کیجئے، اور توبہ و استغفار کا خوب اہتمام کیجئے۔“

اس موقع پر بھی اس سورت کے معنی و مفہوم میں چھپے ہوئے اس خاص ”اشارے“ کی طرف کسی کی توجہ نہیں گئی تھی..... البتہ رسول اللہ ﷺ کے خاص ساتھی اور ”یارِ غار“، یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس خاص ”اشارے“ کو سمجھ گئے تھے..... اور تب بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ (۲)

(۱) اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ..... (۲) سورۃ النصر میں پوشیدہ اسی ”اشارے“ کے تقاضوں پر عمل کرتے ہوئے ہر انسان کو چاہئے کہ اپنی عمر کے آخری حصے میں جب اس دنیائے فانی سے رخصتی کا وقت قریب آچکا ہو..... تو بکثرت استغفار کا اہتمام و التزام کرے، کیونکہ دنیا سے رخصتی اور اپنے خالق و مالک کی طرف روانگی سے قبل انسان کیلئے یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ وہ گناہوں کے بوجھ سے آزاد ہو، ظاہری و باطنی پاکیزگی و نفاست سے آراستہ ہو، عیوب و نقائص کم ہوں اور خیر و خوبی زیادہ ہو، اس کی گردن میں کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی کا کوئی بوجھ نہ ہو..... بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کی ہمیشہ ہی یہی کیفیت رہنی چاہئے..... کیونکہ کیا معلوم آخری وقت کب آجائے.....؟؟

نیز یہ کہ اسی سال حج سے قبل جب رمضان کا مبارک مہینہ آیا تھا، تب رسول اللہ ﷺ نے جبریل امین علیہ السلام کے ساتھ قرآن کریم کا دوبار ”مذاکرہ“ فرمایا تھا (۱)، جبکہ اس سے قبل ہر سال ماہ رمضان میں قرآن کریم کا یہ ”مذاکرہ“ ایک بار کرنے کا معمول تھا۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ اس سے قبل ہمیشہ ماہ رمضان میں اپنی مسجد میں دس روز ”اعتکاف“ فرمایا کرتے تھے، جبکہ اس سال جب رمضان آیا تھا، تب آپ ﷺ نے خلاف معمول بیس روز اعتکاف فرمایا تھا، اور جب آپ ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس کی وجہ دریافت کی تھی، تو آپ ﷺ نے اپنی لاڈلی بیٹی کو مخاطب کرتے ہوئے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی تھی کہ: ”مجھے اب اپنی موت قریب محسوس ہوتی ہے“۔ (۲)

انہی دنوں آپ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب ملک یمن کی جانب روانہ فرمایا تو آپ اس موقع پر انہیں رخصت کرنے کی غرض سے کچھ دور تک ان کے ہمراہ چلتے رہے..... اس موقع پر حضرت معاذ اپنی سواری پر تھے، جبکہ آپ ان کے ہمراہ پیدل ہی چل رہے تھے..... اور پھر ایک جگہ رک کر آپ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ”اے معاذ! شاید اب دوبارہ ہماری کبھی ملاقات نہیں ہو سکے گی..... تم جب یمن سے واپس آؤ گے تو شاید میری مسجد..... اور میری قبر..... کے قریب سے گزر دو گے.....“

اور تب آپ ﷺ کی زبانی یہ بات سن کر معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے تھے.....

اور پھر آپ ﷺ نے اپنا رخ انور مدینہ شہر کی جانب موڑ لیا تھا، اور اس طرف بغور دیکھتے

(۱) یعنی رسول اللہ ﷺ اور جبریل امین علیہ السلام دونوں باہم ایک دوسرے کو قرآن کریم سنایا کرتے تھے (دور کیا کرتے تھے) (۲) لا أرى إلا خضرًا جلی (بخاری [۴۹۹۶] کتاب [۶۹] فضائل القرآن، باب [۷] کان جبریل یعرض القرآن علی النبی ﷺ)

ہوئے یہ ارشاد فرمایا تھا ”إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِبِي الْمُتَّقُونَ“، مَنْ كَانُوا، وَ حَيْثُ كَانُوا“ (۱) یعنی ”مجھ پر سب سے زیادہ حق ان لوگوں کا ہے جو ”متقی“ ہوں، خواہ وہ کوئی بھی ہوں اور جہاں کہیں بھی ہوں“ (۲)

اسی کیفیت میں سن دس ہجری اپنے اختتام کو پہنچا، اور اس کے بعد جب اگلا سال آیا، یعنی سن گیارہ ہجری، تو اس نئے سال کا پہلا مہینہ یعنی محرم آیا اور گزر گیا، اور پھر دوسرا مہینہ یعنی صفر شروع ہوا تو اس مہینے کے آغاز کے ساتھ ہی آپؐ نے باقاعدہ اپنے ”سفر آخرت“ کی تیاری شروع فرمادی، چنانچہ انہی دنوں ایک روز آپؐ میدان اُحد کی طرف تشریف لے گئے، اور وہاں شہدائے اُحد کیلئے دعائے مغفرت فرمائی، اور پھر وہاں سے واپسی پر آپؐ نے لوگوں کے سامنے مختصر خطبہ دیا، جس میں آپؐ نے فرمایا: ”إِنِّي فَرَطُكُمْ، وَإِنِّي شَهِيدٌ عَلَيْكُمْ، وَإِنِّي وَاللَّهِ لَأَنْظُرُ إِلَى حَوْضِي الْآنَ“ (۳) یعنی ”لوگو! میں تم سے آگے جانے والا ہوں، اور میں تمہارے بارے میں گواہی دینے والا ہوں، اللہ کی قسم! میں اپنے حوض کو ابھی سے دیکھ رہا ہوں“۔ (۴)

اور پھر انہی دنوں ایک رات آپ ﷺ نصف شب کے قریب ”بقیع“ (۵) تشریف لے گئے، اور اہل بقیع (۶) کیلئے دعائے خیر فرمائی۔ (۷)

(۱) احمد [۲۱۵۴۷] (۲) گویا اس طرح رسول اللہ ﷺ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی دلجوئی فرمانا چاہتے تھے کہ اب اگرچہ انہیں کبھی آپؐ کی زیارت نصیب نہیں ہو سکی، لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں، کیونکہ ”اہل تقویٰ“ کا تو آپؐ کے ساتھ ہمیشہ ہی بہت قریبی تعلق رہے گا..... خواہ وہ کوئی بھی ہوں، اور جہاں کہیں بھی ہوں۔ (۳) بخاری [۶۴۲۶] کتاب الرقاق [۸۱] باب [۷] ما یُحدّث من زہرة الدنیا..... (۴) یعنی ”حوض کوثر“ (۵) یعنی مدینہ کا قبرستان (۶) یعنی بقیع میں مدفون مسلمانوں کیلئے.....

(۷) احمد عن ابی موسیٰ، مولیٰ للنبی ﷺ [۱۵۵۶۷]

مرض الموت:

سن گیارہ ہجری میں جب ماہِ صفر کے آخری دن چل رہے تھے، تب ۲۹/صفر بروز پیر رسول اللہ ﷺ کسی کی نماز جنازہ پڑھا کر بقیع سے جب واپس تشریف لارہے تھے، کہ اچانک راستے میں ہی آپ گودر دوسری تکلیف شروع ہوگئی، جو کہ دیکھتے ہی دیکھتے شدت اختیار کرگئی، اور پھر ساتھ ہی شدید بخار بھی ہو گیا، یہ تکلیف مسلسل تیرہ یا چودہ دن جاری رہی، بالآخر یہی تکلیف ”مرض الموت“ ثابت ہوئی۔

اور پھر ماہِ صفر کے اختتام کے بعد ماہِ ربیع الاول شروع ہوا..... آج سے تریسٹھ برس پہلے بھی ربیع الاول کا مہینہ آیا تھا..... جب نبی رحمت ﷺ کی ولادت باسعادت کی وجہ سے یہ تمام کائنات جھوم اٹھی تھی..... اس جہانِ رنگ و بو میں بہار کا جھونکا آیا تھا..... اور اب تریسٹھ برس بعد پھر وہی ربیع الاول ہی کا مہینہ آیا تھا..... لیکن اس بار یہ ربیع الاول ”مژدہ بہار“ نہیں..... بلکہ ”پیغام خزاں“ بن کر آیا تھا۔

اس دوران مرض مسلسل شدت اختیار کرتا گیا، اُن دنوں آپ ﷺ بکثرت ”مُعَوَذَتین“ (۱) پڑھتے اور اپنے ہاتھوں پر دم کر کے انہیں اپنے جسمِ اطہر پر پھیر لیتے، جب کمزوری بڑھ گئی تو ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یہی دونوں سورتیں پڑھ کر آپ کے دستِ مبارک پر دم کرتیں، اور پھر انہیں پکڑ کر آپ کے جسم پر پھیر دیا کرتیں۔

اس دوران شدتِ مرض اور نقاہت کے باوجود آپ اِبتک بدستور نماز کیلئے مسجد تشریف لے جاتے، اور خود نماز بھی پڑھاتے، البتہ مسجد میں وعظ و نصیحت وغیرہ کا کوئی سلسلہ اب جاری

(۱) ”مُعَوَذَتین“، یعنی سورہ ”قل اعوذ برب الفلق“ اور ”قل اعوذ برب الناس“

نہیں رہ سکا تھا۔

آخری چھ ایام، نیز آخری وصیتیں:

☆..... ۷/ربیع الاول بروز بدھ:

اس روز آپ ﷺ کو قدرے افاقہ محسوس ہوا اور طبیعت کچھ سنبھلی..... تو ظہر کے وقت آپ نماز سے کچھ قبل ہی مسجد تشریف لے گئے، اور بظاہر اُس موقع پر وہاں موجود اپنے صحابہ کرام کو خطاب کرتے ہوئے آپ نے قیامت تک آنے والے تمام مسلمانوں کیلئے یہ ارشاد فرمایا: ”لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْيَهُودِ وَالنَّصَارَى، اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ“ (۱) یعنی ”اللہ نے یہود و نصاریٰ پر لعنت فرمائی، کیونکہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا“

نیز اس موقع پر آپ ﷺ نے یہ ارشاد بھی فرمایا: ”لَا تَتَّخِذُوا قَبْرِی وَثَنًا یُعْبَدُ“ یعنی ”میرے بعد تم کسی بت کی مانند میری قبر کی پرستش میں نہ لگ جانا“ (۲)

یوں اپنی حیاتِ طیبہ کے آخری دنوں میں آپ ﷺ نے نہایت اہتمام کے ساتھ اپنی امت کو ہمیشہ کیلئے شرک اور قبر پرستی سے باز رہنے کی وصیت اور تاکید و تلقین فرمائی۔

اور پھر اسی موقع پر ہی آپ ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا: (مَنْ كُنْتُ جَلَدْتُ لَهُ ظَهْرًا فَهَذَا ظَهْرِي، فَلْيَسْتَقِدْ مِنْهُ، وَمَنْ كُنْتُ شَتَمْتُ لَهُ عَرْضًا فَهَذَا عَرْضِي، فَلْيَسْتَقِدْ مِنْهُ) (۳) یعنی ”جس کسی کو میں نے ناحق کبھی مارا پیٹا ہو تو یہ میری کمر حاضر

(۱) [بخاری ۴۴۴۳] کتاب المغازی [۶۴] باب [۸۳] مرض النبی ﷺ ووفاته۔

(۲) الریحق الملتوم ”قبل الوفاة بخمسة أيام“، صفحہ: ۴۶۵، بحوالہ: موطن امام مالک صفحہ: ۶۵۔

(۳) مجمع الزوائد للبیہقی، عن الفضل بن عباسؓ۔ حدیث: ۱۴۲۵۲، ج: ۹، باب فی وداعہ ﷺ۔

ہے، وہ آئے اور مجھ سے بدلہ چکا لے..... اگر میں نے کبھی کسی کو بے عزت کیا ہو تو وہ آئے اور مجھ سے اپنا انتقام لے لے۔“

اور پھر مزید یہ بھی فرمایا: ”جس کسی کا میرے ذمے کوئی حق ہو تو وہ آئے اور مجھ سے اپنا حق وصول کر لے۔“

رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے صحابہ کرام یہ تمام گفتگو سنتے رہے..... اور ہچکیاں لے لے کر روتے رہے.....

غور طلب بات ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی ﷺ کو تمام دنیائے انسانیت کیلئے ”رحمت“ بنا کر بھیجا تھا، آپ ﷺ کے تمام بنی نوع انسان پر بیشمار احسانات تھے، اور بالخصوص وہ لوگ جو کہ اُس وقت آپ کی اُس مجلس میں موجود تھے، جو اُس وقت آپ کے براہ راست مخاطب تھے، اُن پر تو آپ کے بہت ہی زیادہ احسانات تھے..... اور پھر یہ کہ آپ اللہ کے رسول تھے، بلکہ سید الانبیاء والمرسلین تھے، جبکہ وہ لوگ تو محض آپ کے اُمتی تھے..... لیکن اس کے باوجود..... آپ کا تواضع..... عجز و انکسار..... اور حسن اخلاق ملاحظہ ہو..... کہ آپ اُس موقع پر انہیں مخاطب کر کے یہ تمام باتیں ارشاد فرماتے رہے۔

اس کے بعد آپ ﷺ منبر سے نیچے تشریف لائے اور ظہر کی نماز پڑھائی، نماز سے فراغت کے بعد آپ دوبارہ منبر پر جلوہ افروز ہوئے، آپ کا اپنے منبر پر یہ آخری جلوہ تھا..... اور اب آپ نے انصارِ مدینہ کے حق میں چند وصیتیں فرمائیں، اور ان کے ساتھ ہمیشہ حسن سلوک اور ان کے اکرام و احترام کی بہت زیادہ تاکید فرمائی۔

اس کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا (إِنَّ عَبْدًا خَيْرَهُ اللَّهُ أَنْ يُؤْتِيَهُ مِنْ زَهْرَةِ الدُّنْيَا مَا شَاءَ، وَبَيْنَ مَا عِنْدَهُ، فَاخْتَارَ مَا عِنْدَهُ) یعنی ”اللہ کا ایک بندہ ہے،

جسے اللہ نے اس بات کا اختیار دیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو اللہ اسے دنیاوی زندگی کی خوب رونقیں عطا فرمائے، اور اگر وہ چاہے تو اب اللہ کے پاس موجود نعمتوں میں چلا آئے..... اور اس بندے نے اللہ کے پاس موجود نعمتوں کو پسند کر لیا ہے۔ (۱)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ”یہ بات سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رونے لگے..... اور یوں کہنے لگے (فَدَيْنَاكَ بِآبَائِنَا وَ أُمَّهَاتِنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ) یعنی ”اے اللہ کے رسول! آپ پر ہمارے ماں باپ قربان“۔

ابوبکر کی اس کیفیت پر ہمیں تعجب ہونے لگا..... اور یہ منظر دیکھ کر کچھ لوگ یوں کہنے لگے کہ ابوبکر کو دیکھو..... رسول اللہ ﷺ ہمیں یہ بات بتا رہے ہیں کہ ”اللہ کا ایک بندہ ہے جسے اللہ نے اس بات کا اختیار دیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو اللہ اسے دنیاوی زندگی کی خوب رونقیں عطا فرمائے..... اور اگر وہ چاہے تو اب اللہ کے پاس موجود نعمتوں میں چلا آئے..... اور اس بندے نے اللہ کے پاس موجود نعمتوں کو پسند کر لیا ہے“۔ اور ذرہ ابوبکر کو دیکھو..... رسول اللہ ﷺ کی یہ بات سن کر یہ رورہے ہیں..... اور کہتے ہیں کہ ”اے اللہ کے رسول! آپ پر ہمارے ماں باپ قربان.....“ بھلا یہ کیا بات ہوئی.....؟؟

اس کے بعد حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ (فَكَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ هُوَ الْمُخَيَّرُ، وَكَانَ أَبُو بَكْرٍ أَعْلَمَنَا) یعنی ”اللہ کی طرف سے اپنے جس بندے کو یہ اختیار دیا گیا تھا..... وہ خود رسول اللہ ﷺ تھے..... اور ابوبکر ہم سبھی سے زیادہ علم والے تھے“۔ (۲)

(۱) یعنی اس دنیا میں مزید زندگی بسر کرنے کی بجائے اللہ کے پاس چلے جانے کو پسند کر لیا ہے.....

(۲) متفق علیہ، مشکاة المصابیح [۵۹۵۷] کتاب الفضائل والشمال، باب ہجرة اصحابہ من مکة.....

مطلب یہ کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی جانب سے اختیار دیئے جانے پر جواب میں رسول اللہ ﷺ اس فانی دنیا میں اب مزید زندگی بسر کرنے کی بجائے اپنے رب کے جوار رحمت میں منتقل ہو جانے کو پسند فرما چکے تھے..... ہم اس بات کو نہیں سمجھ سکے..... البتہ ابو بکر (رضی اللہ عنہ) ہم میں سب سے زیادہ علم و دانش سے مالا مال تھے..... رسول اللہ ﷺ کی گفتگو کو اور اس میں پوشیدہ اسرار و رموز کو ہم سب سے زیادہ وہی سمجھنے والے تھے..... لہذا اس راز کی بات کو ہم نہیں سمجھ سکے، اور اس وجہ سے ہم تعجب کرنے لگے..... جبکہ ابو بکر اس راز کو سمجھ گئے..... اور تب وہ..... بے اختیار رونے لگے۔

☆..... ۸/ ربیع الاول بروز جمعرات:

اس روز یعنی رحلت سے چار روز قبل رسول اللہ ﷺ کی طبیعت مزید ناساز ہو گئی، اور مرض کی شدت بڑھ گئی، اس وقت آپؐ کے گھر میں متعدد افراد موجود تھے، جن میں سے بعض کا تعلق آپؐ کے اپنے اہل بیت سے تھا، جبکہ ان کے علاوہ بھی کبار صحابہ میں سے متعدد حضرات اس موقع پر وہاں موجود تھے، تب آپؐ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: هَلُمُّوا أَكْتُبْ لَكُمْ كِتَابًا لَّنْ تَصَلُّوا بَعْدَهُ یعنی ”لاؤ، میں تمہیں کچھ لکھوا دوں، تاکہ اس کے بعد تم گمراہی میں نہ پڑ سکو“۔

اس پر وہاں موجود افراد میں رسول اللہ ﷺ کی شدتِ مرض اور ناسازی طبع کو دیکھتے ہوئے اختلافِ رائے ہونے لگا، چنانچہ ان میں سے کچھ لوگ یہ اصرار کرنے لگے کہ ”جلدی کوئی سامانِ کتابت حاضر کیا جائے..... کیونکہ رسول اللہ ﷺ کوئی اہم وصیت لکھوانا چاہتے ہیں..... تاکہ ہم گمراہی سے محفوظ رہ سکیں“

جبکہ دیگر کچھ افراد یوں کہنے لگے کہ ”اس وقت رسول اللہ ﷺ پر شدتِ درد غالب ہے، اور

ہمارے پاس چونکہ اللہ کی کتاب (قرآن کریم) موجود ہے، لہذا وہ ہمارے لئے کافی ہے، ہمیں اس وقت رسول اللہ ﷺ کو کسی مشکل یا مشقت میں ڈالنے کی بجائے آپ کی راحت اور آرام کی فکر کرنی چاہئے۔“

یوں ان میں اختلاف رائے ہونے لگا، کوئی کچھ کہتا..... اور کوئی کچھ..... جب شور و شغب زیادہ بڑھنے لگا..... تو آخر رسول اللہ ﷺ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ”تم سب یہاں سے اٹھ جاؤ۔“

اور یوں وہ اہم بات نہیں لکھی جاسکی جو رسول اللہ ﷺ بالکل آخری ایام میں اپنی امت کیلئے لکھوانا چاہتے تھے۔ (۱)

رسول اللہ ﷺ شدت مرض اور ناسازی طبع کے باوجود اب تک نماز کیلئے بدستور مسجد تشریف لاتے، اور تمام نمازیں خود ہی پڑھاتے..... اور اُس روز بھی..... یعنی اپنی وفات سے محض چار روز قبل، بتاریخ ۸/ربیع الاول بروز جمعرات چار نمازیں، یعنی فجر، ظہر، عصر، اور مغرب کی نمازیں آپ ﷺ نے خود ہی پڑھائیں، البتہ یہ مغرب کی نماز آخری نماز تھی جو آپ ﷺ نے پڑھائی..... اس آخری نماز میں آپ نے اُس روز سورۃ ”المرسلات“ تلاوت فرمائی تھی (یعنی انیسویں س پارے [تبارک] کی آخری سورت)۔

(۱) اس واقعے کے حوالے سے متعدد اہل علم نے یہ اظہار خیال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ حکم غالباً ”علی الوجوب“ نہیں ہوگا، بلکہ محض احتیاطی تدبیر کے طور پر آپ کچھ لکھوانا چاہتے ہوں گے..... کیونکہ آپ کا یہ حکم اگر ”علی الوجوب“ ہوتا اور اس کی تعمیل واجب اور ضروری ہوتی تو آپ دوبارہ بھی یہی حکم دے سکتے تھے..... یا کم از کم یہ کہ آپ زبانی ہی وہ وصیت فرمادیتے..... لیکن آپ نے ایسا نہیں فرمایا..... آپ کا انتقال اس واقعے کے چار دن بعد ہوا، اور اس دوران آپ نے متعدد وصیتیں بھی فرمائیں اور مختلف ہدایات بھی دیں، لیکن اس بارے میں کچھ ارشاد نہیں فرمایا (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو ”السیرۃ النبویۃ الصحیحہ“، تالیف: دکتور اکرم ضیاء العمری صفحہ: ۵۵۳)۔

لیکن اس کے بعد جب عشاء کی نماز کا وقت آیا تو آپ ﷺ نے مسجد جانے کی غرض سے وضوء کرنا چاہا، مگر..... کمزوری اور نقاہت کی شدت کی وجہ سے آپ پر بے ہوشی طاری ہوگئی..... تین بار ایسا ہی ہوا..... جب آپ ﷺ وضوء کیلئے بیٹھتے تو بے ہوشی طاری ہو جاتی..... آخر آپ نے حکم دیا کہ ”مُرُوا أَبَابَكْرَ، فَلْيُصَلِّ بِالنَّاسِ“، یعنی ”ابوبکر سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں“

اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا چونکہ اپنے والد (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ) کے مزاج سے بخوبی واقف تھیں، لہذا اس موقع پر انہوں نے اپنے والد کے بارے میں عرض کیا کہ ”يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنَّهُ رَجُلٌ رَقِيقٌ، ضَعِيفُ الصَّوْتِ، كَثِيرُ الْبُكَاءِ إِذَا قَرَأَ الْقُرْآنَ“

یعنی ”اے اللہ کے رسول! وہ تو بہت ہی کمزور اور نرم دل انسان ہیں، ان کی آواز بھی کافی پست ہے..... مزید یہ کہ..... وہ جب بھی قرآن پڑھتے ہیں تو بہت زیادہ رونے لگتے ہیں۔“ (۱)

تب آپ نے اپنا وہی حکم دہرایا..... اور حضرت عائشہؓ نے بھی اپنی وہی گزارش دہرائی، آخر تیسری بار آپ نے قدرے سختی کے ساتھ یہی حکم دہرایا..... اور تب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ کی حیاتِ طیبہ کے دوران ہی..... اور خود آپ کے حکم پر..... آپ کی جگہ مسجد نبوی میں امامت کا آغاز کیا۔

(۱) یعنی میرے والد تو کمزور دل انسان ہیں، لہذا اے اللہ کے رسول..... وہ آپ کی جگہ کھڑے ہونے کی جرأت کس طرح کر سکیں گے؟ مزید یہ کہ ان کی آواز بھی پست ہے، لہذا جب مقتدیوں تک ان کی آواز ہی نہیں پہنچ سکے گی تو لوگ ان کی اقتداء میں کس طرح نماز پڑھیں گے؟ اور پھر یہ کہ قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے ان پر تو ہمیشہ بہت زیادہ گریہ طاری ہو جاتا ہے، لہذا وہ امامت کرتے ہوئے کس طرح قرآن پڑھ سکیں گے.....؟

☆.....۹/ربیع الاول بروز جمعہ:

اس روز بھی حسب معمول آپ ﷺ پر نقاہت اور کمزوری کا غلبہ رہا، اس روز جب آپ کی عیادت کی غرض سے متعدد افراد حاضر خدمت تھے، تب آپ نے ان سے مخاطب ہوتے ہوئے ارشاد فرمایا: (لَا يَمُوتَنَّ أَحَدُكُمْ إِلَّا وَهُوَ يُحْسِنُ الظَّنَّ بِاللَّهِ تَعَالَى) (۱) یعنی ”تم میں سے کسی کو موت نہ آئے مگر اس حالت میں کہ وہ اپنے رب کے بارے میں حسن ظن رکھتا ہو“ (۲)

☆.....۱۰/ربیع الاول بروز ہفتہ:

اس روز آپ ﷺ کو بوقتِ ظہر قدرے افاقہ محسوس ہوا تو آپ ایک طرف اپنے محترم چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور دوسری طرف اپنے چچا زاد اور داماد یعنی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے کندھوں کا سہارا لئے ہوئے مسجد تشریف لائے، اس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ امامت کر رہے تھے، انہوں نے جب آپ کے قدموں کی آہٹ محسوس کی تو نماز میں ہی اپنی جگہ سے پیچھے ہٹنے لگے، جس پر آپ نے اپنے دست مبارک سے انہیں پیچھے نہ ہٹنے کا اشارہ کیا..... پھر آپ حضرت ابوبکرؓ کی دائیں جانب بیٹھ کر نماز میں شامل ہو گئے، اور اب اس نماز کی کیفیت یہ ہوئی کہ حضرت ابوبکرؓ آپ کی اقتداء کرنے لگے، جبکہ تمام مقتدی حضرت ابوبکرؓ کی تکبیروں پر نماز ادا کرنے لگے۔

☆.....۱۱/ربیع الاول بروز اتوار:

اس روز یعنی اپنی رحلت سے محض ایک روز قبل آپ ﷺ نے حکم دیا کہ گھر میں جو بھی نقدی ہے وہ مساکین میں تقسیم کر دی جائے، چنانچہ تلاش کے بعد گھر میں کل پونجی سات دینار (۱) مسلم [۲۸۷۷] کتاب الفتن - (۲) یعنی بندہ مؤمن کو بوقتِ موت اپنے رب سے اچھی امید رکھنی چاہئے۔

نکلے، جو کہ اسی وقت مساکین میں تقسیم کر دیئے گئے..... اور اس شام جب اندھیرا چھانے لگا تو گھر میں چراغ جلانے کیلئے ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ایک پڑوسن سے تیل ادھار مانگنا پڑا۔

نیز اس وقت آپ ﷺ کی زرہ ایک یہودی کے پاس رہن رکھی ہوئی تھی..... کیونکہ کچھ عرصہ قبل آپ نے اس کے پاس اپنی وہ زرہ رہن رکھوا کر اس سے گھر میں پکانے کیلئے کچھ جو کے دانے حاصل کئے تھے۔

☆.....۱۲/ربیع الاول بروز پیر (آخری دن):

اُس روز علی الصبح جب نماز فجر کا وقت ہوا، نمازی مسجد نبوی میں جمع ہوئے اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نماز کی ادائیگی میں مشغول ہو گئے..... رسول اللہ ﷺ کا حجرہ مبارک تو مسجد سے متصل ہی تھا، درمیان میں محض ایک پردہ پڑا ہوا تھا، آپ نے پردہ اٹھا کر دیکھا، اپنے صحابہ کو یوں انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ نماز میں مشغول و منہمک پایا..... کچھ دیر اسی طرح آپ اسی منظر میں کھوئے رہے..... اپنے صحابہ کو یوں نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے رہے، اور پھر اس منظر کی وجہ سے آپ فراطمست سے مسکرا دیئے..... رُخ انور پر بشارت پھیل گئی..... اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی.....

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جو کہ نماز پڑھا رہے تھے، انہیں کچھ اندازہ ہوا کہ شاید آپ ﷺ نماز کیلئے تشریف لانا چاہتے ہیں، یہ سوچ کر وہ نماز میں ہی اپنی جگہ سے کچھ پیچھے کی جانب سرکنے لگے، جس پر آپ نے اشارے سے انہیں منع فرمایا۔

آپ ﷺ کے جاں نثار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، جو اُس وقت نماز میں مشغول تھے، اُس موقع پر آپ کیلئے شوق دیدار اور بیتابی کی وجہ سے ان کا یہ حال ہوا کہ..... گویا وہ

سب ابھی نماز میں ہی آپ کی طرف متوجہ ہو جائیں گے..... آپ کے خادم خاص حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس وقت میری نظر جب اچانک آپ کے چہرہ مبارک پر پڑی تو مجھے آپ کا چہرہ بالکل ”قرآن کے ورق“ کی طرح محسوس ہوا..... (۱) اور پھر تھوڑی دیر بعد آپ نے پردہ گرا دیا..... اور یہ نماز بھی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مکمل فرمائی۔

اس کے بعد ”نہی رحمت ﷺ“ پر کسی اور نماز کا وقت ہی نہیں آیا.....

اور پھر جب صبح کی روشنی پھیلنے لگی، سورج قدرے بلند ہو گیا، تو آپ نے اپنی پیاری بیٹی حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کو بلایا اور ان کے کان میں کچھ سرگوشی فرمائی..... جس پر وہ رونے لگیں..... اور پھر جلد ہی ان کے کان میں دوبارہ کچھ سرگوشی فرمائی..... تب وہ مسکرانے لگیں..... (۲)

نیز اسی موقع پر آپ ﷺ نے اپنی پیاری بیٹی حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کو ”سیدۃ نساء العالمین“ ہونے کی بشارت بھی دی۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے اپنے کمسن نواسوں حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو بلوایا، دونوں کو پیار سے چوما، اور وہاں موجود سبھی افراد کو ان کے ساتھ ہمیشہ احترام سے پیش آنے کی

(۱) یعنی ”قرآن کے ورق“ میں بیک وقت حسن و جمال، تقدس اور پاکیزگی..... یہ تمام خوبیاں یکجا ہوا کرتی ہیں..... یہی کیفیت انہیں اس موقع پر رسول اللہ ﷺ کے رُخ انور میں محسوس ہوئی۔

(۲) بعد میں کسی موقع پر جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے اس بارے میں دریافت کیا گیا تھا تو انہوں نے یہ جواب دیا تھا کہ میرے والد نے پہلے مجھے اس راز سے مطلع کیا کہ ”اب اسی تکلیف کے دوران ہی میری روح قبض کر لی جائیگی“ جس پر میں رو دی..... اور پھر کچھ دیر بعد مجھے مطلع کیا کہ ”اہل بیت میں سے سب سے پہلے میں اپنے والد سے جا ملوں گی.....“ جس پر میں مسکرا دی۔

وصیت فرمائی۔

اور اس کے بعد آپ ﷺ نے اپنی ازواجِ مطہرات کو بلوایا اور انہیں چند نصیحتیں فرمائیں، اسی دوران آپ کی طبیعت زیادہ ناساز ہونے لگی..... اور تب اسی کیفیت اور شدید نقاہت و کمزوری کی حالت میں اپنی امت کو یہ آخری وصیت فرمائی ”الصَّلَاةُ، الصَّلَاةُ..... وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ“، یعنی ”نماز کی پابندی کرتے رہنا..... اور وہ لوگ جو تمہارے ماتحت ہیں، ان کے ساتھ ہمیشہ حسن سلوک سے پیش آنا“ (۱) یہ الفاظ آپ ﷺ نے متعدد بار دہرائے۔

اسی دوران نوجوان اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما اندر داخل ہوئے، جنہیں دیکھ کر آپ ﷺ نے دونوں ہاتھ فضاء میں بلند کئے..... یہ منظر دیکھ کر وہاں موجود افراد سمجھ گئے کہ آپ حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کیلئے کامیابی کی دعا فرما رہے ہیں۔ (۲)

انہی آخری لمحات میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بیٹے اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بھائی عبدالرحمنؓ وہاں آئے، ان کے ہاتھ میں تازہ مسواک تھی، آپ مسواک کی جانب بغور دیکھنے لگے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا چونکہ مزاج شناس (۱) ”ماتحت“ میں انسان کیلئے اس کے اہل و عیال، خادم اور اس کے ماتحت افراد..... وغیرہ..... سبھی شامل ہیں، یعنی سبھی کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت فرمائی۔

(۲) رسول اللہ ﷺ نے آخری ایام میں سلطنتِ روم کے خلاف کارروائی کی غرض سے ایک لشکر کی روانگی کا حکم صادر فرمایا تھا، اس لشکر کا سپہ سالار آپ نے حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو مقرر فرمایا تھا جو کہ اُس وقت بالکل نوجوان تھے، آپ کی ناسازی طبع کی وجہ سے یہ لشکر مدینہ سے کچھ فاصلے پر پہنچ کر رک گیا تھا، حضرت اُسامہ واپس مدینہ پہنچے تھے تاکہ خود آپ کی طبیعت کے بارے میں صورتِ حال سے آگاہی ہو سکے..... اس موقع پر یہ صورتِ حال پیش آئی تھی جو اوپر بیان کی گئی، یعنی کمزوری اور شدتِ مرض کی وجہ سے چونکہ آپ کیلئے گفتگو کرنا دشوار تھا..... لہذا اس موقع پر آپ نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اشارے سے حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کو دعائے خیر دی۔

تھیں، لہذا سمجھ گئیں آپ مسواک کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ انہوں نے آپ سے اس بارے میں استفسار کیا، جس پر آپ ﷺ نے اثبات میں سر ہلایا..... تو انہوں نے اپنے بھائی سے وہ مسواک لے کر آپ کی خدمت میں پیش کی، لیکن نقاہت کی وجہ سے وہ آپ سے چبائی نہیں جا رہی تھی، اس پر حضرت عائشہؓ نے عرض کیا کہ ”اگر ارشاد ہو تو میں نرم کر دوں؟“ آپ نے سر کے اشارے سے ”ہاں“ فرمایا، تو آپ سے مسواک لے کر حضرت عائشہؓ نے اسے دانتوں سے چبا کر خوب نرم کر کے دوبارہ آپ کی خدمت میں پیش کی..... اور تب آپ نے ان سے وہ مسواک لے لی اور خوب اچھی طرح اپنے دانتوں پر پھیری..... اُس وقت پانی کا ایک پیالہ قریب ہی رکھا ہوا تھا، آپ بار بار اس میں اپنا ہاتھ ڈبو تے اور چہرہ مبارک پر پھیر لیتے۔

اسی دوران آپ ﷺ نے یہ الفاظ کہے ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ إِنَّ لِمَوْتٍ سَكَرَاتٍ“ یعنی اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں..... بیشک..... موت کی یہ سختی ہوا ہی کرتی ہے۔“ اور اس کے ساتھ ہی آپ پر نزع کی کیفیت طاری ہو گئی..... آپ نے اپنا دست مبارک بلند فرماتے ہوئے انگشت شہادت سے آسمان کی طرف اشارہ فرمایا..... نگاہیں اوپر کی جانب جم گئیں..... ہونٹوں میں خفیف سی جنبش ہونے لگی..... ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کان لگا کر سنا تو اُس وقت آپ کی زبان مبارک پر یہ آخری کلمات تھے ”مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ، اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي وَارْحَمْنِي“ یعنی ”ان لوگوں کے ساتھ جن پر اللہ نے اپنا انعام فرمایا، انبیاء صدیقین، شہداء اور صالحین..... اے اللہ! مجھے بخش دے اور مجھ پر رحم فرما“

اور پھر آخر میں تین بار فرمایا ”وَالْحَقُّنِي بِالرَّفِيقِ الْأَعْلَى، اللَّهُمَّ الرَّفِيقُ الْأَعْلَى“

یعنی ”اور مجھے اوپر والے ساتھی کے ساتھ ملا دے..... اے اللہ! اے اوپر والے ساتھی۔“
اور ان آخری الفاظ کے ساتھ ہی آپ ﷺ کا اٹھا ہوا ہاتھ گر گیا..... اور..... جسمِ اطہر سے
روح مبارک پرواز کر گئی.....

اور یوں وہ بولتا ہوا قرآن، نور ہدایت کا پیکر، مکمل نمونہ حیات، خیر البشر، رحمۃ للعالمین،
دشمنوں کا خیر خواہ، مظلوموں کا غمخوار، اور انسانیت کا محسن اعظم، یعنی رسول اکرم ﷺ، تیس
سال کے عرصے میں اللہ کے بندوں تک اللہ کا دین مکمل پہنچا دینے کے بعد، ہجری کیلنڈر
کے مطابق تریسٹھ برس کی عمر میں، ۱۲/ ربیع الاول سن ۱۱ ہجری، بروز پیر، بوقتِ چاشت اپنے
رب سے جا ملے۔ (۱)

اِنَّ اللّٰهَ وَاَنَا اِلٰهٌ رَّاجِعُونَ..... کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَاَن وِیْتَقِیْ وَجْهَ رَبِّکَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ..... اَللّٰهُمَّ صَلِّ
وَسَلِّمْ وَبَارِکْ عَلٰی عَبْدِکَ وَرَسُولِکَ مُحَمَّدٍ، عَلٰی آلِهِ وَاصْحَابِهِ اَجْمَعِیْنَ، بِرَحْمَتِکَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ۔



(۱) خط کشیدہ عبارت فقیر سید وحید الدین کی کتاب ”محسن اعظم“ سے مأخوذ ہے، جو کہ میں نے بچپن میں ۱۹۶۵ء
میں پڑھی تھی..... اور یہ الفاظ اس وقت سے ہی میرے ذہن میں نقش ہیں۔

سوگوار فضاء:

اشرف الانبیاء والمرسلین، سید الاولین والآخرین، رسول اکرم ﷺ کی رحلت اور اس جہانِ فانی سے رخصتی کا یہ سانحہ یقیناً آپ کے افرادِ خانہ اور اہل بیت کیلئے، نیز تمام مسلمانوں کیلئے بہت ہی بڑا صدمہ تھا، جیسا کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مَا رَأَيْتُ يَوْمًا قَطُّ كَانَ أَحْسَنَ وَلَا أَضْوَأَ مِنْ يَوْمٍ دَخَلَ عَلَيْنَا فِيهِ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَمَا رَأَيْتُ يَوْمًا أَقْبَحَ وَلَا أَظْلَمَ مِنْ يَوْمٍ مَاتَ فِيهِ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ (۱) یعنی ”میں نے مدینہ شہر میں کبھی کوئی ایسا خوشگوار اور روشن دن نہیں دیکھا کہ جیسا رسول اللہ ﷺ کی مدینہ تشریف آوری کے موقع پر تھا..... اسی طرح میں نے مدینہ شہر میں کبھی کوئی ایسا سوگوار اور بجھا بجھا ساد دن نہیں دیکھا کہ جیسا رسول اللہ ﷺ کی وفات کے موقع پر تھا۔“

چنانچہ اُس روز تمام مدینہ شہر میں ہر جانب رنج و الم کی فضاء چھائی ہوئی تھی..... ہر کوئی غم کے سمندر میں ڈوبا جا رہا تھا..... یہ افسوسناک خبر سنتے ہی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بڑی تعداد میں مسجد میں اور قرب و جوار کے علاقے میں جمع ہونے لگے..... ہر طرف آہ و بکا کا ماحول تھا۔

حتیٰ کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جیسا انتہائی جرأت مند، بہادر، باہمت اور مدبر انسان (جسے دنیا ”فاروقِ اعظم“ کے لقب سے یاد کرتی ہے) شدتِ غم کی وجہ سے ہوش و حواس کھو بیٹھا، انہیں کسی صورت یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ اب ہمیشہ کیلئے ہم سے جدا ہو چکے ہیں..... چنانچہ وہ وہاں موجود مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے باوازا بلند

(۱) مشکاة المصابیح [۵۹۶۲] کتاب الفضائل والشمال، باب ہجرة اصحاب من مکة ووفاته.....

یوں کہنے لگے ”کوئی ہرگز یوں نہ کہے کہ رسول اللہ ﷺ وفات پا چکے ہیں..... کیونکہ رسول اللہ ﷺ تو اللہ کے پاس گئے ہیں..... جس طرح موسیٰ علیہ السلام چالیس روز کیلئے کوہ طور پر اللہ کے پاس گئے تھے..... تو رات لینے کیلئے..... اور پھر واپس آ گئے تھے..... اسی طرح رسول اللہ ﷺ کو بھی اللہ نے اپنے پاس بلا یا ہے..... اور یہ کہ آپ بھی چالیس روز کے بعد واپس تشریف لائیں گے..... اور آج جو لوگ یوں کہہ رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہو چکا ہے..... وہ یاد رکھیں کہ آپ جب اپنے اللہ کے پاس سے واپس تشریف لائیں گے، تب خود اپنے ہاتھ سے ان لوگوں کی گردن اڑا دیں گے۔“ (۱)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا گھر مسجد نبوی سے کچھ دور تھا (۲) اُس روز نماز فجر کے وقت چونکہ رسول اللہ ﷺ کی طبیعت میں قدرے بہتری اور افاقے کے آثار نمایاں تھے..... لہذا حضرت ابو بکرؓ فجر کی نماز پڑھانے کے بعد اپنے گھر چلے گئے تھے، لیکن کچھ وقت گزرنے کے بعد جب انہیں رسول اللہ ﷺ کے انتقال کی جان لیوا خبر موصول ہوئی تو وہ واپس تشریف لائے، مسجد کے اندر بھی اور آس پاس بھی انتہائی سوگوار ماحول میں مسلمانوں کا ایک جمع غفیر نظر آیا..... نیز انہوں نے یہ منظر بھی دیکھا کہ اس مجمع کے درمیان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے باوازی بلند کیسی عجیب و غریب باتیں کر رہے ہیں..... کچھ دیروہ ان کے قریب کھڑے رہے، ان کی باتیں سنتے رہے، اور سمجھ گئے کہ شدت غم کی وجہ سے یہ ہوش و حواس گنوا بیٹھے ہیں..... لہذا انہوں نے حضرت عمرؓ سے کوئی بات نہیں کی، نہ ہی کسی اور سے کوئی بات کی، بلکہ اس مجمع میں کچھ دیر توقف کے بعد فوری طور پر رسول اللہ

(۱) السیرۃ النبویہ لابن ہشام/ رقم النص: ۲۰۹۵/ صفحہ: ۳۶۳/ جلد: ۴۔

(۲) ”سُح“ کے مقام پر، جسے آجکل ”عوالی“ کہا جاتا ہے۔

ﷺ کے گھر پہنچے، جو کہ ان کی صاحبزادی ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا گھر بھی تھا، گھر میں داخل ہونے کے بعد اپنی بیٹی سے مختصر گفتگو کی، جو دل گداز اور جان لیوا خبر سنی تھی..... اس کی تصدیق چاہی..... اور پھر یقین ہو جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کے جسد اطہر کی طرف متوجہ ہوئے..... رُخِ انور سے کپڑا اٹھایا..... جبینِ اقدس پر بوسہ دیا..... کچھ آنسو بہائے..... اور پھر کچھ دیر اسی طرح کھڑے دیکھتے رہے..... اس کے بعد ہونٹوں میں لرزش ہوئی..... اور لرزتی ہوئی آواز میں یہ الفاظ کہے ”بِأَبِي أَنْتَ وَ أُمِّي يَا رَسُولَ اللَّهِ.....“، یعنی ”اے اللہ کے رسول..... آپ پر میرے ماں باپ قربان.....“ اور پھر وہاں سے چل دیئے.....

اس کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ باہر تشریف لائے، اور مسجد میں پہنچے، لوگوں کا وہی جمع غیر اسی طرح موجود تھا، کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسی طرح مجمع کے درمیان کھڑے ہوئے بے خودی کی کیفیت میں اپنی وہی باتیں مسلسل دہرا رہے تھے.....

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب یہ صورتِ حال دیکھی، اور حضرت عمرؓ کی یہ باتیں سنیں تو سمجھ گئے کہ یہ تو ہوش کھو بیٹھے ہیں..... اس پر انہوں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ ”اے عمر..... آپ بیٹھ جائیے.....“ لیکن حضرت عمرؓ شدتِ غم کی وجہ سے اس قدر مغلوبِ الحال ہو چکے تھے کہ بیٹھنے سے انکار کر دیا.....

اسی دوران اب یہ صورتِ حال ہوئی کہ لوگوں نے جب حضرت ابو بکرؓ کو دیکھا تو سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے..... اور ان کے گرد جمع ہونے لگے..... تب انہیں مخاطب کرتے ہوئے حضرت ابو بکرؓ نے مختصر خطبہ دیا، جس میں رسول اللہ ﷺ کی اس جہان فانی سے رخصتی کا یوں

اعلان فرمایا ”مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَإِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ ، وَمَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللَّهَ فَإِنَّ اللَّهَ حَيٌّ لَا يَمُوتُ“ یعنی ”تم میں سے جو کوئی محمد کی عبادت کرتا تھا وہ جان لے کہ محمد کا اب انتقال ہو چکا ہے..... اور جو کوئی اللہ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے“ اسے کبھی موت آنے والی نہیں ہے.....“ (۱) اور پھر قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کی: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَلَا يَتَذَكَّرُ أَمْ يَكْفُرُ بِاللَّهِ أَمْ يَكْفُرُ بِاللَّهِ أَمْ يَكْفُرُ بِاللَّهِ﴾ (۲)

ترجمہ: ”محمد ﷺ تو صرف رسول ہی ہیں، ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں، کیا اگر ان کا انتقال ہو جائے یا وہ شہید ہو جائیں، تو تم اسلام سے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے؟ اور جو کوئی پھر جائے اپنی ایڑیوں پر تو ہرگز وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا، عنقریب اللہ شکر گزاروں کو نیک بدلہ دے گا“

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس آیت سے، نیز اس کے مضمون سے خوب واقف تھے، اور عرصہ دراز سے اسے پڑھتے اور سنتے چلے آ رہے تھے..... لیکن اس روز حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زبانی جب یہ آیت سنی تو انہیں یوں محسوس ہوا کہ گویا یہ آیت ابھی نازل ہوئی ہو..... ان کے ذہنوں میں اس آیت کا مضمون تازہ ہو گیا..... وہ سب اس آیت کو بار بار دہرانے لگے..... جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اُس وقت وہاں جس شخص کی طرف بھی میری نگاہ اٹھی مجھے اس کے لب ہلتے ہوئے نظر آئے..... اور وہ یہی آیت زیر لب دہراتا ہوا نظر آیا..... اور تب رفتہ رفتہ انہیں

(۱) صحیح بخاری [۳۶۱۸] کتاب [۶۲] فضائل الصحابہ، باب [۵] لو كنت منذ اخليا..... (۲) آل عمران [۱۴۴]

اس تلخ ترین حقیقت پر یقین آنے لگا کہ رسول اللہ ﷺ واقعی اب ہم میں نہیں رہے.....
 حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زبانی یہ آیت دیگر صحابہ کرام کی طرح حضرت عمر رضی
 اللہ عنہ نے بھی سنی..... تو انہیں بھی اب یقین آنے لگا کہ واقعی رسول اللہ ﷺ اب ہم میں
 نہیں رہے..... اور تب صدمے نے دوسری شکل اختیار کر لی..... جب تک یقین نہیں آیا تھا
 اُس وقت تک بے خودی کی کیفیت طاری تھی..... لیکن جب یقین آ گیا تو صدمے کی شدت
 کی وجہ سے ایسا لرزہ طاری ہوا کہ ٹانگوں میں جسم کا بوجھ اٹھانے کی سکت باقی نہیں رہی.....
 جیسا کہ بعد میں انہوں نے خود اپنی یہ کیفیت بیان کرتے ہوئے بتایا کہ ”ابو بکر کی زبانی یہ
 آیت سننے کے بعد مجھے یقین آ گیا کہ رسول اللہ ﷺ وفات پا چکے ہیں..... مگر ساتھ ہی
 صدمے کی وجہ سے میرا یہ حال ہو گیا کہ میری ٹانگیں میرا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہو گئیں.....
 اور میں بے اختیار اسی جگہ گر گیا.....“ (۱)

تجہیز و تکفین:

اشرف الانبیاء والمرسلین، سید الاولین والآخرین، رسول اکرم ﷺ کی رحلت اور اس جہانِ
 فانی سے رخصتی کے بعد تجہیز و تکفین کا عمل فوری طور پر شروع نہیں کیا جاسکا..... یہ سانحہ پیر کی
 صبح پیش آیا تھا، جبکہ تجہیز و تکفین کا عمل دوسرے روز یعنی منگل کے دن شروع کیا گیا..... اس
 تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ یہ سانحہ آپ ﷺ کے افرادِ خانہ و اہل بیت، نیز دیگر تمام مسلمانوں کیلئے
 اتنے بڑے صدمے کا باعث تھا کہ ہوش و حواس بحال نہیں تھے، کسی میں کوئی سکت ہی باقی
 نہیں رہی تھی..... مدینے کی گلیوں میں ہر طرف کھرام مچا ہوا تھا..... ہر کوئی انتہائی افسردہ
 و غمزدہ تھا..... صدمے اور غم و اندوہ کی اس کیفیت سے نکلنے میں کچھ وقت لگا.....

نیز اس موقع پر ایک اور انتہائی نازک معاملہ یہ درپیش تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے سانحہ ارتحال کے بعد اب آپ کا جانشین کون ہوگا.....؟ کبار صحابہ کا اصرار یہ تھا کہ یہ نازک ترین معاملہ رسول اللہ ﷺ کی تجہیز و تکفین سے قبل طے پا جانا ضروری ہے..... تاکہ منافقین یا دیگر موقع پرست اور سازشی عناصر کو اس نازک صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہ مل سکے.....

چنانچہ تجہیز و تکفین سے متعلق انتظامات کے سلسلے میں ہی جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ و دیگر چند کبار صحابہ رسول اللہ ﷺ کے گھر میں ہی موجود تھے کہ اسی دوران انہیں یہ اطلاع ملی کہ ”سقیفہ بنی ساعدہ“ نامی مقام پر بڑی تعداد میں لوگ جمع ہیں اور ان کا موضوع گفتگو یہی ہے کہ اب رسول اللہ ﷺ کا جانشین کون ہوگا.....؟

یہ اطلاع ملنے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے اصرار کرتے ہوئے کہا کہ ”قبل اس کے کہ معاملہ نازک ہو جائے..... ہمیں وہاں چلنا چاہئے.....“

چنانچہ یہ حضرات وہاں پہنچے، وہاں یہی موضوع زیر بحث تھا، اور کسی بھی لمحے یہ معاملہ کوئی غلط رخ اختیار کر سکتا تھا، صورتِ حال کی اس نزاکت کو بھانپتے ہوئے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے اس نازک موقع پر ”فتنہ و افتراق“ سے بچنے اور اتفاق و اتحاد کو بہر صورت قائم رکھنے کی اہمیت و ضرورت کے بارے میں مختصر گفتگو کی، اس کے بعد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، نیز حضرت ابو عبیدہ عامر بن الجراح رضی اللہ عنہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ”یقیناً یہی دو حضرات رسول اللہ ﷺ کی جانشینی کے قابل ہیں، لہذا میرا مشورہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک کے ہاتھ پر جلد از جلد بیعت کر لی جائے۔“

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی یہ بات سُن کر حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”ہم میں سے کس کا دل اس بات کو گوارا کرے گا کہ وہ شخص جسے خود رسول اللہ ﷺ نے ہماری امامت کیلئے منتخب فرمایا تھا، اس کے ہوتے ہوئے کسی اور کو اس منصب کیلئے پسند کیا جائے.....؟“

حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی زبانی یہ بات سنتے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اصرار کیا ”ابوبکر، اپنا ہاتھ بڑھائیے“ جس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کی جانب اپنا ہاتھ بڑھایا، اور تب فوراً ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہاں موجود لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے باوازا بلند یہ الفاظ کہے ”لوگو! میں ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کر رہا ہوں..... تم سب بھی انہی کے ہاتھ پر بیعت کر لو..... یہی رسول اللہ ﷺ کے جانشین ہیں.....“

اس پر وہاں موجود سبھی افراد نے بڑی تعداد میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی، کبار صحابہ کرام میں سے چند افراد اس وقت وہاں موجود نہیں تھے، جنہوں نے بعد میں مسجد نبوی میں بیعت کی.....

یوں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بالاتفاق رسول اللہ ﷺ کے جانشین اور ”خليفة“ اول“ کی حیثیت سے منتخب کر لیا گیا۔

البتہ یہ اہم ترین معاملہ نیز دیگر کچھ نازک معاملات کو طے کرنے میں اُس دن کا کافی حصہ گزر گیا..... اور شام کا اندھیرا پھیلنے لگا..... لہذا رسول اللہ ﷺ کے جسد اطہر کی تجہیز و تکفین کے معاملے کو دوسرے روز یعنی منگل تک ملتوی کر دیا گیا۔

اس کے بعد دوسرے دن بروز منگل تجہیز و تکفین کا سلسلہ شروع ہوا، آپ ﷺ کو کپڑوں سمیت غسل دیا گیا، اس موقع پر فضل بن عباس اور اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہم پردہ آگے کئے

کھڑے رہے، جبکہ حضرت عباس بن عبدالمطلب، حضرت علی بن ابی طالب، اور انصارِ مدینہ میں سے اُس بن خولی (رضی اللہ عنہم اجمعین) نے جسدِ اطہر کو غسل دیا..... جس کے بعد آپ ﷺ کو تین سفید سوتی کپڑے کی چادروں میں کفن دیا گیا۔

”تجہیز و تکفین“ کے اس مرحلے سے فراغت کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوا کہ ”تدفین“ کس مقام پر کی جائے.....؟ اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ”لَنْ يُقْبَرَ نَبِيٌّ إِلَّا حَيْثُ يَمُوتُ“، یعنی ”ہر نبی کو اسی جگہ دفن کیا جاتا ہے جہاں اس کی وفات ہوئی ہو“ (۱)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زبانی یہ ارشاد نبوی سننے کے بعد طے پایا کہ آپ ﷺ کے بستر وفات کے مقام پر ہی قبر تیار کی جائے (جو کہ دراصل ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ تھا) (۲)

تجہیز و تکفین اور پھر مقامِ تدفین کی تعیین کے بعد جب جنازہ اسی جگہ (یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں) رکھا ہوا تھا..... تب نمازِ جنازہ کا آغاز ہوا، پہلے آپ ﷺ کے افرادِ خانہ اور اہلِ خاندان نے، اور پھر دیگر مہاجرین و انصار، مردوں اور عورتوں نے نمازِ جنازہ ادا کی۔

آپ ﷺ کی نمازِ جنازہ کے موقع پر کوئی امام نہیں تھا، حجرے کی تنگ دامانی کی وجہ سے دس

(۱) مسند امام احمد [۳۵/۱]

(۲) قبر مبارک کی کھدائی کا کام حضرت ابوطالب انصاری رضی اللہ عنہ نے انجام دیا، جو کہ مسجدِ نبوی سے متصل (اب مسجدِ نبوی کے اندر بابِ فہد سے متصل) ”بیرحاء“ نامی اپنے کنوئیں اور باغ کی وجہ سے، اور پھر اس بارے میں نازل ہونے والی آیت ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ.....﴾ (آل عمران: ۹۲) کے حوالے سے معروف ہیں..... جبکہ خود ان کی اپنی قبر میں ترکی کے قریب بحر احمر میں کسی گننام جزیرے میں واقع ہے۔

دس اشخاص اندر جاتے..... اور نماز پڑھ کر نکل آتے..... یہ سلسلہ لگاتار جاری رہا..... اس لئے تدفین منگل اور بدھ کی درمیانی شب، یعنی وفات کے تقریباً بتیس گھنٹے بعد عمل میں آئی۔

آپ ﷺ کے جسم اطہر کو حضرت علی بن ابی طالب، حضرت عباس بن عبدالمطلب، اور ان کے بیٹوں یعنی فضل بن عباس اور قثم بن عباس، نیز آپ ﷺ کے ایک آزاد کردہ غلام ”شقران“ (رضی اللہ عنہم اجمعین) نے مل کر قبر شریف میں اتارا۔ (۱)

اللہم صل وسلم وبارک علی عبدک ورسولک محمد، وعلی آلہ واصحابہ اجمعین
برحمتک یا ارحم الراحمین۔



(۱) السيرة النبوية لابن هشام، ۴/۴۱۸۔

الحمد للہ آج بتاریخ ۷/ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ، مطابق ۸/ جنوری ۲۰۱۴ء بروز بدھ یہ باب مکمل ہوا۔
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ، وَتَبَّ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

اصل مقصود: اتباع رسول ﷺ:

الحمد للہ گذشتہ صفحات میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارکہ اور حیات طیبہ کے بارے میں مختصر تذکرے کی ہمیں سعادت نصیب ہوئی اور یوں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے خاص فضل و کرم اور توفیق کی بدولت ہم اس قابل ہو سکے کہ اللہ کے حبیب ﷺ کے مبارک تذکرے کے ذریعے اپنے دلوں کو منور کر سکیں۔

البتہ اس موقع پر یہ اہم ترین تنبیہ ضروری ہے کہ جب بھی رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارکہ کا کہیں تذکرہ سنا جائے..... یا اس بارے میں کسی کتاب کا مطالعہ کیا جائے..... تو یہ بات ضرور ذہن نشین رکھی جائے کہ اس سے اصل مقصود آپ ﷺ کی پاکیزہ تعلیمات کا ”اتباع“ ہے..... کیونکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے دنیائے انسانیت کیلئے آپ ﷺ کی بعثت کا اصل مقصد یہی تھا۔

☆..... نیز اس موقع پر یہ بات سمجھنا بھی ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے محسن ہیں، تمام دنیائے انسانیت پر آپ کے بیشمار احسانات ہیں، اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے آپ کو دنیا و مافیہا کیلئے ”رحمت“ بنا کر بھیجا گیا، حتیٰ کہ آپ کا وجود مسعود تو آپ کے بدترین مخالفین اور دشمنوں کیلئے بھی باعثِ رحمت تھا..... مشرکین مکہ ہمیشہ آپ کا مذاق اڑایا کرتے..... طنز کیا کرتے..... اور تمسخر و استہزاء کے طور پر یوں کہا کرتے کہ ”آپ جس عذاب کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں..... اور ہمیں اللہ کے جس عذاب سے آپ ہمیشہ ڈراتے ہیں..... کہاں ہے وہ عذاب.....؟ لائیے وہ عذاب..... اللہ سے کہئے کہ ہم پر آسمان سے

پتھر برسائے..... یا ہمیں کسی بڑے عذاب میں مبتلا کر کے دکھائے۔

مشرکین مکہ کی اسی بیہودہ گوئی کا قرآن کریم میں یوں تذکرہ کیا گیا ہے: ﴿وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حَجَارَةً مِنَ السَّمَاءِ أَوْ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ (۱) ترجمہ: (اور جب ان لوگوں نے کہا کہ اے اللہ! اگر یہ قرآن تیری طرف سے واقعی ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا، یا ہم پر کوئی دردناک عذاب واقع کر دے)

اس پر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے اپنے حبیب ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے یہ ارشاد ہوا: ﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ.....﴾ (۲) ترجمہ: (اور اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کرے گا کہ ان میں آپ کے ہوتے ہوئے انہیں عذاب دے.....)

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ کا وجود مسعود تمام بنی نوع انسان کیلئے، حتیٰ کہ بدترین دشمنوں، مخالفوں، بدخواہوں اور تمسخر و استہزاء کرنے والوں کیلئے بھی باعثِ رحمت تھا..... اسی حقیقت کا قرآن کریم میں ان الفاظ میں تذکرہ کیا گیا ہے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ (۳) یعنی ”[اے نبیؐ] ہم نے آپ کو تمام دنیا والوں کیلئے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے“

اور پھر بالخصوص اپنی امت کیلئے آپ ﷺ کے قلبِ مبارک میں خیر خواہی و ہمدردی کے جو جذبات تھے..... اپنی امت کی صلاح و فلاح کی خاطر آپؐ جس طرح ہمیشہ فکر مند اور کوشاں رہا کرتے تھے..... اور امت کی رہبری و رہنمائی کی خاطر آپؐ جس طرح ہمیشہ مشغول و منہمک رہا کرتے تھے..... اسی حقیقت کی طرف اشارے کے طور پر قرآن کریم

میں یوں ارشادِ ربانی ہوا: ﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ (۱) ترجمہ: (تمہارے پاس ایک ایسے رسول تشریف لائے ہیں جو تمہاری ہی جنس میں سے ہیں، جنہیں تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گذرتی ہے جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہشمند رہتے ہیں، ایمان والوں کے ساتھ بڑے ہی شفیق اور مہربان ہیں)

یقیناً اس سے یہی حقیقت خوب واضح و ثابت ہو جاتی ہے کہ تمام دنیائے انسانیت پر عموماً..... جبکہ اپنی امت پر خصوصاً..... آپ کے بہت زیادہ احسانات ہیں۔

اسی طرح آپ ﷺ کا ارشاد ہے: (إِنَّمَا مَثَلِي وَمَثَلُ النَّاسِ كَمَثَلِ رَجُلٍ اسْتَوْقَدَ نَارًا، فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهَا جَعَلَ الْفَرَّاشُ يَقَعْنَ فِيهَا، فَأَنَا آخِذٌ بِحُجَزِكُمْ عَنِ النَّارِ، وَأَنْتُمْ تُقَحِّمُونَ فِيهَا) (۲) ترجمہ: ”میری اور تم لوگوں کی مثال اُس شخص کی مانند ہے کہ جس نے کوئی آگ جلائی، اور جب وہ آگ خوب روشن ہو گئی تو پروانے آ کر اس میں گرنے لگے..... میں ہوں کہ مسلسل تمہارے لباس کی گرہوں سے پکڑ پکڑ کر تمہیں اس آگ میں گرنے سے بچانے کی کوشش کرتا ہوں، جبکہ تم لوگ ہو کہ اس آگ میں گرتے پڑتے ہو۔“

یعنی جس طرح پروانے آگ پر ٹوٹے پڑ رہے ہوں، اور کوئی شخص انہیں موت سے اور جل مرنے سے بچانے کی غرض سے مسلسل انہیں وہاں سے دور رکھنے کیلئے محنت و مشقت اور جدوجہد کئے جا رہا ہو..... لیکن اس کے باوجود پروانے اس آگ میں جل مرنے کیلئے ہر طرف سے ٹوٹے پڑ رہے ہوں..... یہی حال رسول اللہ ﷺ کا اپنی امت کے ساتھ ہے،

گویا ”امتی“ برائیوں اور نافرمانیوں کے مسلسل ارتکاب کے ذریعے جہنم کی آگ میں جل مرنے پر تلے ہوئے ہیں..... جبکہ رسول اللہ ﷺ انہیں اس بربادی سے اور جل مرنے سے بچانے کی خاطر شب و روز محنت و کوشش میں مشغول و منہمک ہیں۔ (۱)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (لِكُلِّ نَبِيٍّ دَعْوَةٌ مُسْتَجَابَةٌ، فَتَعَجَّلَ كُلُّ نَبِيٍّ دَعْوَتَهُ، وَإِنِّي اخْتَبَأْتُ دَعْوَتِي شَفَاعَةً لِّأُمَّتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ) (۲) ترجمہ: ”ہر نبی کو کسی ایک خاص دعاء کا موقع دیا جاتا ہے جو قبول کی جاتی ہے، اور ہر نبی نے دنیا میں ہی اللہ سے وہ دعاء مانگ لی ہے، جبکہ میں نے اپنی وہ خاص دعاء قیامت کے روز اپنی امت کی شفاعت کیلئے چھپا کر رکھ لی ہے“

یعنی ہر نبی کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے ایک موقع ایسا دیا جاتا ہے کہ وہ اللہ سے جو چاہیں دعاء مانگ لیں، ان کی وہ دعاء ضرور قبول کی جائیگی..... آپؐ نے فرمایا کہ مجھ سے پہلے انبیائے کرام علیہم السلام میں سے ہر نبی نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دنیا میں ہی اللہ سے اپنے لئے وہ دعاء مانگ لی ہے..... لیکن میں نے اب تک وہ دعاء نہیں مانگی ہے..... کیونکہ میں نے تو اسے روز قیامت اپنی امت کی شفاعت کیلئے چھپا کر رکھا ہوا ہے.....

(۱) انسان کے لباس میں کچھ حصے ایسے ہوا کرتے ہیں جو نسبتاً زیادہ موٹے اور مضبوط ہوا کرتے ہیں، مثلاً کسی جوڑ پر کہ جہاں کپڑا آکرا کٹھا ہوتا ہے اور بعض اوقات کسی موٹی گرہ کی شکل محسوس ہوتی ہے..... یا جو لوگ تہبند یا لنگی باندھتے ہیں تو جس جگہ لنگی کی گرہ ہوا کرتی ہے (مَعْقِدُ الْإِزَارِ أَوْ السَّرَاوِيل) مضبوطی کے ساتھ پکڑنے کیلئے وہ جگہ مناسب ہوا کرتی ہے..... لہذا آپ ﷺ نے یہی تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا کہ ”میں تمہیں تمہارے لباس کی ان گرہوں سے پکڑ پکڑ کر تمہیں آگ میں جل مرنے سے بچانے کیلئے مسلسل جدوجہد میں مشغول رہتا ہوں..... مگر تم لوگ ہو کہ بس جلنے پر ہی مُصر ہو.....“

(۲) بخاری [۶۳۰۴] کتاب الدعوات [۸۰] باب [۱] لکل نبی دعوة مستجابة۔ نیز: مسلم [۱۹۹] کتاب الایمان۔

سبحان اللہ! رسول اللہ ﷺ کے قلبِ مبارک میں اپنی امت کیلئے اس قدر خیر خواہی و ہمدردی کے جذبات..... اتنی محبت..... اس قدر فکر..... اور اتنا درد..... کہ وہ دعاء کہ جس کی قبولیت یقینی ہے..... جس کی قبولیت کا اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے..... آپؐ نے وہ دعاء خود اپنے لئے نہیں مانگی..... بلکہ اپنی امت کیلئے بچا کر اور چھپا کر رکھ لی ہے۔

لہذا آپؐ کے قلبِ مبارک میں جب امت کیلئے خیر خواہی و ہمدردی کے اس قدر شدید جذبات تھے..... تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ ”اُمّتی“ کی حیثیت سے ہمارے دلوں میں بھی آپؐ کیلئے عقیدت و محبت کے جذبات ہمیشہ موجزن رہیں..... بلکہ آپؐ کی محبت تو ہر مومن کیلئے ”جزءِ ایمان“ ہے، جس کے بغیر ایمان کی تکمیل کا تصور نہیں کیا جاسکتا، جیسا کہ آپؐ کا ارشاد ہے: (لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَلَدِهِ وَ وَالِدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ) (۱) یعنی ”تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا“ تا وقتیکہ میں اسے اس کی اولاد اس کے والدین، نیز تمام سے لوگوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں۔“

☆..... محبت تقاضا کرتی ہے ”اتباع“ کا، جیسا کہ خود اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ (۲) ترجمہ: (کہہ دیجئے! اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری تابعداری کرو، خود اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف فرما دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا مہربان ہے)

نیز ارشاد ہے: ﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ﴾ (۳) ترجمہ: (اس رسول ﷺ

کی جو کوئی اطاعت کرے اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی)

اسی طرح ارشاد ہے: ﴿قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَ الرُّسُولَ﴾ (۱)

ترجمہ: (کہہ دیجئے! کہ اللہ تعالیٰ اور رسول کی اطاعت کرو)

اسی طرح ارشاد ہے: ﴿قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرُّسُولَ﴾ (۲)

ترجمہ: (کہہ دیجئے! کہ اللہ تعالیٰ کا حکم مانو اور رسول کی اطاعت کرو)

نیز ارشاد ہے: ﴿وَإِنْ تَطِيعُوهُ تَهْتَدُوا﴾ (۳) ترجمہ: (ہدایت تو تمہیں اسی وقت

ملے گی جب تم رسول کی اطاعت کرو)

نیز ارشاد ہے: ﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ

يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (۴) ترجمہ: (جو لوگ حکم رسول کی مخالفت کرتے ہیں انہیں

ڈرتے رہنا چاہئے کہ کہیں ان پر کوئی زبردست آفت نہ آپڑے یا انہیں دردناک عذاب نہ

پہنچے)

نیز ارشاد ہے: ﴿وَمَا آتَاكُمُ الرُّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَنْهَاكُمُ عَنْهُ فَانْتَهُوا

وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾ (۵) ترجمہ: (اور جو کچھ تمہیں رسول دے

لے لو۔ اور جس سے تمہیں روکے رک جاؤ۔ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو۔ یقیناً اللہ

تعالیٰ سخت عذاب والا ہے)

نیز رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (كُلُّ أُمَّتِي يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ أَبَى ، قِيلَ :

وَمَنْ يَا أَبَى يَا رَسُولَ اللَّهِ ؟ قَالَ : مَنْ أَطَاعَنِي دَخَلَ الْجَنَّةَ ، وَمَنْ عَصَانِي

فَقَدْ أَتَى (۱) ترجمہ: (میری امت کے سب ہی لوگ جنت میں داخل ہو ہی جائیں گے سوائے اس شخص کے جو خود ہی [جنت میں جانے سے] انکار کر دے، عرض کیا گیا کہ: اے اللہ کے رسول! ایسا شخص کون ہو سکتا ہے کہ جو خود ہی [جنت میں جانے سے] انکار کر دے؟ آپؐ نے فرمایا: جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہو گیا، اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے خود ہی [جنت میں جانے سے] انکار کر دیا)

گذشتہ نصوص کی روشنی میں یہ بات خوب واضح و ثابت ہو جاتی ہے کہ مسلمان کیلئے زندگی کے ہر شعبے میں رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کو ”اُسوۂ حسنہ“ سمجھنا اور آپؐ کی پاکیزہ تعلیمات پر صدقِ دل کے ساتھ عمل کی فکر و جستجو کرتے رہنا از حد ضروری ہے۔

اسی سلسلے میں مزید یہ ارشادِ ربانی بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (۲) ترجمہ: (یقیناً تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ کی ہستی میں بہترین نمونہ ہے)

اس آیت کی رو سے ہر مسلمان کیلئے یہ بات ضروری و لازمی ہے کہ وہ زندگی کے ہر معاملہ میں رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کو اپنے لئے بہترین مثال اور قابلِ تقلید نمونہ تصور کرے اور آپؐ کی تعلیمات و ہدایات کو اپنے لئے مشعلِ راہ اور روشنی کا مینار سمجھے۔

☆..... یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ تمام بنی نوع انسان میں سے صرف رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے تمام دنیائے انسانیت کیلئے بہترین مثال اور قابلِ تقلید نمونہ قرار دیا گیا اور تمام اہل ایمان کو آپؐ کا اخلاق و کردار اپنانے کی تاکید

(۱) بخاری [۲۸۰] کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة [۹۶] باب [۲] الاقتداء بسنن رسول اللہ ﷺ وقول اللہ

(۲) الاحزاب [۲۱]

تعالیٰ واجعلنا للمتقين اماماً۔

تاکید و تلقین کی گئی ہے، اس بارے میں اگر غور و فکر کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تمام دنیائے انسانیت کیلئے قابل تقلید نمونہ اور مثال صرف اسی شخصیت کو قرار دیا جاسکتا ہے جس میں درج ذیل دو اوصاف موجود ہوں:

۱۔ سیرت و تعلیمات کا محفوظ و معلوم ہونا:

یعنی اگر کوئی شخص کسی مخصوص شخصیت کو اپنے لئے مثال اور نمونہ قرار دیتے ہوئے اس کی تعلیمات کی پیروی اور اتباع کا خواہشمند ہو تو اس مقصد کیلئے ضروری ہے کہ اس مخصوص شخصیت کے حالاتِ زندگی اور اس کی تعلیمات و ہدایات محفوظ اور معلوم ہوں، ورنہ یہ کہ اگر اس کی تعلیمات کے بارے میں کسی کو علم ہی نہ ہو تو ان پر عمل کس طرح کیا جائیگا؟ لہذا قابل تقلید نمونہ یا اُسوہ حسنہ صرف ایسی شخصیت کو قرار دیا جاسکتا ہے جس کے حالاتِ زندگی محفوظ ہوں، جس کا اخلاق و کردار معلوم و معروف ہو، جس کی تعلیمات و ہدایات محفوظ ہوں اور ان کے بارے میں سہولت معلومات حاصل کی جاسکتی ہوں۔

اس دنیا میں بیشمار مشہور و معروف اور بڑی نامور ہستیاں گزری ہیں، جن میں حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کی جلیل القدر ہستیاں بھی شامل ہیں، عظیم فاتحین و سلاطین بھی شامل ہیں، بڑے بڑے دانشور، مصلحین و مجددین، سیاسی و مذہبی رہنما، شعراء و ادباء اور شعلہ بیان خطباء و مقررین کی بھی طویل فہرست ہے، لیکن یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ آج ان ہستیوں میں سے کسی کے بھی حالات یا تعلیمات اس قدر محفوظ و معلوم نہیں کہ جس قدر رسول اللہ ﷺ کی سیرت، آپ کے حالاتِ زندگی نیز آپ کی تعلیمات و ہدایات محفوظ و معلوم ہیں، چنانچہ آپ ﷺ کی ولادت، آپ کا بچپن، آپ کی پاکیزہ جوانی، آپ کی بعثت، آپ کی ہجرت، آپ کی عبادت، آپ کی تجارت، آپ کی سیاست، آپ کی گھریلو زندگی

آپؐ کی مسجد کی زندگی، آپؐ کی بازار کی زندگی، آپؐ کے صلح و جنگ کے حالات و واقعات، سفر و حضر کے حالات و واقعات، آپؐ کے اخلاق و عادات، آپؐ کا حلیہ مبارکہ، آپؐ کا اندازِ تکلم، اندازِ تبسم، آپؐ کی رفتار و گفتار، آپؐ کی نشست و برخاست، آپؐ کے کھانے پینے کے طور طریقے، اپنی ازواجِ مطہرات کے ساتھ آپؐ کی معاشرت، نیز اپنے اصحاب کے ساتھ آپؐ کا رویہ و سلوک، غرضیکہ آپؐ کی حیاتِ طیبہ نیز آپؐ کی پاکیزہ و مقدس تعلیمات کا ہر پہلو اور ہر گوشہ نہایت ہی وضاحت و تفصیل کے ساتھ سیرت کی کتابوں میں موجود و محفوظ ہے، گویا آپؐ کی سیرت نیز آپؐ کی تعلیمات و ہدایات کسی کھلی کتاب کی طرح دنیا کے سامنے موجود ہیں، اور تمام دنیائے انسانیت میں یقیناً یہ امتیازی وصف صرف اور صرف آپؐ ہی کو حاصل ہے، تمام بنی نوع انسان میں آپؐ کے سوا اور کسی کو یہ امتیازی وصف اور یہ شرف حاصل نہیں ہو سکا۔

۲۔ جامعیت و اکملیت:

تمام دنیائے انسانیت کیلئے اُسوہ حسنہ اور قابلِ تقلید نمونہ صرف ایسی شخصیت کو ہی قرار دیا جاسکتا ہے جس میں جامعیت و اکملیت کی صفت پائی جاتی ہو، جس کی شخصیت ہمہ گیر ہو..... اور یقیناً یہ امتیازی وصف اور شرف بھی تمام بنی نوع انسان میں صرف رسول اللہ ﷺ ہی کو حاصل ہے، چنانچہ آپؐ نے بعثت سے قبل بکریاں بھی چرائیں، محنت و مشقت بھی کی، تجارت بھی کی، آپؐ واعظ و ناصح بھی تھے، معلم و مربی بھی تھے، قاضی و مُصف بھی تھے، اسلامی سلطنت کے فرمانروا اور پیشوا بھی تھے، اسلامی لشکر کے سپہ سالار بھی تھے، اپنی مسجد میں امام و خطیب بھی تھے، مثالی شوہر اور مشفق و مہربان باپ بھی تھے.....

☆..... لہذا اگر کوئی تاجر ہے تو اس کیلئے آپ ﷺ کی زندگی کا وہ دور نمونہ ہے جب تجارت

کے حوالے سے چہار سو آپ کی امانت و دیانت کے چرچے تھے، اپنے اور پرانے دوست اور دشمن سب ہی آپ کو 'صادق' و 'امین' کے لقب سے پکارتے تھے۔

☆..... اگر کوئی مظلوم و مجبور ہے تو اس کیلئے آپ ﷺ کی مکی زندگی کا وہ دور نمونہ ہے جو بے پناہ مصائب و مشکلات سے بھرپور تھا، خصوصاً وہ عرصہ جو آپ ﷺ نے کفارِ مکہ کی طرف سے مقاطعہ (سوشل بائیکاٹ) کے دوران شعبِ ابی طالب میں انتہائی بے بسی اور عسرت و تنگی کی کیفیت میں گزارا۔

☆..... اگر کوئی فاتح و غالب ہے تو اس کیلئے آپ ﷺ کی زندگی کا وہ حصہ نمونہ اور مثال ہے جب آپ ﷺ کو اللہ نے کفارِ مکہ کے مقابلے میں ہمیشہ کیلئے فتح و غلبہ سے نوازا، اور فتحِ مکہ کے تاریخی اور یادگار موقع پر آپ فاتحانہ شان و شوکت یا کبر و غرور کی بجائے اپنے رب کی کبریائی اور حمد و ثناء بیان کرتے ہوئے انتہائی عاجزی و انکساری کے عالم میں مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے، اور اس وقت کفارِ مکہ جب آپ کے سامنے عاجز و بے بس تھے اور مکمل طور پر آپ کے رحم و کرم پر تھے، آپ نے انتقام کی مکمل قدرت و طاقت کے باوجود کسی سے کوئی انتقام نہیں لیا اور اپنے بدترین دشمنوں کو بھی معاف فرمادیا۔

لہذا اگر کوئی شخص مزدور ہو یا تاجر، کسی سلطنت کا فرمانروا اور حکمران ہو یا مسجد کا امام و خطیب، معلم و مربی ہو یا منصف و قاضی، سپاہی ہو یا سپہ سالار، غرض یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی ہستی میں ہر انسان کیلئے بہترین اُسوہ اور قابلِ تقلید نمونہ موجود ہے، خواہ اس کا تعلق معاشرے کے کسی بھی طبقہ سے ہو۔

☆..... الغرض رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مبارکہ کا جب بھی تذکرہ ہو یا اس موضوع پر جب بھی کسی کتاب یا کسی مضمون کے مطالعے کا اتفاق ہو تو، ایسے میں اصل مقصود یہی ہونا چاہئے

کہ ہم آپ ﷺ کی سیرت مبارکہ کو جاننے اور آپ کی پاکیزہ تعلیمات کو سمجھنے کے بعد، خلوص نیت اور جذبہ صادق کے ساتھ زندگی کے ہر شعبے میں ان تعلیمات کو جاری و نافذ کرنے کی مخلصانہ کوشش کریں..... اور اس طرح ہم دنیا و آخرت میں اپنے لئے صلاح و فلاح اور خیر و خوبی کا انتظام کر سکیں..... واللہ الموفق والہادی الی سواء السبیل.....!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔



الحمد للہ آج بتاریخ ۱۷/ربیع الاول ۱۴۳۵ھ، مطابق ۱۸/جنوری ۲۰۱۴ء بروز ہفتہ،

بعد نماز عشاء، یہ کتاب ”سیرت النبی ﷺ“ مکمل ہوئی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ، وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ،

اَللّٰهُمَّ احْشُرْنَا مَعَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ

وَالصَّالِحِيْنَ، وَارْزُقْنَا صُحْبَةَ نَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ ﷺ

وَاصْحَابِهِ فِي جَنَّتِكَ جَنَّاتِ النَّعِيمِ،

بِرَحْمَتِكَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ،

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ، وَسَلَامٌ عَلَى

الْمُرْسَلِينَ، وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.



(الألغام: ١٦٢-١٦٣)



اسلامی عقائد

تأليف:

خلیق احمد مفتی



إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأَتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ

بے شک اس خاطر رسول بنا کر بھیجا گیا ہے کہ میں اعلیٰ اخلاق کی بحیثیت کروں (حدیث)

معاشرتی آداب و اخلاق

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں

كالف:

خلیق احمد مفتی